قومی ڈائجسٹ

فروری 1981

مولانا مفتی محمود رح نمبر

www.tezpakistan.com

ماہنامہ

ہمدرد ڈائجسٹ

www.tezpakistan.com

عکسِ جمال یار بھی کیا تھا کہ دیر تک
آئینے طوطیوں کی طرح بولتے رہے

www.tezpakistan.com

www.tezpakistan.com

www.tezpakistan.com

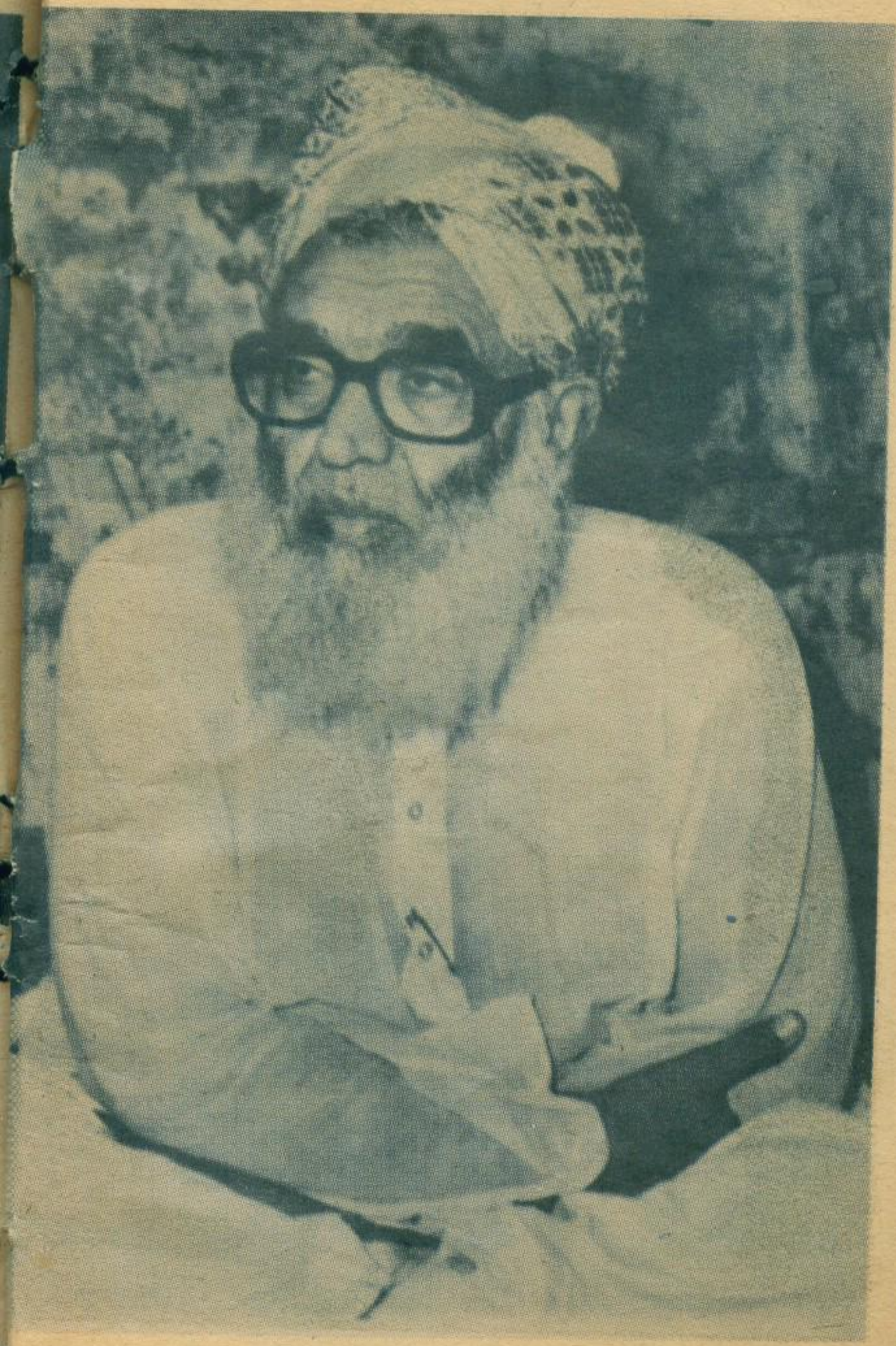

www.tezpakistan.com

www.tezpakistan.com

www.tezpakistan.com

قوم کے ہر فرد کی آواز

ماہنامہ

قومی ڈائجسٹ

لاہور

جلد: ۳ — ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ — شمارہ: ۹

فروری ۱۹۸۱ء

مُدیرِ مسئول: مجیب الرحمٰن شامی

نائب مُدیر: محمد شریف کیانی

خطاطی: عبدالرحمٰن ناصر، محمد سرور

قیمت: ۱۰ روپے

سالانہ چندہ بذریعہ رجسٹری ہوائی ڈاک: ۵۵ روپے

انچارج کراچی آفس

نسیم اظہر۔ کمرہ نمبر اڈی۔ ۲۹ بلاک ۶ پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی ۲۹

ہیڈ آفس

قومی پبلشرز۔ رانا چیمبرز، پُرانی انارکلی۔ لاہور

بزنس انچارج بیرونِ لاہور

مرزا نُور احمد بیگ

مُفتی محمود نمبر

اس شمارے کی تحریروں کو قومی پبلشرز کی تحریری اجازت کے بغیر کسی بھی صورت میں نقل یا شائع نہیں کیا جاسکتا۔ جملہ حقوق بحقِ قومی پبلشرز محفوظ

مجیب الرحمٰن شامی پرنٹر پبلشر نے قومی پریس ۱۵۔ انارکلی لاہور سے چھپوا کر رانا چیمبرز، پرانی انارکلی لاہور سے شائع کیا۔

www.tezpakistan.com

شجرۂ سیادت

○ مولانا مفتی محمود ——— مجیب الرحمٰن شامی ۲۵
○ ننھے محمود سے مفتی محمود تک ——— محمد شریف کیانی ۲۹
○ میرے شوہر میرے رفیق حیات — مفتی صاحب کی اہلیہ محترمہ ۵۳
○ جوں جوں میں بڑا ہوا، ابا جان کی تصویر بھی بڑی ہوتی گئی! ——— مولانا فضل الرحمٰن ۵۷ (ملاقات: اختر کاشمیری)
○ دیہاتی کھانا کھاؤں گا! ——— لطف الرحمٰن ۶۱
○ میں اُن کا "ڈرائیور" تھا! ——— □ ظہور احمد ۶۳
○ کس گھرانے، کس ماحول میں آنکھ کھولی؟ ——— مولانا محمد عبداللہ ۶۶
مفتی صاحب کے بچوں کی تصاویر ۵۵ (ملاقات: شعیب الرحمٰن)
○ دو یادگار واقعات — رانا مبارک علی ۶۴
○ باکمال شاگرد کے باکمال اساتذہ — مولانا سید حامد میاں ۴۵

میدانِ سیاست کا شہسوار

○ اتحاد کا سفر ——— نوابزادہ نصر اللہ خان ۸۱
○ گھر پہنچے تو موت کی خبر آگئی — □ خان عبدالولی خان ۸۵
○ وہ تعصب اور غصہ نہ استعمال — پروفیسر عبدالغفور ۹۰
○ دشمنوں کی عزت کو بھی عزیز رکھنے والا — سردار عبدالقیوم خان ۹۳
○ حاجی بلور کے گھر سے مذاکرات کی میز تک — □ بیگم نسیم ولی خان ۹۷
○ انگریزی سے ناآشنا وزیر اعلیٰ — □ ارباب سکندر خان خلیل ۱۰۳
○ عزم کا پیکر — جاوید ہاشمی ۱۰۷
ملاقات: محمد شریف کیانی □ رشید حسین بخاری □

جرأتِ اظہار

○ انتخابات سے پہلے انتخابات کے بعد — تقریریں، تقریریں، تقریریں ۲۰۵
○ یہ ہے اس ملک کا حال — چند منتخب اداریے ۲۱۱
○ دین کے لیے گولی بھی کھانی پڑی تو تیار رہوں گے — ہری پور جیل میں یادگار خطاب ۲۲۶
○ اسلامی نظام حکومت کیا ہے؟ — ایک اہم سوال کا ایک اہم جواب ۲۳۰

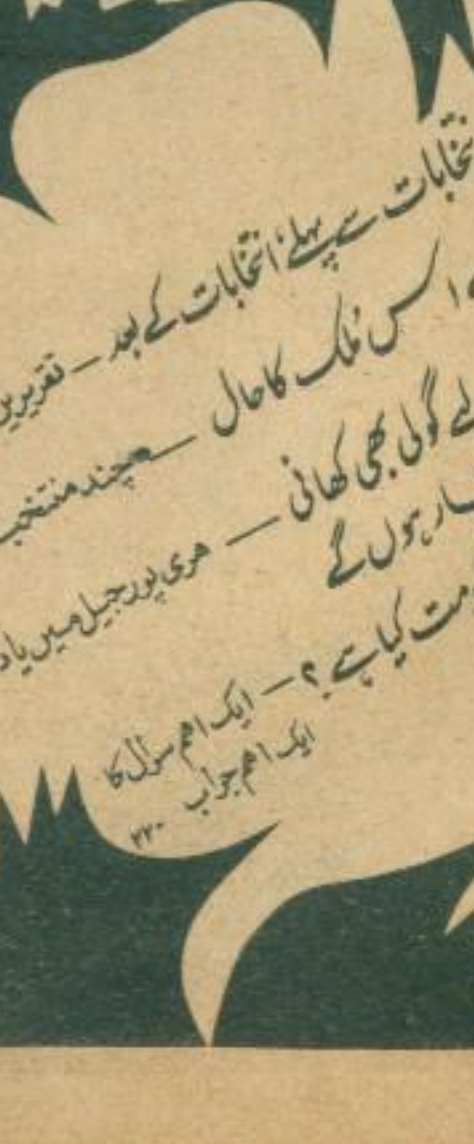

www.tezpakistan.com

نشانِ حق تھا وہ اسلاف کا نمونہ تھا
کسی بھی آمر و جابر کے سامنے نہ جھکا

اہالیانِ لاہور کا عہد ہے کہ وہ

حضرت مولانا مفتی محمودؒ

کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے

کسی بھی آمر و جابر اور وڈیرے جاگیردار کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے

نذر الرحمٰن رانا

سیکرٹری جنرل انجمن شہریانِ لاہور

Nasir

www.tezpakistan.com

شہید علم کا فیضان

تین کارنامے سرفہرست ہیں — حضرت مولانا خان محمد (خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف) ۱۱۱
علماء کی بے آبروئی کا بدلہ چکا دیا — مولانا عبدالحق ۱۱۳
ایک اجنبی — جس کا آنا ناگوار ہوا — مولانا ایوب جان بنوری ۱۱۴
حضورؐ انہیں بلا رہے تھے .... — مولانا عبیداللہ انور ۱۱۷
اس عہد کے مفتی نہیں تھے! — مولانا صدر الشہید ۱۲۲
ایسے دلائل میں نے نہیں سُنے! — مولانا محمد اجمل خاں ۱۲۴
وہ عالم سے بڑھ کر عارف تھے! — مولانا سمیع الحق ۱۲۹
اگر وہ یورپ میں ہوتے، تو .... مولانا تاج محمود ۱۵۳
پہلے وہ میرے دوست تھے پھر لیڈر بنے... مولانا عبدالحکیم ۱۵۶

پُروقار شخصیت، پُراعتماد گفتگو — مولانا عبدالرحیم اشرف ۱۳۳
سیاست کو مسجد سے دور نہیں ہونے دیا — علامہ احسان الٰہی ظہیر ۱۳۸
مجھے یقین تھا، آپ ضرور آئیں گے — علامہ علی غضنفر کراروی ۱۳۹
اہل حق حالات کا انتظار نہیں کرتے — مولانا عبید اللہ ۱۴۳
چار آنے کی دال، چند روٹیاں اور ساتھ ہی چائے — علامہ محمد یوسف قریشی ۱۴۰
افسوس! بیس سال تک تو تم چپ رہے اب... ▫ مولانا نورالہدیٰ ۱۵۰
دلیل کی ایسی قوت کہ لکڑی کو سونا ثابت کردیں — ▫ مولانا محمد اسفند یار ۱۵۱
پہلے فتویٰ دو، پھر سفارش کروں گا — ▫ مولانا مفتی احمد الرحمٰن ۱۳۱
مخالف کی بھی دلیل فوراً مان لیتے △ ۱۳۲ مولانا محمد ذکریا

ملاقات ▫ محمد جمیل ... △ محمد طیب کشمیری

دین و سیاست اور درس و تدریس کا حسین امتزاج — مولانا گلزار احمد مظاہری ۱۵۹
انہیں کچھ نہ کہو، یہ میرے مہمان ہیں — مولانا عبدالرحمٰن ۱۶۲
دیکھنا! آج کیا ہوتا ہے! — مولانا محمد عبداللہ ۱۶۳
آزادیٔ کشمیر ان کی دلی تمنا تھی ▫ مولانا امیر الزمان کشمیری ۱۶۴
خفیہ باتیں، اہم ملاقاتیں، قومی راز — مولانا فضل الرحیم ۱۶۶
اہل حق کا نمائندہ — مولانا قاضی محمد احسان الحق ۱۶۸
میں نے سرحد کے وزیر اعلیٰ کو خوب ڈانٹا مگر پھر... قاری عبدالعزیز جالوی ۱۷۰
مدینہ منورہ میں جب حضورؐ کا پیغام ملا... قاری سعید الرحمٰن ۱۷۳ △

ملاقات: ▫ محمد طیب کشمیری △ اشتیاق حسین بخاری

ملاقات: اختر کاشمیری

www.tezpakistan.com

www.tezpakistan.com

شمارۂ خاص

مولانا مفتی محمود ہماری تاریخ کا ایک منفرد عنوان ہیں ـــــ ان سے پہلے یہ خواب کسی نے کہاں دیکھا ہوگا، اور دیکھا ہوگا، تو اس کی تعبیر دیکھنے کی تمنا بہرحال خواب ہی رہی ہوگی کہ مدرسے کا پڑھا ہوا، اور مدرسے میں پڑھانے والا ایک مولوی، اور شرعی مسائل پر فتوے دینے والا ایک مفتی ـــــ سیاست میں اس طرح حصہ لے گا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ہجوم میں نہ صرف نمایاں ہوگا، بلکہ بہت سوں کو سیاست کا سبق پڑھائے گا، اور سیاسی مسائل پر اس کی رائے 'فتوے' کی طرح محترم سمجھی جائے گی ـــــ لیکن ہمارے اس عہد نے یہ خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، اس کی تعبیر ضرور دیکھی کہ محمود نامی صاحب، مولانا اور مفتی کہلاتے کہلاتے سیاست کے میدان میں داخل ہوئے، وزارتِ اعلیٰ کے منصب تک پہنچے، اور بڑے بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی موجودگی میں بھی نو سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ نے قیادت کی ذمہ داری ان کو سونپ دی۔ وہ پاکستان قومی اتحاد کے سربراہ منتخب ہوئے۔

یہ مولوی صاحب، اور مفتی صاحب ـــــ آج اِس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ وہ اُس عالمِ پائیدار میں جا کر بس گئے ہیں کہ جہاں اِس دُنیائے فانی کے ہر باسی کو بہرحال پہنچ جانا ہے ـــــ لیکن ان کا تذکرہ ہے کہ زبانوں پر ہے، اور یاد ہے کہ دل اس سے روشن ہیں۔ ان سے بہت کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی۔ ان کے اندازے نے بھی کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھائی ہوگی، کسی معاملے پر ان کی رائے سے بھی اختلاف کیا گیا ہوگا، اور کیا جا سکتا ہوگا ـــــ لیکن اس میں کیا شک کہ ان کی خوبیاں انبار در انبار ہیں، افواج در افواج ہیں ـــــ

آخر ان مولوی صاحب میں وہ کیا جوہر تھا، وہ کیا خصوصیات تھیں کہ وہ ایک زمانے کی آنکھ کا تارا بن گئے؟ ـــــ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا جواب اس شمارۂ خاص میں ان کے رفیقوں، دوستوں، شاگردوں، سیاست دانوں اور عالموں نے اپنے اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں دیا ہے ـــــ اس شمارے کا انداز تحقیقی اور تجزیاتی نہیں، واقعاتی اور مشاہداتی ہے ـــــ "قومی ڈائجسٹ" اپنے اس دائرے میں رہ کر، جو کچھ فراہم کر سکا، پیشِ قارئین ہے۔ ہماری محنت کیا رنگ لائی ہے ـــــ اسے آپ خود ملاحظہ کر لیجیے کہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!!!

www.tezpakistan.com

www.tezpakistan.com

مجیب الرحمٰن شامی

مولانا مفتی محمودؒ

پیشانی کشادہ، مطلعِ انوار۔ آنکھیں روشن، زندہ و بیدار۔ اُبھرے ہوئے مسکراتے رُخسار۔ گندمی رنگ میں سُرخی کے آثار۔ سر کے بال پٹے دار، ڈاڑھی پھیلی ہوئی باوقار، سیاہی پر سپیدی ژالہ بار۔ شانے چوڑے اور مضبوط، مردانہ وار۔ ناک ستواں، قد میانہ، جسم گھٹا، ایک شجرِ سایہ دار۔ پُرسکون جیسے دامنِ کوہسار۔

لباس سے سادگی آشکار۔ کندھوں پر مستقل رُومال کہ جسدِ خاکی کا حاشیہ بردار، دمِ گفتگو، دلیل کی گفتار۔ دمِ جستجو، فرض کی پکار۔

آرام سے ہر لحظہ انکار۔ مطمعِ نظر اسلامی اقدار۔ عوامی حقوق کا پاسدار، ان کی حفاظت کے لیے ہر دم چوکس و تیار۔

وزیرِ اعلیٰ، مگر چٹائی سے سروکار، تکلفات سے بیزار، بوریے پر دربار، عجیب صاحبِ اختیار، غلامِ احمدِ مختار۔

اس کی نگاہ میں ہیچ دولت کے انبار، اس کی نگاہ میں ایک مفلس و زردار۔ تنہا بھی لشکرِ جرار۔ کثرتیں اُس کے سامنے نگوں سار۔ استقامت کا کوہسار، نعرۂ حیدرِ کرّار۔ فرقہ بندی کے خلاف کھلی تلوار۔ اتحاد کا علمبردار۔ تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کا سالار۔ قوم کا بے تاج تاجدار۔ نویدِ قافلۂ بہار۔

میدانِ سیاست کا شہسوار۔ اہلِ دیں کے لیے سرمایۂ افتخار۔ اہلِ دل کے لیے وجہِ قرار۔ دیوبند کے گلے کا ہار۔ پاکستان پر سو جان سے نثار۔ افغانستان پر اشک بار۔ جہاد کی للکار ——— (اُس سے) لرزہ بر اندام اشتراکی و سرمایہ دار، ہر جنسِ بازار۔ وہ ایک کلمۂ پائیدار۔ باوقار، باکردار۔ عابدِ شب زندہ دار۔ روایاتِ اسلاف کا نگہ دار۔ رحمتِ پروردگار ———

خوابیدہ اس شہر میں تھے آتش کدے ہزار:
تری لحد پہ کھلیں جاوداں، گلاب کے پھول

www.tezpakistan.com

شجرِ سایہ دار

www.tezpakistan.com

ایک نامکمل نوحہ

دوستو! کس کے لیے سارا جہاں ماتم میں ہے
یہ زمیں ماتم میں ہے، یہ آسماں ماتم میں ہے

کس کے اُٹھ جانے سے برہم ہوگئی بزمِ حیات
زندگی ماتم میں مرگِ ناگہاں ماتم میں ہے

راستے تاریکیوں سے بھر گئے منزل تلک
کارواں در کارواں در کارواں ماتم میں ہے

گُل ہوئی شمعِ فروزاں مجلسِ ارشاد کی
نطق سرگرداں ہے، اندازِ بیاں ماتم میں ہے

عبدالقادر خاں

www.tezpakistan.com

بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی اَن گنت

کہانیوں کی ایک کہانی ـ مفصل، مگر مختصر

ننھّے محمود سے مفتی محمُود تک

محمّد شریف کیانی

یہ پنیالہ ہے...

سنہ ۱۹۰۱ء.....

قندھار سے نکلے آج انہیں پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا، لیکن منزل تھی کہ ابھی تک روزِ اوّل کی طرح ان سے کوسوں دُور تھی۔ یہ لوگ دن بھر سفر کرتے۔ جہاں شام اترتی، یہ بھی اپنے اونٹوں اور گدھوں سے اُتر کر کھُلے آسمان کے نیچے پڑاؤ ڈال دیتے۔ اگلی صبح سُورج طلوع ہوتا تو ان کا سفر دوبارہ شروع ہو جاتا۔ یہ خانہ بدوش افغانوں کا ایک قافلہ تھا۔ محمّد صدّیق اور اس کے خاندان والے بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ محمد صدیق کا تعلق افغانوں کے قبیلے ناصر کی شاخ یحییٰ خیل سے تھا۔ قافلے میں موجود اکثر لوگ ضروریاتِ زندگی کے حصول کی خواہش اور کوشش کی خاطر قندھار سے نکلے تھے، لیکن محمد صدیق کو اس طرح کا کوئی لالچ نہ تھا۔ اُس کی سوچ اپنے ساتھیوں سے مختلف تھی، اسے دینی علوم پڑھنے اور سیکھنے کا شوق تھا۔ یہی لگن اسے کشاں کشاں اپنے وطن سے دُور لیے آ رہی تھی۔

چند دن بعد دُشوار گزار پہاڑی راستوں اور سنگلاخ چٹانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ درہ گومل دُور پیچھے رہ گیا اور قافلہ نسبتاً ہموار میدانی علاقے میں سفر طے کرنے لگا۔ ایک صبح قافلے والے بیدار ہوئے، تو کچھ فاصلے پر کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ یہ لوگ کئی دنوں سے بے آب وگیاہ، ویران اور ریتلے علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ اب ایکا ایکی جو تھوڑا سا سبزہ نظر آیا، تو مُرجھائے ہُوئے چہرے کھِل اٹھے۔ خستہ اور نڈھال جسموں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی اور تھکن سے چُور پاؤں ایک بار پھر تیزی سے اُٹھنے لگے۔

کھجور کے درختوں کے جھُنڈ میں کسی آبادی کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ جُوں جُوں قافلے والے آگے بڑھے، اس آبادی کے خدوخال زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ جلد ہی قافلہ اس آبادی کے قریب پہنچ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے میں ابھی دیر تھی، لیکن انہوں نے آگے بڑھنے کے بجائے وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ پچھلے دو مہینوں سے وہ مسلسل سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے چند دن یہاں رُک کر اپنے نڈھال جسموں کو ذرا آرام پہنچانا ضروری سمجھا۔

اگلے دن محمد صدیق قافلے کے چند ساتھیوں کے ہمراہ بستی میں پہنچا۔ معلوم ہُوا اس بستی کا نام پنیالہ ہے۔ یہ خاصا بڑا گاؤں تھا۔ ایک

www.tezpakistan.com

بلند ٹیلے پر یوں آباد تھا کہ اس کے چاروں طرف ندی نالے بہہ رہے تھے اور لیموں اور کھجور کے باغات نے احاطہ کر رکھا تھا۔ یہاں پانی کی اتنی افراط باعثِ حیرت تھی۔ محمد صدیق بار بار سوچتا۔ تعجب ہے ۔۔۔ ہم اتنا طویل سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں، راستے میں کہیں کسی مقام پر کوئی کنواں یا چشمہ نظر نہیں آیا۔ یہ لوگ خوش قسمت ہیں کہ انہیں قدرت نے یوں پانی کی دولت بہ افراط عطا کر رکھی ہے۔

محمد صدیق کی حیرت اور تعجب بے جا نہ تھی ۔۔۔ حقیقتاً پنیالہ کے گرد و نواح میں چالیس پچاس میل کے علاقے میں بارش کے علاوہ پانی کے حصول کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لوگوں نے اپنے گھروں میں تالاب اور حوض بنا رکھے تھے۔ بارش ہوتی، تو یہ تالاب اور حوض بھر لیتے اور بوقتِ ضرورت کام میں لاتے۔ ان کے برعکس پنیالہ والے واقعی خوش نصیب تھے کہ انہیں سال کے کسی حصے یا موسم میں پانی کی کوئی قلت نہیں تھی۔

پنیالہ سطحِ سمندر سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ سامنے شیخ بدین کے پہاڑ تھے تو پشت پر کوہِ سرخ۔ پنیالہ اس کوہِ سرخ کے دامن میں آباد تھا جس کی SAND ROCKS میں سے تین اطراف سے چشمے پھوٹتے تھے۔ ہر چشمے کا ذائقہ الگ تھا۔ دو چشموں کا پانی قدرے نمکین تھا، باقی ماندہ کا انتہائی صاف، ٹھنڈا اور میٹھا۔ حیرت کی ایک اور بات یہ تھی کہ پنیالہ سے باہر جہاں گاؤں کی حدود ختم ہوتی تھیں، وہاں یہ چشمے ریت میں جذب ہو کر غائب ہو گئے تھے۔

محمد صدیق کو دینی علم کی لگن اور شوق، وطن سے اتنی دور لایا تھا۔ پنیالہ میں لوگوں سے باتوں کے دوران پتہ چلا کہ خانقاہ یٰسین زئی میں ایک بزرگ مولانا سید احمد گل شاہ دینی علوم کی تعلیم دیتے ہیں اور وہاں کئی درویش اور طالب علم مقیم ہیں۔ مولانا سید احمد گل شاہ کا تعلق ساداتِ قندھار کے قبیلے یٰسین زئی سے تھا۔ پنیالہ کے علاقے میں ان کے عقیدت مندوں کا بڑا وسیع حلقہ تھا۔ ابتدا میں مولانا سید احمد گل شاہ صرف سردیوں کے چھ مہینے پنیالہ میں قیام کرتے اور پھر واپس قندھار چلے جاتے، لیکن ایک بار سردیاں گزار کر قندھار کی طرف کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ سخت بیمار ہو گئے اور نقاہت کی وجہ سے سفر کرنا ممکن نہ رہا۔ پنیالہ کے رئیس شہاب الدین خان ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ انہوں نے مستقلاً یہیں رک جانے کی درخواست کی۔ مولانا سید احمد گل شاہ راضی ہو گئے، تو خان صاحب نے پنیالہ کے قریب شمال کی طرف ایک قطعۂ اراضی آپ کے لیے مختص کر دیا۔ درویشوں اور طالب علموں کی ایک بڑی جماعت ہر وقت مولانا سید احمد گل شاہ کے ساتھ ساتھ رہتی تھی، چنانچہ شاہ صاحب نے اس قطعۂ اراضی پر اپنے ذاتی مکانات، مسجد، طلبا اور ذاکرین کے لیے حجرے تعمیر کرا لیے اور اس سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا۔

مولانا سید احمد گل شاہ ایک ولی کامل اور عالم شخص تھے۔ ایک دنیا نے ان کے فیوض و برکات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ محمد صدیق بھی لوگوں کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ خانقاہ یٰسین زئی پنیالہ سے زیادہ دور نہ تھی، چار فرلانگ کا فاصلہ ہو گا۔ محمد صدیق ایک دن وہاں اکیلا جا پہنچا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، تو پہلی ملاقات میں ہی ان کا گرویدہ ہو گیا اور ان سے ایسی محبت اور عقیدت پیدا ہو گئی کہ باقی ماندہ زندگی انہی کے قدموں میں گزارنے کی ٹھان لی۔ چند دن بعد قافلے کے کچھ ساتھی نئی منزلوں کی کھوج اور تلاش میں پنیالہ سے آگے روانہ ہو گئے۔ روانگی سے پہلے انہوں نے محمد صدیق سے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے، لیکن محمد صدیق کو خانقاہ یٰسین زئی کی صورت میں اپنی منزل مل گئی تھی اور اس کی بیقراری کو قرار سا آ چلا تھا، چنانچہ اس نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور پنیالہ میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ کچھ عرصے بعد وہاں کی ایک خاتون سے شادی بھی کر لی۔

خانقاہ یٰسین زئی سے دار العلوم دیوبند تک

محمد صدیق نے جلد ہی اپنی خدمت، محبت اور عقیدت کی بدولت مولانا سید احمد گل شاہ کے دل میں جگہ بنا لی اور اس کا شمار ان کے خاص مریدوں میں ہونے لگا۔ اب اسے خانقاہ کے تمام لوگ ادب اور احترام سے خلیفہ صاحب کہتے۔ کچھ عرصے بعد مولانا سید احمد گل شاہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا سید عبد الحلیم ان کے جانشین مقرر ہوئے تو خلیفہ محمد صدیق نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ۷ ربیع

www.tezpakistan.com

الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق جنوری ۱۹۱۹ء پیری رات پٹیالہ میں قدرت نے خلیفہ صاحب کو دوسرا لڑکا عطا کیا۔ مولانا سید عبدالحلیم نے اس کا نام محمود تجویز کیا۔ یہی وہ سعادت مند اور بلند اقبال لڑکا تھا جسے آج دُنیا مولانا مفتی محمود کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ خلیفہ محمد صدیق کے پہلے بیٹے کا نام احمد تھا اور یہ پہلی بیوی کے بطن سے تھا۔ محمود کی ماں خلیفہ محمد صدیق کی دوسری بیوی تھی۔ اس کے بطن سے بعد میں ایک لڑکا اور لڑکی پیدا ہوئے۔ لڑکے کا نام خلیفہ محمد اور لڑکی صابرہ تھی۔

خلیفہ محمد صدیق کی رہائش اب تک پٹیالہ میں تھی۔ محمود پیدا ہوئے، تو مولانا سید عبدالحلیم کے بھائی سید عبدالعزیز شاہ نے خلیفہ محمد صدیق کو خانقاہ یٰسین زئی میں رہنے کی جگہ دے دی اور وہ جلد ہی وہاں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ آخر دم تک خانقاہ میں مقیم رہے۔ ان کی قبر بھی وہیں بنی۔

۱۹۲۴ء میں محمود پانچ سال کے ہوئے، تو انہیں پٹیالہ کے گورنمنٹ مڈل سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ابتدا ہی سے خاصے ذہین اور تیز تھے۔ چہارم اور ہفتم میں اوّل آئے اور وظیفہ حاصل کیا۔ خانقاہ میں مولانا سید عبدالحلیم کے لڑکے صاحبزادہ محمد اور صاحبزادہ عبدالحمید ان کے ہمجولی تھے۔ ان کی عمروں میں بہت کم فرق تھا۔ فارغ اوقات میں باہم مل کر کھیلتے۔ کبھی کبھی آپس میں جھڑپ بھی ہو جاتی۔ صاحبزادہ محمد چونکہ قریب قریب ہم عمر تھے، اس لیے زیادہ تر عمر کے انہی سے رہتے۔ ایک بار مسجد میں نماز ہو رہی تھی۔ امام نماز پڑھا رہے تھے کہ ان دونوں نے پچھلی صف میں لڑنا شروع کر دیا۔ ان کا جھگڑا نماز کے دوران برابر جاری رہا، لیکن جونہی امام نے سلام پھیرا، یہ دونوں وہاں سے بھاگ اٹھے۔ محمود نے بھاگ کر دوسرے کمرے میں نماز کی نیت باندھ لی۔ صاحبزادہ محمد کھڑکی سے کُود کر باہر نکل گئے۔ امام صاحب کو شک تو تھا کہ یہی دونوں لڑے ہوں گے، لیکن چونکہ اپنی آنکھوں سے انہیں نہیں دیکھا تھا، اس لیے تذبذب میں تھے۔ انہیں ڈھونڈتے اور تلاش کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے، تو دیکھا محمود بڑے انہماک سے نماز میں مصروف ہیں اور صاحبزادہ محمد وہاں موجود ہی نہیں۔ سوچ میں پڑ گئے۔ نماز کے دوران پچھلی صف میں لڑا کون تھا؟ محمود تو یہاں اکیلا نماز پڑھ رہا ہے۔ لگتا ہے مجھ سے سُننے میں کچھ غلطی ہو گئی یا میں سٹھیا گیا ہوں۔

اسکول میں تمام استاد محمود کو بے حد عزیز رکھتے۔ آٹھویں جماعت پاس کر لی، تو اس کے ہیڈ ماسٹر بطور خاص چل کر خلیفہ محمد صدیق کے پاس آئے اور کہا کہ محمود بڑا ذہین اور ہوشیار بچہ ہے، اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ آپ اجازت دیں، تو اس کے تعلیمی اخراجات میں برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خلیفہ محمد صدیق کے اپنے کچھ مخصوص نظریات اور خیالات تھے، انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے اپنے لڑکے کو انگریزی تعلیم دلانے کا کوئی شوق نہیں، میں اسے دینی تعلیم دینا چاہتا ہوں۔

اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر پر محمود کی دینی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مڈل پاس کیا، تو دوسری طرف اپنے والد اور ماموں شیر محمد پنیالوی سے قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی ختم کر لی تھیں۔ جلد ہی اسے مولانا سید عبدالعزیز شاہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ سید عبدالعزیز شاہ نابینا تھے، لیکن خدا نے انہیں علم و معرفت میں نہایت بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ اپنے بھائی مولانا سید عبدالحلیم شاہ سے سلوک کی تکمیل کر کے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں اپنے بھائی سے اجازت لے کر ضلع بنوں کی تحصیل لکی کے ایک گاؤں ابابیل چلے گئے تھے اور وہاں سلسلہ مجددیہ کی ترویج و اشاعت میں مصروف تھے۔ محمود نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور چند مہینے اسباق پڑھنے کے بعد واپس خانقاہ آ گیا۔ یہاں دو سال میں والد کے علاوہ اپنے بہنوئی مولوی شیر محمد قندھاری اور مولوی غلام رسول سے شرح جامی، ہدایہ اوّلین، حسامی اور سُلّم العلوم تک کتابیں پڑھیں۔

مولوی غلام رسول، محمود کو سُلّم العلوم پڑھاتے تھے اور یہ پنیالہ کے قریب شیخ بدین میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ شیخ بدین سطح سمندر سے تقریباً ۴ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے موسم گرما میں جب چاروں طرف گرم لُو چلنے لگتی اور گرمی کی شدت ناقابل برداشت ہو جاتی، تو مقامی انتظامیہ کے انگریز افسر گرمیاں گزارنے یہاں چلے آتے۔ اس مقام پر آج بھی ان کے تعمیر کیے ہوئے ڈاک بنگلوں کے آثار اور کھنڈرات موجود ہیں۔ مولوی غلام رسول شیخ بدین کی مسجد کے امام بھی تھے۔ ایک بار جمعے کے دن کسی کام

www.tezpakistan.com

سے کہیں گئے، تو واپسی میں دیر ہو گئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتے واپس آ رہے تھے کہ رستے میں محمود مل گئے۔ ان سے استفسار کیا، تو محمود نے بتایا کہ آپ پریشان نہ ہوں، مَیں نے جمعہ پڑھا دیا ہے۔ مولوی غلام رسول نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولے: اچھا۔ یہ تو بتاؤ جمعے کا خطبہ آتا تھا۔ اس میں کیا پڑھا تم نے؟ محمود مسکرائے، پھر جواب دیا: آپ نے سُلّم العلوم کے جو سبق دیے تھے، وہ یاد تھے۔ پہلے خطبے میں کل کا سبق سُنا دیا۔ دوسرے میں آج کا۔ یہ جواب سُن کر مت پوچھیے کہ مولوی غلام رسُول کی کیا حالت ہوئی۔ چند لمحے تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے، کیونکہ سُلّم العلوم منطق کی ایک کتاب تھی اور اس کا جمعے کے خطبے سے دُور دُور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ سنبھلے، تو اس اثنا میں محمود نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گئے۔ محمود ان دنوں بمشکل دس بارہ سال کے ہوں گے۔

کچھ عرصے بعد محمود کو دارالعلوم دیوبند بھیج دیا گیا۔ وہاں چند ماہ گزارے تھے کہ صاحبزادہ احمد پہنچ گئے۔ وہ سرہند میں تھے کہ انہیں خلیفہ محمد صدیق کا پیغام ملا کہ آپ کے دو بھائی مُراد آباد میں پڑھ رہے ہیں۔ محمود دیوبند میں اکیلا ہے، اُسے بھی مراد آباد لے جائیے۔ ان دنوں فنون کی تعلیم میں مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد کی شہرت تھی۔ اس مدرسے کی بنیاد مشہور بزرگ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے رکھی تھی۔ خلیفہ محمد صدیق کے مُرشد مولانا سیّد عبدالحلیم شاہ کے دو بیٹے صاحبزادہ محمد اور صاحبزادہ عبدالحمید وہیں تعلیم پا رہے تھے۔ خلیفہ محمد صدیق کا خیال تھا کہ محمود بھی ان کے ساتھ آ جائے، تو اچھا رہے گا۔ محمود کا اپنا دل دارالعلوم دیوبند چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ جب سجادہ نشین صاحبزادہ احمد وہاں پہنچے اور محمود سے ان کے والد کی خواہش بیان کی تو محمود خاموش رہے، مُنہ سے کچھ نہ بولے، لیکن اگلے دن جب صاحبزادہ احمد کی روانگی کا وقت ہُوا، تو محمود کہیں چھُپ کر بیٹھ گئے اور ان کے سامنے ہی نہ آئے۔ صاحبزادہ احمد کو ان کے بغیر واپس جانا پڑا، لیکن خلیفہ محمد صدیق نے اپنے بیٹے کو مُراد آباد بھجوانے کا تہیّہ کر رکھا تھا، چند دن بعد وہاں پیغام آیا۔ اس پر محمود نے بادلِ نخواستہ دارالعلوم دیوبند چھوڑ کر مدرسہ قاسمیہ میں داخلہ لے لیا۔ مراد آباد میں اس نے چھ سال گزارے۔ سیّد عبدالعزیز شاہ اپنے بچّوں کی طرح انہیں بھی ہر ماہ باقاعدگی سے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے۔

مُراد آباد میں محمود کے جوہر خوب کھُلے اور ان کی خداداد صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہُوا۔ اُن کے ایک مشفق استاد نے انہی دنوں اپنی معروف اور مقبول کتاب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" تالیف کی تھی۔ محمود نے مسودات کی نقل اور تصحیح کے کام میں استاد کا ہاتھ بٹایا۔ اُستاد کو اُن کا کام بہت پسند آیا اور ان کی علمی سُوجھ بُوجھ سے بے حد متاثر ہوئے۔

تعلیم اور تعلیمی کاموں کے ساتھ ساتھ بے ضرر قسم کے باقی شغل بھی چلتے رہتے اور ایسے معاملات میں بھی عام طور پر وہ تمام لڑکوں کے قائد اور رہنما ہوتے۔ ایک بار کسی مسئلے پر مدرسے کے استادوں اور شاگردوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ استاد جماعت کے لیے گئے، تو تمام لڑکے محمود کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ اساتذہ کو پتہ چلا، تو وہ انہیں منانے کی غرض سے آئے۔ محمود نے انہیں آتے دیکھا، تو کمرے کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی، اور باقی لڑکوں کو ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے کہا، "فانتشروا۔ فانتشروا" (بکھر جاؤ۔ بکھر جاؤ)۔

۱۹۴۱ء میں مُراد آباد سے محمود کی وطن واپسی ہوئی۔ اسی سال انہوں نے مولانا سیّد عبدالعزیز شاہ کے فرمان پر مدرسہ معین الاسلام عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں تدریس کا آغاز کیا۔ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ نواب صوفی یار محمد اس مدرسے کے مہتمم اور نگران تھے۔ اس دوران مفتی محمود ابا خیل جا کر سیّد عبدالعزیز شاہ سے بیعت بھی ہوئے۔ وہ ہر دوسرے مہینے اپنے مُرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہاں تین دن قیام کرتے۔ تین چار سال بعد مولانا سیّد عبدالعزیز شاہ نے ابا خیل میں مدرسہ قائم کیا اور محمود کو وہاں بُلا لیا۔

یہ مولوی صاحب ہمیں دے دیجیے

ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے پنیالہ تقریباً ۴۵ میل دُور ہے۔ اس سے مزید سات میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا گاؤں ہے عبدالخیل۔ بارانی علاقہ ہے۔ وقت پر بارش ہو جائے، تو لوگ نہال ہو جاتے ہیں، ورنہ کنگال رہتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں یہاں پینے کے لیے پانی کا حصول اور بھی زیادہ کٹھن مرحلہ ہوتا۔ جن لوگوں کے پاس کوئی جانور ہوتا، وہ اس پر سات میل دُور پنیالہ سے پینے کے لیے پانی لاتے، لیکن جن کے

www.tezpakistan.com

پاس بڑا [illegible] پانی ڈھونے [illegible] سب سے زیادہ تندرست اور توانا ہوتا، پانی کی فراہمی اس کی ڈیوٹی ہوتی۔ پانی کی اس مصیبت سے تنگ آکر عبدالخیل کے کئی گھرانوں نے پنیالہ کے قریب جھونپڑیاں ڈال کر عارضی رہائش اختیار کرلی تھی۔ نیاز محمد بھی ان لوگوں میں سے ایک تھا۔ یہ خانقاہ یٰسین زئی کے صاحبزادگان کا مُرید تھا۔ اس کی جھونپڑی خانقاہ کے قریب واقع تھی۔ اردگرد بھی چند جھونپڑیاں اس کے باقی رشتے داروں کی تھیں۔ ایک دن نیاز محمد مولانا سید عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر تھا۔ خلیفہ محمد صدیق بھی موجود تھے۔ باتوں باتوں میں شادی بیاہ کا ذکر چھڑ گیا۔ اچانک سید عبدالعزیز شاہ، نیاز محمد کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: تمہاری جو لڑکی ہے، اس کا رشتہ خلیفہ محمد صدیق کے لڑکے محمود کو کیوں نہیں دے دیتے۔ مُرشد کے حکم اور خواہش سے سرتابی کی بھلا کسے مجال تھی۔ نیاز محمد نے سرِ تسلیم خم کردیا۔ اسی وقت اپنی جھونپڑی میں محمود کو بُلا کر اپنی بیٹی کے ساتھ اس کا نکاح پڑھا دیا۔ نیاز محمد نے عبدالخیل سے اپنے قریبی رشتے داروں کو بُلانے یا انہیں دعوت دینے کا تکلف بھی گوارا نہ کیا۔ خانقاہ کی قریبی جھونپڑیوں میں جو چند رشتے دار موجود تھے، وہی اس تقریب میں شریک ہوسکے۔ نکاح کے بعد نیاز محمد نے بیٹی کو اپنی اونٹنی پر بٹھایا اور اسے خلیفہ محمد صدیق کے گھر چھوڑ آیا۔

شادی کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ محمود کو اپنے مُرشد سید عبدالعزیز شاہ کے ہمراہ اپنے سُسرالی گاؤں عبدالخیل جانا پڑا۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے تمام علاقہ خشک سالی کی گرفت میں تھا۔ عبدالخیل والے اللہ سے بخشش اور کرم کے طلبگار تھے۔ انہوں نے بارش کی دعا کے لیے نمازِ استسقا کا اہتمام کیا تھا۔ اس طرح کا جب بھی کوئی موقع آتا، خانقاہ یٰسین زئی سے سجادہ نشین آکر نماز پڑھاتے اور دعا مانگتے۔ اس سال سید عبدالعزیز شاہ کا ادھر گزر ہوا۔ ان کے ساتھ محمود کو بھی آنا پڑا۔

سید عبدالعزیز شاہ نے نماز پڑھائی، پھر بارش کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی۔ بعد میں محمود سے تقریر کے لیے کہا گیا۔ نوجوان محمود نے کچھ ایسے دل نشیں انداز میں تقریر شروع کی اور عام فہم طریقے سے پیچیدہ دینی مسائل پر روشنی ڈالی کہ ایک ایک لفظ سُننے والوں کے دل میں اُترتا چلا گیا۔ تقریر ختم ہوئی، تو سب لوگ اس نوجوان مولوی کے علم اور فضل کے قائل ہوچکے تھے۔ پہلے وہ اسے شاہ صاحب کا ایک عام سا شاگرد سمجھے تھے لیکن اب انہوں نے ایک نئے انداز سے سوچنا شروع کردیا۔ عبدالخیل میں ایک امام ہوا کرتے تھے ـــــ مولوی صالح محمد ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت سے ان کی مسجد ویران اور غیر آباد تھی۔ انہوں نے سوچا اس نوجوان مولوی کو کسی طرح یہاں کی مسجد سنبھالنے پر راضی کرنا چاہیے۔ اس کی تقریر سننے کے بعد انہیں گاؤں میں ایک نئے امام مسجد کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ نوجوان مولوی سے بات کی، تو اس نے کوئی واضح جواب نہ دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال دیا۔

سید عبدالعزیز شاہ ایک دو دن ٹھہرنے کے بعد واپس چلے گئے، تو گاؤں والوں نے ایک وفد بنایا۔ اس میں تین آدمی تھے۔ محمود کے سُسر نیاز محمد بھی اس وفد میں شامل تھے۔ وفد نے سید عبدالعزیز شاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ یہ نوجوان مولوی ہمیں دے دیا جائے۔ ہمیں گاؤں کی مسجد کے لیے ایک پیش امام کی ضرورت ہے۔ محمود بھی محفل میں موجود تھے۔ سید عبدالعزیز شاہ یہ درخواست سُن کر زیرِ لب مسکرائے اور محمود کی طرف دیکھا۔ محمود نے اپنے مُرشد کا عندیہ پا کر کہنا شروع کیا: مجھے عبدالخیل جانے اور وہاں کی مسجد سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میری ایک شرط ہے، گاؤں والے اسے پورا کردیں یا تسلیم کرلیں، تو میں ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔

وفد کے ارکان کے چہرے کھل اُٹھے۔ بیتابی سے کہا ہمیں کچھ سُنے بغیر آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ محمود نے کہا نہیں، پہلے میری بات پوری سُن لیجیے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کیجیے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی شرط کے متعلق بتایا۔ شرط یہ تھی کہ میرے ساتھ ۵۰، ۶۰ طالب علم ہیں، کچھ یہاں کے ہیں، کچھ باہر سے دُور دراز علاقوں سے چل کر دینی علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ گاؤں والے میرے ساتھ ان سب کی رہائش اور کھانے کا بندوبست کرنے کا وعدہ کریں تاکہ میں عبدالخیل میں درس و تدریس کا کام جاری رکھ سکوں۔ یہ شرط مان لی گئی۔

محمود اور ان کے طالب علم عبدالخیل میں آگئے۔ مسجد آباد ہوگئی۔ پانچوں وقت اذان کی آواز گونجنے لگی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گاؤں والوں نے ایک بڑی سی حویلی ان کے حوالے کردی۔ یہی ان کا مدرسہ اور یہی ان کی رہائش گاہ تھی۔ کھانے کے وقت لڑکے سالن

www.tezpakistan.com

اور روٹی گاؤں کے مختلف گھروں سے مانگ کر لے آتے۔ ان دنوں چونکہ عرب عام تھی، اس لیے زیادہ تر باجرے ہی کی روٹی کھانے کو ملتی۔ گندم ایک تو ویسے ہی کم پیدا ہوتی اور دوسرے سردیوں میں اس کا حصول اور بھی دشوار ہوتا۔ ایک بار محمود نے گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور کہا، باجرے کی روٹی کھا کر میں درس و تدریس کا کام نہیں کر سکتا، اس سے مجھے جسمانی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو گندم اکٹھی کر لیں۔ اس پر گاؤں والوں نے تمام گاؤں سے گندم اکٹھی کرنی شروع کی۔ تین چار سو گھر تھے، لیکن کوشش کے باوجود وہ تین چار ٹوپے سے زیادہ گندم اکٹھی نہ کر سکے۔ انہوں نے وہی لا کر محمود کے سامنے ڈھیر کر دی۔

عبدالخیل میں محمود کی مصروفیات صرف پڑھنے پڑھانے تک ہی محدود نہیں تھیں، فارغ وقت میں ورزش اور کھیل تفریح کا اہتمام بھی ہوتا۔ اپنے طلبا کی اور اپنی صحت کا بے حد خیال رکھتے۔ عصر کی نماز کے بعد روزانہ ایک والی بال لے کر گاؤں سے باہر نکل جاتے۔ طالب علم بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔ کھلی جگہ میں شام تک آپس میں والی بال کا مقابلہ ہوتا۔ کھیل کا کھیل، ورزش کی ورزش۔ والی بال اتنی باقاعدگی اور شوق سے کھیلتے کہ جلد ہی گاؤں میں ان کا نام ہی 'مولوی والی بال والا' مشہور ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد مولوی محمود نے عبدالخیل میں اپنا مکان تعمیر کر لیا اور مستقلاً یہیں رہائش اختیار کر لی۔ کچا مکان تھا۔ مردانے میں تین کمرے تھے جو بیٹھک اور حجرے کا کام دیتے۔ . . . کچے فرش، کچی دیواریں، کمروں پر بٹی ہوئی مزری اور سرکنڈوں کی چھتیں ڈالی گئیں۔ لکڑی مہنگی اور دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے علاقے بھر میں مکانوں کی تعمیر کا یہی انداز تھا۔ آج بھی یہاں چھتیں انہی چیزوں کی تیار کی جاتی ہیں۔ ایک کچی چار دیواری پھیر کر زنان خانے کو مردانے سے الگ کر دیا گیا ——— آج یعنی ۱۹۸۱ء میں بھی یہ مکان جوں کا توں ہے۔ اس میں صرف دو اضافے کیے گئے ہیں۔ ایک زنان خانے والے حصے کی طرف لوہے کا بڑا گیٹ اور دوسرا مردانے کے ساتھ ملحق ایک پختہ کمرے کی تعمیر۔ یہ کمرہ مفتی صاحب نے تعمیر نہیں کرایا، بلکہ سرگودھا کے ایک عقیدت مند نے بڑے اصرار سے اپنے خرچ پر تعمیر کر کے دیا ہے۔ آخری دنوں میں بیماری اور تکلیف کی وجہ سے انہیں اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں دشواری اور مشکل پیش آتی تھی، لیکن دوسری طرف شوگر کی وجہ سے انہیں مجبوراً پیشاب کے لیے بار بار اٹھنا پڑتا۔ بیت الخلا ذرا دور واقع تھا۔ اس تکلیف سے بچنے کا حل یہ نکالا گیا کہ ایک پختہ کمرہ تعمیر کر کے اس میں ساتھ ہی باتھ روم بنا دیا گیا جس میں فلش کا انتظام موجود ہے۔ اس سے مفتی صاحب پیشاب کرنے کے لیے بار بار باہر اور دور جانے کی زحمت سے بچ گئے۔

✺

وقت گزرتا رہا۔ خلیفہ محمد صدیق کا لڑکا جو پہلے صرف محمود تھا، اب 'مولوی صاحب' کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس کے علم و فضل کی دھاک بیٹھتی اور شہرت پھیلتی چلی گئی۔ طالب علم اس کی علمی موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں پر سر دھنتے اور لوگ اس کی ہر لحظہ مسکرانے کی عادت، مزاج میں نرمی، طبیعت میں انکسار اور سادگی کے گن گاتے۔ یہ مولوی خوراک، پوشاک، رفتار، گفتار، نشست و برخاست، عادات و اطوار ——— ہر معاملے میں بے انتہا سادہ، حد درجہ اعلیٰ کھرا انسان تھا۔ تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور۔

کچھ عرصے بعد اس کے چند شاگرد عبدالخیل سے نکل کر ملتان کے مدرسہ قاسم العلوم پہنچے۔ ان کے ساتھ ان کے استاد کی شہرت بھی وہاں پہنچی۔ چند ماہ بعد مدرسے میں ایک نئے مدرس کی جگہ نکلی، تو انتظامیہ کی نگاہِ انتخاب 'مولوی محمود' پر پڑی۔ اُسے بلوانے کے لیے ایک آدمی بھیجا گیا۔ 'مولوی صاحب' نے گاؤں والوں کو اکٹھا کیا اور بتایا کہ ملتان کے ایک مدرسے والے میری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں وہاں چلا جاؤں۔ گاؤں والے زمانے کہ ہماری مسجد اور مدرسے کی رونق جاتی رہے گی۔ قاصد کو مایوس اور ناکام لوٹنا پڑا۔ اگلے سال دوبارہ پیغام آیا، "مولوی صاحب" یہاں آجائیے۔ اس سے آپ کو بھی علمی طور پر فائدہ پہنچے گا۔ 'مولوی صاحب' نے ایک بار پھر گاؤں والوں کو اکٹھا کیا اور ان سے جانے کی اجازت مانگی۔ اب کے حالات بھی ذرا سازگار تھے۔ "مولوی صاحب" کے چھوٹے بھائی خلیفہ محمد ان کی جگہ لینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ یہ ملتان کے مدرسوں میں پڑھتے تھے اور آخری دورہ انہوں نے عبدالخیل میں "مولوی صاحب" سے پڑھا تھا۔ "مولوی صاحب" نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، خلیفہ محمد میری جگہ لے سکتے ہیں۔ وہ یہاں نماز پڑھایا کریں گے اور طالب علموں کو بھی سبق دے دیا کریں

www.tezpakistan.com

گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ رمضان میں اور عید پر آپ سے ملنے یہاں ضرور آیا کروں گا۔ اس طرح "مولوی صاحب" کو ملتان جانے کی اجازت مل گئی۔ مولوی صاحب نے بھی گاؤں والوں سے اپنا کیا ہوا وعدہ نبھایا۔ جب تک زندہ رہے، ملک میں کہیں بھی ہوتے، رمضان اور عید پر عبدالخیل کا چکر ضرور لگاتے۔ زندگی میں ایک آدھ مرتبہ رمضان، عبدالخیل سے باہر گزارا اور وہ بھی کسی انتہائی مجبوری کے تحت۔ ایک بار سوات چلے گئے تھے۔ بعد میں اس پر افسوس کرتے اور کہتے کہ آدمی کا رمضان میں روزے گزارنے کے لیے کسی ٹھنڈے مقام پر چلے جانا روزے کا اصل مقصد ختم کر دیتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر اعتکاف اور عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب گئے تھے۔ وہاں عید کا چاند دو دن پہلے نظر آ گیا، اس لیے وہ یہاں جس دن عید تھی، واپس پہنچ گئے۔

ڈیرہ بنوں روڈ کی پختہ سڑک سے عبدالخیل کا فاصلہ سترہ، اٹھارہ میل ہوگا۔ آمد و رفت خاصی مشکل تھی۔ دن میں ایک آدھ لاری ادھر آتی۔ (آج بھی یہی کیفیت ہے) وقت بے وقت سفر کرنا پڑتا، تو یہ راستہ پیدل یا اونٹوں پر طے ہوتا۔ محمود بڑے شوق سے اونٹ پر سواری کرتے اور بڑے اچھے اونٹ سوار تھے۔ ایک مرتبہ اپنے برادر نسبتی مولوی عبدالحلیم کے ساتھ ملتان سے گھر آ رہے تھے۔ پنیالہ پہنچے تو دیر ہو گئی۔ جلدی گھر پہنچنے کے خیال سے وہاں سے کسی دوست سے اونٹ حاصل کیا۔ یہ ماری نسل کا تیز رفتار اونٹ تھا۔ آگے مولوی عبدالحلیم بیٹھے، ان کے پیچھے محمود۔ اونٹ نے بھاگنا شروع کیا، تو محمود نے مولوی عبدالحلیم کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مولوی عبدالحلیم اپنے دل میں سمجھے محمود، اونٹ پر بیٹھنے سے خوفزدہ ہے؛ چنانچہ بار بار پیچھے مڑ کر تسلی دیتے اور کہتے، سنبھل کر بیٹھیے، کہیں گر نہ جائیں۔ دوسری طرف محمود اپنے دل میں سوچتے شاید عبدالحلیم گھبرا رہا ہے۔ جواب میں وہ اُسے تسلی دیتے اور یہی الفاظ دُہراتے: بھئی سنبھل کر بیٹھنا کہیں گر نہ پڑنا۔

اس طرح سرپٹ بھاگتے ہوئے پنیالہ سے باہر نکلے۔ راستے میں عبدالخیل والوں کی چند جھونپڑیاں پڑتی تھیں۔ وہاں سے گزرنے لگے تو انہوں نے رُکنے کی دعوت دی۔ محمود نے اُونٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آواز دی، یہ اونٹ نہیں ٹھہرتا اور اسی طرح اونٹ دوڑاتے ہوئے وہاں سے دُور نکل آئے۔

اس حدیث پر آج ہی عمل ہونا چاہیے

قاسم العلوم کی بنیاد مولانا حسین احمد مدنیؒ نے رکھی تھی اور اسے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نام نامی سے منسوب کیا گیا تھا۔ اس کا شمار ملک کے چند بڑے دینی مدارس میں ہوتا تھا۔ مولوی محمود یہاں رفتہ رفتہ صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ کچھ عرصے بعد یہاں سے فتوے جاری کرنے کا فرض بھی آپ کو سونپ دیا گیا اور یوں وہ مولوی صاحب سے مفتی صاحب ہو گئے۔ مولانا مفتی محمود۔

عبدالخیل میں مولانا مفتی محمود کی تفریح اور ورزش، والی بال کا کھیل تھا۔ ملتان آئے تو والی بال کا ساتھ چھوٹ گیا؛ تاہم انہوں نے کسی نہ کسی شکل میں ورزش جاری رکھی۔ کچھ عرصے تک مگدر ہلانے کا شوق رہا۔ پھر جُوں جُوں ذمہ داریوں میں اضافہ ہُوا، ان کی علمی اور دینی مصروفیات بڑھتی گئیں اور ان کے لیے کسی طرح کی ورزش وغیرہ کے لیے وقت نکالنا ممکن نہ رہا۔

مولانا مفتی محمود کا رویہ شروع سے اپنے طالب علموں سے خاصا بے تکلفانہ تھا۔ ہمیشہ ان میں گھُل مِل کر رہتے۔ ایک بار درسِ حدیث میں مصروف تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے ایک حدیث میں کہیں ثرید کا ذکر آ گیا۔ ثرید، گوشت کے شوربے میں گندم کی کوٹی ہوئی روٹی کو کہتے ہیں۔ اس کے متعلق حدیث میں آیا تھا کہ یہ کھانا دوسرے تمام کھانوں پر اس طرح فضیلت رکھتا ہے جس طرح حضرت عائشہؓ دوسری عورتوں پر۔ مفتی محمود درس دیتے دیتے رُک گئے۔ چند لمحے کچھ سوچا۔ پھر بولے: اس حدیث پر تو آج ہی عمل ہونا چاہیے۔ انہوں نے کتاب ایک طرف رکھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اپنے داہنی طرف بیٹھے ایک طالب علم کو دیتے ہُوئے بولے: یہ لو میری طرف سے دس روپے، باقی پیسے تم لوگ ڈالو۔ رات کو آج ہم سب ثرید کھائیں گے تاکہ اس سُنّت پر عمل ہو جائے۔

چند دن بعد دوبارہ ثرید کا دَور چلا، لیکن اس مرتبہ تمام خرچہ مفتی صاحب کو برداشت کرنا پڑا۔ ہُوا یُوں کہ دارالحدیث میں بیٹھے تھے کہ ایک نوعمر شاگرد لفافہ لایا اور کہا، گھر سے چٹھی آئی ہے، ذرا پڑھ دیجیے کیا لکھا ہے۔ مفتی صاحب نے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پُرزہ نکلا۔ اس پر صرف چند حروف لکھے تھے ۔"تمہارا بھائی پیدا ہُوا ہے، مُبارک ہو"۔ مفتی صاحب اسے خط پڑھ کر سُنا رہے تھے کہ اِدھر اُدھر سے کئی

www.tezpakistan.com

اور طالب علم بھی وہاں آگئے اور لگے دریافت کرنے کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ مفتی صاحب نے یہ خوشخبری انہیں بھی سُنادی کہ اس لڑکے کا بھائی پیدا ہُوا ہے۔ بس پھر کیا تھا، سب لڑکے اس طالب علم کے گرد ہو گئے اور لگے تقاضا کرنے کہ نکالو پیسے ۔ اس خوشی میں دعوت ہونی چاہیے۔ لڑکے نے کچھ پس و پیش کی، لیکن پھر مفتی صاحب کے کہنے پر پیسے نکال کر دے دیے۔ ان پیسوں سے ثرید تیار ہُوئی۔ سب نے مل کر خُوب مزے مزے سے کھائی۔

مفتی صاحب، عصر کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں آنے لگے، تو وہ نوعمر طالب علم بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا جسے صبح انہوں نے خط پڑھ کر سُنایا تھا۔ اس نے کہا، حضرت! میرا باپ تو عرصہ ہُوا فوت ہو چکا ہے ۔ یہ بھائی کہاں سے پیدا ہو گیا، میرے پیسے واپس کر دیجیے، مَیں غریب آدمی ہُوں۔ مفتی صاحب نے تحقیق کی تو اس کی بات درست نکلی۔ دوسرے ساتھیوں نے اعتراف کر لیا کہ انہوں نے ثرید کھانے کے لیے یہ چکر چلایا تھا۔ اُسے جھُوٹ مُوٹ ایک خط لکھ کر بے چارے سے پیسے اینٹھے گئے تھے۔ اب اس کا اصرار تھا کہ میرے پیسے واپس کیے جائیں۔ مَیں غریب آدمی ہُوں۔ مَیں نے مفتی صاحب کے کہنے پر پیسے دیے تھے، وہی یہ پیسے واپس دلائیں۔ مفتی صاحب نے اپنی جیب سے یہ رقم ادا کی، تب اُس نے اطمینان کی سانس لی۔

۱۰ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۳ء کو اللہ نے مولانا مفتی محمود کو فرزند عطا فرمایا۔ اس کا نام فضل الرحمٰن رکھا گیا۔ دادا، دادی نے بڑی خوشی منائی، لیکن دوسری طرف مفتی صاحب کی اہلیہ بیمار پڑ گئیں اور بیماری نے کچھ ایسی پیچیدگی اختیار کر لی کہ جو بچہ بھی ہوتا، زندہ نہ بچتا۔ دوا دارُو کرتے سات سال گزر گئے، لیکن کوئی دوا، کوئی مشورہ کارگر ثابت نہ ہُوا۔ ان کے مُرشد صاحبزادہ عبدالعزیز شاہ نے انہیں رائے دی کہ دوسری شادی کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ایک مرید عبدالستار سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح مفتی محمود سے کرا دے۔ عبدالستار کا تعلق ایک قریبی بستی وانڈہ معظم سے تھا۔ وہ اپنے مُرشد کا حُکم نہ ٹال سکے۔ انہوں نے مولانا مفتی محمود کے چھوٹے بھائی خلیفہ محمد (بڑے بھائی احمد کا انتقال ہو چکا تھا۔ مفتی محمود ان دنوں مراد آباد میں زیرِ تعلیم تھے) کو بُلایا اور شادی کی بات پکی کر کے تاریخ مقرر کر دی۔ مقررہ تاریخ پر مولانا مفتی محمود، اُونٹوں پر بارات لے کر وانڈہ معظم پہنچے اور دُلہن بیاہ کر لے آئے۔ یہ شادی ۱۹۶۰ء میں ہُوئی۔

✺

اپریل ۱۹۶۲ء میں صدر ایوب نے بی ڈی سسٹم کے تحت قومی اسمبلی کے پہلے انتخابات کرائے۔ انتخابات کا اعلان ہُوا، تو جمعیت نے مولانا مفتی محمود کو اپنا اُمیدوار نامزد کیا ہے۔ مفتی صاحب نے ان انتخابات میں انفرادی حیثیت سے حصہ لیا، کیونکہ سیاسی جماعتوں پر ابھی تک پابندی تھی۔ بات چلی، تو مولانا مفتی محمود نے کہا: اگر آپ لوگوں نے الیکشن میں حصہ لینے کا عزم کر ہی لیا ہے، تو ٹھیک ہے، میرا نام ممبری کے لیے تجویز کر دیں۔ مَیں اس کام کا بیڑا اُٹھانے کے لیے تیار ہوں، لیکن اس سے پہلے مَیں خانقاہ یٰسین زئی کے صاحبزادگان سے مشورہ کروں گا۔ جمعیت نے مشورے کی اجازت دے دی؛ چنانچہ مولانا مفتی محمود، کلاچی والے قاضی عبداللطیف، مولوی علاؤالدین، مولانا عبدالقدوس اور صاحبزادہ حمید کے ہمراہ ایک موٹر میں بیٹھ کر خانقاہ یٰسین زئی پہنچے اور سجادہ نشینوں سے کہا کہ اگر آپ لوگ میری حمایت کریں، تو مَیں الیکشن میں کھڑا ہو جاؤں، ورنہ انکار کر دُوں۔ انہوں نے اپنی حمایت کا یقین دلایا، تو مولانا مفتی محمود نے اپنا نام ممبری کے لیے تجویز کرنے کی اجازت دے دی۔

مقابلے میں علاقے کے خوانین اور نوابزادے اُمیدوار تھے۔ سرکاری مشینری بھی بڑی حد تک ان کی پُشت پناہی اور حمایت کر رہی تھی۔ چند دن پہلے ڈاکٹروں نے مولانا مفتی محمود کا طبّی معاینہ کیا تھا اور شُوگر تشخیص کر کے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن مولانا مفتی محمود نے ہنس کر ٹال دیا اور کہا، یہ سب ڈاکٹروں کی باتیں ہیں، کچھ نہیں ہوگا۔ انہوں نے زور شور سے اپنی انتخابی مہم جاری رکھی اور اُونٹوں پر سارے علاقے کا دورہ کیا۔

ایک بار ویگن کرائے پر لے کر پلوارہ پہنچے۔ وہاں حسین خان ممبر تھا۔ پہاڑ سے نیچے اترائی میں اس کا مکان تھا۔ ویگن سڑک پر کھڑی کر کے وہاں تک پیدل جانا تھا۔ دس بارہ آدمی ہمراہ تھے۔ جاتے وقت تو کچھ محسوس نہ ہُوا، لیکن واپسی پر جب عمودی چڑھائی چڑھنی پڑی، تو سانس پھُول گیا۔ ہانپتے ہُوئے سڑک پر پہنچے، تو بولے: بھئی "ستڑے مُشے" کا فلسفہ آج صحیح معنوں میں میری سمجھ میں آیا۔ (پشتو کا یہ جُملہ کسی مسافر کا استقبال کرنے

www.tezpakistan.com

کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ مطلب ہے، تھکو نہیں) تھکے ہارے مُسافر کو جب یہ استقبالی جُملہ سُننے کو ملتا ہے تو اس کی تھکن بہت حد تک دُور ہو جاتی ہے۔

مقابلہ بڑا زوردار تھا۔ مولانا مفتی محمود کو قدم قدم پر مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے کسی مرحلے پر کمزوری کا اظہار نہیں کیا، بلکہ آگے بڑھ کر مخالفین پر بھرپور وار کیے اور ان کے اعتراضات کے مُنہ توڑ جواب دیے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کا ایک جلسہ تھا۔ اس میں تمام اُمیدوار مدعو تھے۔ ایک مدمقابل نے جنہیں اپنی قانون دانی پر بہت ناز تھا، بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے ووٹ کی اپیل کرتے ہُوئے مفتی محمود پر چوٹ کی اور کہا: مجھے کسی کے علم اور تقویٰ پر اعتراض نہیں، لیکن یہ قانون ساز اسمبلی کا معاملہ ہے۔ یہاں وہی نمائندہ آپ کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، جو قانون جانتا ہو۔ دیکھیے اگر آپ کو ہوائی جہاز کے لیے کسی پائلٹ کی ضرورت ہو تو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اس فن میں کتنی مہارت رکھتا ہے؟ اس کا نمازی یا پابندِ زکوٰۃ ہونا آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

مفتی محمود کے بولنے کی باری آئی، تو انہوں نے اس مقرّر کے خوب لتے لیے۔ انہوں نے کہا: مجھے اپنے فاضل دوست کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ ہر کام کے لیے اس فن کے ماہر کو منتخب کرنا چاہیے۔ مَیں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ قانون ساز اسمبلی میں قانون دان حضرات کو بھیجنا چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اس ملک میں کوئی قانون جاری کرنا یا مروجہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا مطلوب ہے؟ اگر اسلامی اور صرف اسلامی قانون ہی بنوانا مقصود ہے، تو پھر انہی لوگوں کو بھیجیے جو اسلامی قانون میں مہارت رکھتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود کے ان الفاظ نے ہال کی کایا کلپ کر دی۔ اُصول بتانے والے حضرت مُنہ تکتے رہ گئے۔ محفل میں ایک بڑے وکیل بھی موجود تھے جو خود بھی اُمیدوار تھے۔ وہ پینترا بدل کر بولے: مفتی صاحب نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ اسلامی قانون صرف وہی جانتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بھی اسلامی قانون پڑھایا جاتا ہے اور مشہور یونیورسٹیاں ہمیں اسلامی فقہ کی سند جاری کرتی ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اسلامی قانون کیا ہے۔ . . . اس پر مولانا مفتی محمود نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: مَیں نے شخصیات کی بحث نہیں کی، ایک اصول بتلایا ہے کہ پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے لیے ایک ایسا نمائندہ منتخب کر کے بھیجیے جو موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق کرانے کی اہلیت رکھتا ہو اور آپ اس پر اسلامی قانون کو سمجھنے کے سلسلے میں اعتماد کر سکتے ہوں۔ رہی شخصیات کی بات، تو یہ فیصلہ بُنیادی جمہوریتوں کے ان ممبروں نے کرنا ہے کہ اس سلسلے میں وہ کس پر اعتماد کریں۔ اگر یہ لوگ آپ پر اسلامی فقہ کے ماہر ہونے کا اعتماد کرتے ہیں، تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے!

بنیادی جمہوریتوں کے ارکان نے مولانا مفتی محمود کی بات پلے باندھ لی۔ پولنگ کا دن آیا، تو انہیں دھڑا دھڑ ووٹ پڑنے لگے۔ نتیجہ نکلا، تو مولانا مفتی محمود ڈیرہ اسماعیل خاں میں تھے۔ انہوں نے اپنی کامیابی کی خبر وہیں سُنی۔ وہ بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب قرار پائے تھے۔ اکثر مخالفوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ صرف ایک مخالف اُمیدوار نوابزادہ فتح اللہ اپنی ضمانت بچانے میں کامیاب ہو سکا۔ اس یادگار دن کو انتخابی نتیجہ سننے کے بعد اپنے عقیدت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے اور مبارک باد وصول کر رہے تھے کہ عبدالخیل سے کچھ لوگ آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک نئی خوشخبری سنائی، مبارک ہو آپ کے ہاں عبدالخیل میں بیٹا اور بیٹی تولد ہوئے ہیں۔ ایک بار پھر مبارک سلامت کا شور بلند ہُوا اور لوگ اُٹھ اُٹھ کر دوبارہ مفتی صاحب سے گلے ملنے لگے۔ اللہ کے فضل سے ان کی بیمار اہلیہ بھی صحت یاب ہو گئی تھیں۔ انہوں نے لڑکے کو جنم دیا تھا۔ اس کا نام بعد میں عطاء الرحمٰن رکھا گیا۔ دوسری بیوی کے ہاں بچی ہوئی تھی۔ بہن بھائی کی پیدائش میں چند گھنٹوں کا فرق تھا۔

مولوی صاحب ـ ڈبے سے پیچھے ہٹ جائیے

۱۹۶۲ء کے الیکشن میں کامیابی کے بعد ملک میں پہلی بار عام لوگوں نے بھی مولانا مفتی محمود کا نام سنا۔ اس وقت تک جمعیت کے حلقوں سے باہر انہیں بہت کم لوگ جانتے تھے۔ تصویر بھی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانے لگے، تو ملتان کے ریلوے اسٹیشن پر بڑی دلچسپ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ گاڑی میں ان کی سیٹ ریزرو تھی، لیکن جب ساتھیوں

www.tezpakistan.com

کے ہمراہ ڈبے میں داخل ہونے لگے، تو ڈیوٹی پر موجود پولیس کے ایک سپاہی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ ڈبہ قومی اسمبلی کے ممبر مفتی محمود صاحب کے لیے ریزرو ہے۔ آپ یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔ کسی دوسرے ڈبے کا رُخ کریں۔ ساتھیوں نے کسی نہ کسی طرح اندر گھس کر ان کا سامان تو ڈبے میں رکھ دیا، لیکن سپاہی نے مولانا مفتی محمود کو ڈبے میں نہ گھسنے دیا۔ بار بار یہی کہتا، یہ قومی اسمبلی کے ممبر مفتی محمود کے لیے ریزرو ہے، یہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ کسی دوسرے ڈبے میں چلے جائیے۔ وہ آپ کو یہاں نہیں بیٹھنے دے گا۔ سامان بھی آپ کو اُٹھانا پڑے گا۔ مجھے ڈانٹ پڑے گی۔ آپ بھی ناحق پریشان ہوں گے، اس لیے پہلے سے اپنے لیے کسی سیٹ کا بندوبست کرلیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ درمیانے قد اور دُہرے جسم کا مالک انسان جس نے سر پر ریشمی رومال لپیٹ رکھا ہے اور کھدر کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس ہے، قومی اسمبلی کا ممبر بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا کوئی دیہاتی مولوی ہے جو اپنی لاعلمی یا کسی مغالطے کی وجہ سے اس ڈبے کی طرف چلا آیا ہے۔

مولانا مفتی محمود سپاہی کی ڈانٹ ڈپٹ سُن کر خاصے محظوظ ہوئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا کہ وہ سپاہی سے اُن کے متعلق کچھ نہ کہیں۔ ساتھی بھی سپاہی کی جھلاہٹ اور غصہ دیکھ کر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ سپاہی کو دوسری طرف متوجہ پاکر جونہی مفتی صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ڈبے کی طرف بڑھتے، سپاہی تیزی سے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیتا۔ گاڑی چلنے میں چند منٹ رہ گئے، تو مفتی صاحب نے سوچا، اب اس ڈرامے کو ختم کرنا چاہیے۔ وہ آخری بار اپنے ڈبے کی طرف بڑھے۔ سپاہی کو غصہ آگیا۔ چیخ کر بولا: مولوی صاحب — کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ ڈبہ ریزرو ہے۔ مفتی محمود کے سوا یہاں اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ چلو ہٹو پیچھے۔ اب مفتی صاحب آنے ہی والے ہوں گے۔ کسی اور ڈبے میں چل کر بیٹھو۔ مولانا مفتی محمود کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ چند لمحے خاموش کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر کندھے پر رومال ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ اللہ کے بندے! دوسرے ڈبے میں چل کر کیسے بیٹھوں میری سیٹ اس ڈبے میں ریزرو ہے۔ مَیں ہی تو مفتی محمود ہوں — قومی اسمبلی کا ممبر — یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ سپاہی کو جیسے سانپ سُونگھ گیا ہو، چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ پھر وہ تیزی سے ہٹ کر ایک طرف مؤدب کھڑا ہو گیا۔ مفتی صاحب نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ کر ڈبے میں داخل ہو گئے۔

✺

قومی اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ہُوا، تو حلفِ وفاداری کے موقع پر ہی ان کی صدر ایوب سے ٹھن گئی۔ انہوں نے صدر ایوب کے غیر اسلامی، غیر جمہوری اور آمرانہ دستور کے خلاف بغاوت کر دی۔ حلف نامے کی عبارت میں درج تھا کہ — "دستور کو باقی اور قائم رکھیں گے"۔ مولانا مفتی محمود نے اس کے آخر میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا: اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس کو جُوں کا تُوں رکھیں گے۔ بلکہ اس دستور کے دیے ہوئے اختیارات کو بروئے کار لا کر ان جملہ خرابیوں اور خامیوں کی جو کتاب و سنت یا جمہوری لحاظ سے اس میں ہوں گی، ان میں ترمیم و تنسیخ کریں گے۔ ان الفاظ کا حلف کی کارروائی میں باقاعدہ اندراج ہُوا اور اس طرح یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مفتی صاحب کی نکتہ آفرینی، سیاسی بصیرت اور حق گوئی و بیباکی کے گواہ بن گئے۔

مولانا مفتی محمود نے قانون ساز اسمبلی میں آزاد خارجہ پالیسی اور بجٹ پر یادگار تقریریں کیں۔ ان دنوں عائلی قوانین کا بڑا غلغلہ تھا۔ مولانا مفتی محمود نے اس مسئلے پر زور دار معرکہ لڑا۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ صدر ایوب اس مسئلے کو اپنے ذاتی وقار کا سوال بنا چکے ہیں، لیکن انہوں نے اسمبلی میں اس آرڈی ننس کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مفتی صاحب نے اس موقعے پر ایک معرکۃ الآرا تقریر کی جو ایک گھنٹہ دس منٹ تک جاری رہی۔ انہوں نے اسلام کے عائلی نظام کے ایک ایک گوشے پر تفصیلی بحث کی اور سرکاری پنجوں کی طرف سے دیے جانے والے تمام دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں — نتیجہ یہ کہ وہ اقتدار کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگے۔ کچھ عرصے بعد ایک موقع ایسا آیا کہ مفتی صاحب نے اپوزیشن کا ساتھ نہیں دیا اور ایک ایسی ترمیم کی حمایت کی اور حق میں ووٹ دیا جو صدر ایوب کی طرف سے اسمبلی میں پیش کی گئی تھی۔ (تفصیل اگلے صفحات پر آئے گی)

www.tezpakistan.com

۱۹۶۵ء میں جب دوبارہ قومی اسمبلی کے انتخابات کا وقت آیا تو مولانا مفتی محمود کو ناکام بنانے کے لیے خاص ہدایات جاری کر دی گئیں۔ مفتی صاحب جہاں بھی ووٹ مانگنے جاتے، وہاں ان سے پہلے پولیس موجود ہوتی۔ حلقے کے بی۔ ڈی ممبروں کو تھانوں میں طلب کر کے ڈرایا جاتا کہ خبردار، مفتی محمود کو ووٹ نہ دینا۔ اگر مفتی محمود تمہارے حلقے سے کامیاب ہوا، تو اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی۔ اس کے باوجود مولانا مفتی محمود نے الیکشن میں حصہ لیا۔ وہ بظاہر ہار گئے، مگر اصل میں یہ ہار بھی ان کی جیت تھی۔

✺

حالات کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں، بھلا دیوانے بھی کبھی ترکِ وفا کرتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں صدر ایوب کی حکومت کا دسواں سال تھا۔ اپنے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب ملک بھر میں کوئی طاقت ان کی حکومت کو چیلنج نہیں کر سکتی۔ فضا میں چاروں طرف خوف، بے بسی اور مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ سیاست، ڈرائنگ روم کی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ حکومت اپنی کامیابیوں پر نازاں ہو کر دس سالہ جشن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ عین اس وقت مولانا مفتی محمود اور ان کے ساتھیوں نے ایک پھریری لی اور اپنی پوری قوت سے آمریت کو للکارنے کا فیصلہ کر لیا۔

۳، ۴، ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو لاہور کی تاریخی جلسہ گاہ — باغ بیرون موچی دروازہ میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے تقریباً پانچ ہزار علما اور نمائندوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کے آخری دن ایک بہت بڑا جلوس نکلا۔ علماء کی طرف سے پاکستان میں اپنی قوت کا یہ پہلا بھرپور مظاہرہ تھا۔ اس کی صدائے بازگشت دور دور تک سنی گئی۔ اب ملکی سیاسیات میں علماء کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ مولانا مفتی محمود اپنی جماعت کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ ان کی متحرک اور فعال شخصیت نے جلد ہی انہیں عوام میں بے حد مقبول بنا دیا اور ان کی جماعت ملکی سیاسیات میں ایک اہم عنصر بن گئی۔

وقت گزرتا رہا۔ ملکی حالات نے کئی کروٹیں بدلیں تا آنکہ صدر ایوب رخصت ہوئے اور ان کی جگہ صدر یحییٰ نے اقتدار سنبھال لیا۔

✺ **بڑے شوق سے آئیے، الیکشن لڑیے**

صدر یحییٰ نے یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو عام انتخابی سرگرمیوں کی اجازت دی، تو سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اُتر آئے۔ پاکستان کی ۲۳ سالہ سیاسی تاریخ میں پہلے عام انتخابات ہو رہے تھے۔ کسی جماعت کو بھی اپنی طاقت اور عوامی تائید کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ مولانا مفتی محمود اپنے آبائی ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں سے قومی اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں ذوالفقار علی بھٹو نے بھی یہاں سے کاغذاتِ نامزدگی داخل کیے۔ وہ بیک وقت چھ سیٹوں پر الیکشن لڑ رہے تھے۔ بھٹو صاحب کے کاغذاتِ نامزدگی داخل کیے جا رہے تھے، تو ریٹرننگ آفیسر نے پوچھا، مفتی صاحب کوئی اعتراض؟ — مفتی صاحب بولے، کوئی اعتراض نہیں، شوق سے آئیں، الیکشن لڑیں۔

انتخابی مہم کے دوران مولانا مفتی محمود کا زیادہ تر وقت اپنی پارٹی کے دوسرے اُمیدواروں کے جلسے جلوسوں میں تقریریں کرتے گزرا۔ اپنے حلقے میں بمشکل چودہ دن رہے ہوں گے۔ یہاں کا انتخابی محاذ قاضی عبداللطیف کلاچی والے اور علاؤالدین صاحب کو سنبھالنا پڑتا۔ خواجہ زاہد ان کے خزانچی اور ڈیرہ اسماعیل خان شہر میں دفتر کے ناظم تھے۔ مئی ۷۰ء میں ان لوگوں نے ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک بڑے جلسۂ عام کا انتظام کیا۔ مفتی صاحب نے اس میں تقریر کرنی تھی۔ ان سے پہلے سر بھٹو یہاں خطاب کر کے جا چکے تھے۔ پیر قمرالدین سیالوی بھی چکر لگا گئے تھے۔ دوسری جماعتیں بھی اپنے اپنے جلسے منعقد کر چکی تھیں۔ امریکی سفیر فارلینڈ بھی انہی دنوں بہ نفسِ نفیس ڈیرہ اسماعیل خان کا جائزہ لینے آیا تھا۔ وہ یہ جاننے کا انتہائی آرزومند تھا کہ اس علاقے میں مولانا مفتی محمود کے اثرات کس قدر ہیں۔

انتخابی جلسوں میں ہر پارٹی اور اُمیدوار نے مفتی صاحب کے خلاف صدر ایوب کی آمریت کی حمایت کرنے کے الزام کو خوب خوب اُچھالا تھا، اس لیے مفتی صاحب کے ساتھیوں کو بھی یہاں جلسے کا انتظام کرنا پڑا۔ اتوار کے دن ظہر کی نماز کے بعد جلسے کا پروگرام بنا۔ خواجہ زاہد اور دوسرے ساتھیوں کو اندازہ تھا کہ گڑبڑ ضرور ہوگی؛ چنانچہ انہوں نے اس سے نمٹنے کے لیے اپنے طور پر پوری تیاری کر لی۔ جن جن لوگوں سے انہیں شرارت یا گڑبڑ کا اندیشہ تھا، ان سب کی ایک لسٹ تیار کر کے رضاکاروں میں تقسیم کر دی اور انہیں سختی سے ہدایت کر دی کہ جلسہ گاہ

www.tezpakistan.com

میں جونہی ان آدمیوں میں سے کوئی شخص نظر آئے چار پانچ رضا کار اس کے ساتھ لگ جائیں اور اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھیں۔ اس انتظام کے باعث گڑبڑ نہ ہو سکی اور مفتی صاحب کا جلسہ نہایت کامیاب رہا۔

لوگوں نے چٹیں بھیج بھیج کر مفتی صاحب سے سوالات کیے۔ زیادہ تر صدر ایوب کی حمایت کے پراپیگنڈے کے متعلق ہی استفسار کیا گیا۔ مفتی صاحب نے جواب میں کہا: میں نے اپنا ووٹ صدر ایوب کے حق میں نہیں، بلکہ آئین میں ایک ترمیم کے حق میں دیا تھا۔ اس سے پہلے پنڈی میں جماعت کی ایک میٹنگ میں اس آئینی ترمیم کے مسودے پر تفصیلی بحث ہو چکی تھی۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ اس کے حق میں ووٹ ڈالا جائے۔ دینی اور شرعی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت یا نقصان نہیں تھا۔ اس کے برعکس اس حمایت سے ہمیں ایک بڑا فائدہ حاصل ہونے کی توقع تھی اور وہ یہ کہ حکومت نے عائلی قوانین کا جو آرڈی ننس جاری کیا تھا، اس میں شرعی نقطۂ نظر سے کئی قباحتیں موجود تھیں۔ ہم نے اس آرڈی ننس کی اصلاح کے لیے حکومت کو چند ترامیم پیش کی تھیں۔ صدر ایوب نے وعدہ کیا تھا کہ مذکورہ آئینی ترمیم کی حمایت کی صورت میں وہ عائلی قوانین سے متعلق ہماری سفارشات اور ترامیم کو منظور کریں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بعد میں اپنے وعدے سے مکر گئے اور ہماری بہت کم سفارشات منظور کیں۔

وزارت قدم چومتی ہے

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر مغربی پاکستان روٹی، کپڑے اور مکان کی ایک زبردست لہر کی زد میں تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے کے لیے ہر جگہ سے بڑی مضبوط اور بااثر شخصیتوں کو میدان میں لایا گیا تھا، لیکن یہ لوگ بھی زبردست عوامی لہر کے آگے بند باندھنے میں ناکام رہے اور مسٹر بھٹو کے مقابلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ پورے ملک میں ڈیرہ اسماعیل خاں میں مولانا مفتی محمود کی واحد سیٹ تھی جہاں مسٹر بھٹو کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ مولانا مفتی محمود نے انہیں تیرہ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ ملک بھر میں یہ خبر بڑی حیرت اور مسرت سے سنی گئی۔ اخبارات میں اس کا خوب چرچا ہوا۔ صدر یحییٰ نے کہا، ملک میں اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے مفتی صاحب کی کامیابی ضروری تھی۔ شیخ مجیب نے پیغام بھیجا، آپ کی کامیابی سے اسلام کو تقویت پہنچے گی، لیکن سب سے دلچسپ تبصرہ خود مسٹر بھٹو کا تھا۔ انہوں نے کہا، میں آئندہ کبھی مفتی صاحب کے مقابلے میں الیکشن نہیں لڑوں گا۔

تین سو کے ہاؤس میں ایک سو اکیاون سیٹیں شیخ مجیب نے حاصل کی تھیں۔ سیلاب کے باعث نو سیٹوں پر ابھی انتخاب ہونا باقی تھا، لیکن ظاہر ہے وہ سیٹیں بھی شیخ مجیب ہی کی تھیں۔ طاقت کا مرکز نہایت فیصلہ کن انداز میں اسلام آباد سے ڈھاکہ منتقل ہو گیا تھا۔ اس صورت حال نے صدر یحییٰ کی تمام خواہشات اور اندازوں کے محل چکنا چور کر دیے۔ اس نے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ انتخابی نتائج کو ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا، لیکن یحییٰ خاں نے قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ کا اعلان نہ کیا۔ دوسری طرف مسٹر بھٹو نے افسوسناک بیان بازی شروع کر دی۔ خدا خدا کر کے تین مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان ہوا، لیکن پھر اس مقررہ تاریخ سے ٹھیک دو دن پہلے اسمبلی کے اجلاس کو کسی دوسری تاریخ تک ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس پر مشرقی پاکستان میں ایسا طوفان اٹھا کہ خدا کی پناہ۔ نوبت ہڑتالوں اور سول نافرمانی تک پہنچ گئی۔ مولانا مفتی محمود اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے حالات کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر حکومت مخلص نہیں تھی؛ چنانچہ وہی ہوا جو اس صورت میں ہونا چاہیے تھا۔ تلخیاں بڑھ گئیں اور آخر کار ہمیں اپنے ملک کے ایک حصے سے ہاتھ دھونے پڑے۔

✱

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مسٹر بھٹو نے یحییٰ خاں کی جگہ سنبھالی اور قوم کو "نئے پاکستان" کی تعمیر کے لیے پکارا۔ آئینی طور پر یہاں تین جماعتیں ملک کے مستقبل کی مالک نظر آتی تھیں۔ پنجاب اور سندھ میں بھٹو صاحب کی پارٹی واضح اکثریت میں تھی۔ سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت متوقع حکمران جماعتیں تھیں، لیکن مسٹر بھٹو نے ان کے ساتھ بڑا عجیب و غریب رویہ اختیار کیا۔ ایک طرف ان سے ملک کی تعمیر میں تعاون اور اقتدار میں شرکت کی درخواست کی اور دوسری طرف ان کے سروں پر اپنی پارٹی کے حامی گورنر مسلط کر دیے۔ مولانا مفتی محمود اور ان کے ساتھیوں نے

www.tezpakistan.com

اس تضاد کو مخصوص مُلکی حالات کے پیشِ نظر کچھ زیادہ اہمیت نہ دی اور مسٹر بھٹو کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہو گئے، لیکن جلد ہی حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ مسٹر بھٹو اور ان میں تلخی اور بدمزگی پیدا ہو گئی اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

۱۵ اپریل کو پشاور میں جمعیت کا ایک اجلاس ہُوا۔ اس میں جمعیت کے تمام ارکان قومی اور صوبائی اسمبلی نے شرکت کی، مگر مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا عبدالحکیم شریک نہ ہُوئے۔ اجلاس میں مولانا مفتی محمود کو سرحد اسمبلی میں پارٹی کا پارلیمانی لیڈر نامزد کرنے کے بعد تجویز پیش کی گئی کہ مولانا مفتی محمود کو نیپ اور جمعیت کے اجلاس میں مشترکہ پارلیمانی لیڈر منتخب کیا جائے؛ چنانچہ اگلے روز یعنی ۶ اپریل کو ان دونوں پارٹیوں کا مشترکہ پارلیمانی اجلاس ہُوا۔ خان عبدالولی خاں نے مولانا مفتی محمود کا نام پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے تجویز کیا۔ ارباب سکندر خاں خلیل اور امیرزادہ خان نے تائید کی اور یُوں نیپ اور جمعیت کے بائیس ارکانِ اسمبلی نے متفقہ طور پر مولانا مفتی محمود کو اپنا پارلیمانی لیڈر تسلیم کر لیا۔

مسٹر بھٹو نے جمعیت اور نیپ کے ارکانِ اسمبلی کو توڑ کر اپنے ساتھ ملانے کی بڑی کوشش کی، مگر بے سُود۔ قطعی ناکامی ہُوئی، تو مجبوراً مذاکرات کا سہارا لیا۔ ۲۲ اپریل کو "پریذیڈنسی" میں مسٹر بھٹو، ولی خاں اور مفتی محمود صاحب کے درمیان بات چیت شروع ہُوئی۔ یہ مذاکرات پانچ دن تک چلتے رہے اور آخرکار اس کے نتیجے میں، ۲۷ اپریل کو ایک سہ فریقی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس کی رُو سے نیپ کے میر غوث بخش بزنجو صوبہ بلوچستان اور ارباب سکندر خاں خلیل صوبہ سرحد کے گورنر قرار پائے۔ انہوں نے ۲۹ اپریل ۷۲ء کو کراچی میں حلف اُٹھایا۔ دو دن بعد یعنی یکم مئی ۷۲ء کو مولانا مفتی محمود اور سردار عطاء اللہ مینگل نے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے وزرائے اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ اس طرح ان دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومتیں قائم ہو گئیں۔

"سب سے بڑا صاحب" کون ہے؟

مولانا مفتی محمود وزیرِ اعلیٰ بن کر پشاور پہنچے، تو ان کی رہائش کا مسئلہ پیدا ہو گیا، کیونکہ وَن یونٹ کے خاتمے کے بعد پہلی مرتبہ صوبوں میں وزارتیں بن رہی تھیں اور چیف منسٹر ہاؤس ابھی خالی نہیں ہُوا تھا۔ وہاں کوئی انتظامی دفتر قائم تھا۔ مفتی صاحب کی رہائش کے لیے کسی مناسب اور موزوں عمارت کی تلاش شروع ہُوئی، تو نظرِ انتخاب گیسٹ ہاؤس پر پڑی۔ یہ انگریزوں کے دَور کی بنی ہُوئی بڑی وسیع اور کشادہ عمارت تھی۔ یہاں کا فرنیچر خاصا پُرانا تھا اور زیادہ تر اُس زمانے میں خریدا گیا تھا جب یہ عمارت شاہی مہمان خانے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ چیف سیکرٹری نے سوچا نیا وزیرِ اعلیٰ ہے، اس کے پاس غیر مُلکی مہمان بھی آئیں گے۔ پُرانی میز کُرسیاں اور بدرنگ صوفے یہاں بُرے لگیں گے؛ چنانچہ اُس نے سارا پُرانا فرنیچر اُٹھوا کر یہاں نیا فرنیچر سجانے کا پروگرام بنایا۔ مولانا مفتی محمود سے اس سلسلے میں بات کی، تو انہوں نے کوئی دھیان نہ دیا اور دوسری باتوں میں مصروف رہے۔ اس نے دو تین مرتبہ اپنی بات دُہرائی، تو مفتی صاحب اس کی طرف پلٹے اور عینک کے شیشوں میں سے گھورتے ہوئے متبسم لہجے میں کہا: اللہ کے بندے! کس چکّر میں پڑ گئے ہو، یہ فرنیچر ٹھیک ہے، اسے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ میرے اپنے گھر عبدالخیل میں تو کوئی ٹوٹا پھُوٹا صوفہ بھی نہیں۔ چیف سیکرٹری حیرت سے ان کا مُنہ دیکھنے لگا۔ اُسے دوبارہ اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہُوئی۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی سے نکل کر باہر چلا گیا۔

چند دن بعد مولانا مفتی محمود نے مختلف محکموں کے سیکرٹریوں اور اعلیٰ افسروں کی ایک میٹنگ بُلوائی۔ وہ افسروں سے خطاب کرنے کے علاوہ ان سے بات چیت کر کے ان کے فرائض کی نوعیت، طریقِ کار اور مشکلات کا اندازہ لگانا چاہتے تھے۔ بہترین تراش کے عمدہ سُوٹوں اور قیمتی کپڑوں میں ملبوس سیکرٹری اور افسر، کانفرنس رُوم میں داخل ہوتے، تو مولانا مفتی محمود کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھک سے جاتے۔ مفتی محمود نے عام دنوں کی طرح موٹے کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ ایک ریشمی رُومال سر سے لپٹا ہُوا تھا۔ دوسرا ان کے کندھوں پر پڑا ہُوا تھا۔ یہ سادگی اور حُلیہ دیکھ کر ان افسروں نے سوچا، یہ تو واقعی نرا مولوی ہے۔ اسے بھلا کیا معلوم کہ نظم و نسق کس چڑیا کا نام ہے اور کاروبارِ حکومت کیسے چلایا جاتا ہے۔ یہ تو قدم قدم پر ہمارا محتاج ہو گا۔ اسے اپنے ڈھب پر لانا کیا مشکل ہو گا، لیکن جب میٹنگ کی کارروائی شروع ہُوئی اور جُوں جُوں وقت گزرتا گیا، تو انہیں اپنے سارے اندازے اور قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوتی نظر آنے لگیں۔

www.tezpakistan.com

ایک صاحب نے اپنے محکمے کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرنی شروع کی، تو مولانا مفتی محمود کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور غور سے اُس کی باتیں سُننے لگے۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہ صاحب جوشِ خطابت میں موضوع سے ہٹ گئے۔ مفتی صاحب نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر کرسی کی پُشت سے ٹکا دیا۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے۔ جب گفتگو زیرِ بحث معاملے سے کچھ زیادہ ہی ہٹ گئی، تو مفتی صاحب نے اچانک آنکھیں کھولیں اور اپنے قریب بیٹھے چیف سیکرٹری سے مخاطب ہو کر کہا: میرا خیال ہے ہم زیرِ بحث موضوع سے کچھ زیادہ ہی دُور چلے گئے ہیں۔ یہ اس بے مقصد اور غیر ضروری گفتگو پر بڑی لطیف چوٹ تھی۔ افسرِ مذکور نے فوراً پینترا بدلا اور اصل موضوع پر باتیں چھڑ گئیں۔ اس چھوٹے سے واقعے سے میٹنگ میں موجود تمام افسروں کو بخوبی احساس ہو گیا کہ اس شخص کی بظاہر آنکھیں بند ہوتی ہیں، لیکن یہ ذہن کے دریچے کھُلے رکھتا ہے اور اس کی ہر معاملے پر بڑی گہری نظر ہے۔

مولانا مفتی محمود نے وزارتِ اعلیٰ کا حلف اُٹھانے کے فوراً بعد صوبے میں امتناعِ شراب کا حکم جاری کر دیا تھا۔ اس حُکم کی رُو سے صوبے میں شراب بنانے، پینے، رکھنے اور بیچنے پر پابندی عاید کر دی گئی تھی۔ میٹنگ کے دوران یہ معاملہ بھی زیرِ بحث آیا۔ ایکسائز کے محکمے سے متعلق افسروں نے اعداد و شمار کا ایک گوشوارہ بنا کر پیش کیا اور مفتی صاحب کو بتایا کہ شراب کی فروخت پر عاید ڈیوٹی سے ہر سال ایک کثیر رقم حاصل ہوتی ہے۔ اس بندش کے نتیجے میں صوبے کو سالانہ کئی لاکھ روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑے گا۔ مولانا مفتی محمود نے جواب دیا: خسارہ ہونے دیجیے۔ میں اپنا حکم واپس لینے سے تو رہا۔ میرے وزیرِ اعلیٰ بننے کے بعد یہاں جتنی شراب بھی پی جائے گی، اس سب کا حساب کتاب روزِ آخرت مجھ سے لیا جائے گا اور مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔ خسارہ لاکھوں نہیں، کروڑوں کا بھی کیوں نہ ہو، امتناعِ شراب کا حکم ضرور نافذ ہو گا۔
بعد میں مرکزی حکومت نے اعتراض کیا، غیر مُلکی مہمانوں اور مریضوں کے لیے گنجائش ہونی چاہیے۔ مفتی صاحب نے لکھ بھیجا کہ جو شے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دی ہو، وہ انسان کو شفا اور صحت کیونکر بخش سکتی ہے!

صوبہ سرحد کا سرکاری لباس شلوار قمیص قرار پایا، تو تمام بڑے اور چھوٹے افسر اس لباس میں ملبوس نظر آنے لگے۔ لباس بدلا، تو سرکاری دفتروں کا ماحول بھی بدل گیا۔ اب جو لوگ افسروں سے ملنے آتے، انہیں بجا طور پر یہ احساس ہوتا کہ وہ جس آدمی سے مل رہے ہیں، وہ اپنا ہی آدمی ہے کوئی بدیسی نہیں ہے۔ ایک بار آئی جی پولیس اپنے دفتر کے باہر کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے چند ماتحت بھی تھے۔ اتنے میں باہر سے ایک آدمی آیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی درخواست تھی۔ اس نے اس پر آئی جی کے دستخط کرانے تھے۔ وہ ان لوگوں کو غور سے دیکھتا ہُوا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دُور جا کر واپس پلٹا۔ اس کی نظریں ان افسروں پر جمی ہُوئی تھیں اور وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان میں آئی جی صاحب کون ہیں۔ وہاں پر کھڑے تمام افسروں نے ایک جیسا کرتہ شلوار پہن رکھا تھا۔ اس نے ان کے گرد تین چار چکر لگائے، مگر وہ آئی جی صاحب کو پہچاننے میں ناکام رہا۔ ظاہری حُلیے سے وہ سب ایک جیسے ہی نظر آتے تھے۔ آخر تنگ آ کر ان افسروں کے پاس پہنچا اور کہا: "اگر بُرا نہ منائیں، تو براہِ کرم اتنا بتا دیجیے کہ آپ میں سے سب سے "بڑا صاحب" کون ہے؟ ایک افسر نے آئی جی صاحب کی طرف اشارہ کیا اور یوں اس کی مُشکل حل ہُوئی۔

✻ آپ کے ہاں تو پرہیزانے" ہوتے ہیں

مولانا مفتی محمود وزیرِ اعلیٰ بنے، تو ایک پُرانے ساتھی انہیں ملنے پشاور پہنچے۔ باتوں باتوں میں کھانے کا وقت آ گیا۔ گوشت کا اُس دن ناغہ تھا۔ مفتی صاحب کے ساتھی نے دل ہی دل میں سوچا آج کھانے کا لُطف آ جائے گا۔ کم از کم مُرغی تو ضرور ہی ہو گی۔ جب دسترخوان بچھا اور انہوں نے ایک ڈونگا اُٹھایا، تو اندر سے دال نکلی۔ بُرا سا منہ بنا کر اسے واپس رکھ دیا اور دوسرے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس میں سبزی پڑی ہُوئی تھی۔ بڑے بددل ہُوئے، لیکن چونکہ بھوک بڑے زور کی لگ رہی تھی، اس لیے مجبوراً کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد گپ شپ کا دور چلا۔ ان سے نہ رہا گیا، بولے: جناب کمال ہے مدرسوں میں دال چاٹتے عمر گزر گئی۔ اس کم بخت سے یہاں وزیرِ اعلیٰ کے گھر میں بھی پیچھا نہ چھوٹا۔ مفتی صاحب خوب ہنسے اور کہا: اللہ کے بندے! کیا کروں، قومی اسمبلی سے پندرہ سو روپے ماہانہ الاؤنس ملتا ہے، تم ہی بتاؤ اتنی رقم میں دال نہ کھاؤں تو اور کیا کروں۔ باقی اخراجات بھی تو آخر اسی رقم سے پُورے کرنے ہیں۔

www.tezpakistan.com

مولانا مفتی محمود مریض آدمی تھے۔ زیادہ تر پرہیزی غذا کھاتے۔ مہمانوں کی بھی عام طور پر سادہ دال گوشت اور سبزی سے تواضع کی جاتی۔ ان کے دستر خوان پر مرغ، پلاؤ یا مرغن کھانوں کی گنجائش نہیں تھی۔ پشاور کے مولانا امیر محمد خان ہیں جو زیادہ تر مولانا بجلی گھر کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، مفتی صاحب کے خاصے قریب تھے۔ ایک بار مفتی صاحب نے انہیں فون کیا "مولانا ذرا آجاؤ، کچھ کام ہے۔" مولانا امیر محمد خان نے جواب دیا: "حضرت، کھانے کا وقت ہو رہا ہے، میں کھانا کھا کر آؤں گا۔" مفتی صاحب نے دعوت دی کہ کھانا میرے ساتھ کھا لینا۔ اس پر مولانا امیر محمد خان نے فوراً ہنستے ہوئے کہا: "نہ بابا، میں مریض نہیں ہوں، آپ کے ہاں تو 'پرہیزانے' ہوتے ہیں، میں نہیں کھا سکتا، اپنے گھر سے ہی کھانا کھا کر آؤں گا۔" مفتی صاحب نے ان کی بات سن کر ایک طویل قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: "اچھا تو پھر تم ہی اپنے ساتھ کچھ لے آؤ، دونوں مل کر کھا لیں گے۔" مولانا امیر محمد خان نے گردن ہلائی اور بولے: "ہاں، یہ ہوئی نا بات۔ ٹھیک ہے میں آدھ گھنٹے میں آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا، پھر دکان سے اٹھ کر سلاطین ہوٹل پہنچے۔ اس ہوٹل کے تکے مشہور ہیں۔ وہاں سے انہوں نے تکے بنوائے اور گاڑی میں بیٹھ کر چیف منسٹر ہاؤس جا پہنچے۔

ایک بار کراچی سے حضرت بنوری پشاور تشریف لائے تو انہیں پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ حضرت بنوری چائے کے معاملے میں بڑے نفیس ذوق کے مالک تھے۔ بڑے اہتمام سے ان کے لیے چائے بنتی۔ حضرت بنوری مفتی صاحب کے ذاتی مہمان تھے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام انہی کی طرف سے ہوتا۔ ایک مرتبہ چائے پینے بیٹھے تو پتہ چلا گھر میں چینی ختم ہو گئی ہے۔ فون قریب رکھا تھا، ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا اور پشاور یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے چیئرمین مولانا محمد اشرف کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے مولانا محمد اشرف بولے تو مفتی صاحب نے ان سے کہا: "مولانا، آج چائے میرے ساتھ پیجیے۔ حضرت بنوری بھی بیٹھے ہیں۔ ابھی آجائیے اور ہاں اپنے ساتھ تھوڑی سی چینی بھی لیتے آئیے گا، ہمارے گھر میں ختم ہو گئی ہے۔" چنانچہ مولانا محمد اشرف اپنے گھر سے چینی لائے تو مفتی صاحب نے چائے پی اور اپنے مہمان حضرت بنوری کو بھی پلائی۔

✹ مجھے بد اخلاق بنانا چاہتے ہیں....

رمضان آیا تو اسلام آباد میں دستوری کمیٹی کے اجلاس بھی شروع ہو گئے۔ مولانا مفتی محمود اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ جس دن اجلاس ہوتا سحری کے بعد اسلام آباد روانہ ہو جاتے اور شام کو افطاری سے پہلے واپس پشاور پہنچ جاتے۔ دوست احباب عام طور پر ان کے انتظار میں بیٹھے ہوتے۔ سب اکٹھے مل کر افطاری کرتے۔ اس کے بعد کھانا کھایا جاتا اور مفتی صاحب ایک گھنٹے کے لیے سو جاتے۔ رات دس بجے تراویح شروع ہوتیں، تو مفتی صاحب اندر سے اٹھ کر باہر آجاتے اور سب کے ساتھ مل کر نماز ادا کرتے۔ تراویح پڑھانے کے لیے انہوں نے ملتان سے قاری محمد طاہر کو بطور خاص بلوایا تھا۔ کبھی کبھی ان کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل اور وزیر اطلاعات افضل خان بھی آکر جماعت میں شریک ہو جاتے۔ پہلے روز جب نماز کھڑی ہوئی تو قاری صاحب نے پہلی چار رکعتوں میں ڈھائی سیپارے ختم کیے۔ اس کے بعد چند منٹ کے لیے وقفہ ہوا۔ اس دوران جتنے فون آئے تھے، ان کے پیغام سن کر مفتی صاحب نے وہیں ضروری ہدایات جاری کیں۔ اس کے بعد دوبارہ نماز تراویح شروع ہو گئی جو رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے ختم ہوئی۔

ڈیرہ اسماعیل خان سے ان کے پرانے ساتھی خواجہ زاہد اور شیخ عزیز الرحمٰن بھی آئے ہوئے تھے۔ ایک رات نچلی منزل میں واقع اپنے کمرے میں سو رہے تھے کہ سحری کے وقت فون کی گھنٹی بجی۔ خواجہ زاہد نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے مفتی صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے ہنستے ہوئے اطلاع دی "زاہد! اللہ نے مجھے ایک اور لڑکا عطا کیا ہے۔ اس کے لیے کوئی اچھا سا نام تو تجویز کرو۔" خواجہ زاہد نے مبارک دی اور مذاق کیا، "وزیر زادہ یا وزیر اعلیٰ زادہ رکھ دیں۔" مفتی صاحب کی آواز آئی "اللہ کے بندے! یہ بھی کوئی نام ہے۔" خواجہ زاہد نے دوبارہ کہا "اچھا تو مجیب الرحمٰن رکھ دیں۔" اس پر دوسری طرف سے جواب ملا "کیوں خراب کرتے ہو؟ بنگلہ دیش والا مجیب الرحمٰن ہی کافی ہے..." اتنی دیر میں شیخ عزیز الرحمٰن بھی بیدار ہو گئے۔ انہوں نے بھی فون پر مفتی صاحب کو بیٹے کی پیدائش پر مبارک دی۔ مفتی صاحب نے کہا "میں تھوڑی دیر تک نیچے ہی آرہا ہوں....." خیر بعد میں بچے کا نام ضیاء الرحمٰن تجویز ہوا، لیکن یہ زیادہ عرصہ نہ جیا، چند ماہ بعد فوت ہو گیا۔

www.tezpakistan.com

ایک دلچسپ بات یہ ہُوئی کہ اسی ضیاء الرحمٰن کی پیدائش کا واقعہ تھا جسے بنیاد بنا کر یار لوگوں نے مشہور کر دیا کہ مفتی صاحب نے سوات کی کسی خاتون سے تیسری شادی کر لی ہے۔ چند برس بعد جب ان کے ہاں ایک اور بچّے کی ولادت ہُوئی، تو پہلے فوت ہو جانے والے بچّے کے نام پر اس کا نام ضیاء الرحمٰن رکھا گیا۔

یُوں تو مفتی صاحب اپنے سارے ہی بیٹوں سے بے حد پیار کرتے تھے، لیکن ان کا رویّہ اپنی اولاد کے ساتھ بزرگانہ سا رہا۔ ان کے جذبات کُھل کر ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ ضیاء الرحمٰن کے معاملے میں یہ بات نہیں تھی۔ اسے سب سے بڑھ کر چاہتے اور اپنی چاہت کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے۔ ایک بار ملتان جا رہے تھے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک بیٹا بھی الوداع کہنے آیا تھا۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے انہوں نے بڑی بے رُخی سے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ خواجہ زاہد ساتھ تھے ــــ گاڑی کچھ دُور نکل آئی، تو سوال کیے بغیر نہ رہ سکے۔ پُوچھا: حضرت! وہ بے چارہ کتنی محبت سے آپ کے قریب آ رہا تھا، آپ نے اُس کے ساتھ بالکل اجنبیوں کا سا سلوک کیا۔ مفتی صاحب بولے: "ایسا میں قصداً کرتا ہُوں۔ سیاست کے جھمیلے ایسے ہیں کہ مجھے گھر رہنا بہت کم نصیب ہوتا ہے، باپ کی روایتی شفقت کا مظاہرہ کروں گا تو محبت بڑھے گی اور نہ صرف یہ لوگ میری غیر حاضری کو شدت سے محسوس کریں گے، بلکہ مجھے بھی ان کی یاد ستایا کرے گی۔ اس بے رُخی سے دُکھ تو ہوتا ہے، لیکن محض وقتی اور عارضی طور پر۔ یُوں ان کی محبّت میری مصروفیات میں حارج نہیں ہوتی۔

خواجہ زاہد اور شیخ عزیز الرحمٰن سحری کھا کر فارغ ہُوئے ہی تھے کہ مفتی صاحب بھی اُن کے کمرے میں آ گئے اور آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ باتوں باتوں میں پارٹی کا ذکر چل نکلا۔ شیخ عزیز الرحمٰن نے ہنستے ہُوئے کہا: مفتی صاحب! اس وقت آپ اقتدار میں ہیں۔ اپنی جماعت کے لیے کسی مستقل فنڈ کا بندوبست کر دیں، تو ہماری ساری مالی پریشانیاں اور دلدّر دُور ہو جائیں۔ مفتی صاحب باتیں کرتے کرتے اچانک چُپ ہو گئے۔ چند لمحے شیخ عزیز الرحمٰن کی طرف دیکھا، پھر بولے: "شیخ صاحب! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ ایک دن مجھے بداخلاق بنا رہے تھے، آج بددیانتی کا سبق دے رہے ہیں!"

"بداخلاق بنا رہا تھا .... آپ کو ....؟" شیخ عزیز الرحمٰن نے زیرِ لب دُہرایا اور پھر یکبارگی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ یہ بداخلاق بنانے والی تہمت بھی خُوب تھی۔ تفصیل اس قصّے کی یوں تھی کہ ایک دن مفتی صاحب لان میں گھاس پر لوگوں میں گھِرے بیٹھے تھے اور ان کے دُکھڑے سُن اور درخواستیں پڑھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ جہاں مناسب سمجھتے، درخواستوں پر ضروری احکامات بھی جاری کرتے جا رہے تھے۔ اس دوران جو نیا مُلاقاتی یا سائل آتا، اُس سے باقاعدہ اُٹھ کر ہاتھ ملاتے اور پھر دوبارہ بیٹھ کر کام میں مصروف ہو جاتے۔ شیخ عزیز الرحمٰن بھی قریب ہی موجود تھے۔ انہیں یوں بار بار اُٹھ کر لوگوں سے ملتے دیکھا، تو چُپ نہ رہ سکے، بولے: حضرت! آپ نے پہلے ہی بھاری بھرکم جسم کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے، گھاس پر بیٹھے بیٹھے ہی مُلاقاتیوں سے ہاتھ ملا لیا کیجیے۔ مفتی صاحب نے پلٹ کر ان پر نظر ڈالی اور کہا: شیخ صاحب ـــ مجھے بداخلاق بنانا چاہتے ہیں۔ موٹاپے کی وجہ سے بار بار اُٹھ کر لوگوں سے ہاتھ ملانے میں تھوڑی سی تکلیف ہی ہوتی ہے نا، تو کیا ہُوا، اس ذرا سی تکلیف کے لیے مَیں اپنا اخلاق اور شرافت ہی چھوڑ دُوں؟

مفتی صاحب کا اشارہ اسی واقعے کی طرف تھا۔ شیخ عزیز الرحمٰن کے مُنہ سے جو فنڈز مہیا کرنے والی بات سُنی تو بے اختیار انہیں ان کی پُرانی کہی ہُوئی بات بھی یاد آ گئی۔ شیخ عزیز الرحمٰن نے جواب دینے کے لیے مُنہ کھولا، لیکن اسی لمحے فضا میں اللہ اکبر .... اللہ اکبر کی صدا بلند ہُوئی۔ یہ چیف منسٹر ہاؤس کی پولیس گارد کے انچارج تھانیدار کی آواز تھی جو اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرتے ہُوئے اس کے بندوں کو اس کی بندگی کے لیے بُلا رہی تھی۔ یہ تھانیدار پانچوں وقت بڑی باقاعدگی اور اہتمام سے اذان دیتا تھا۔ شیخ عزیز الرحمٰن، خواجہ زاہد اور مفتی صاحب اپنی باتیں بھُول کر مؤذن کی آواز کے زیر و بم میں کھو گئے۔

❋ پہلے بحث کرو، پھر تبادلہ ہوگا

چند دن پہلے ـــ حسبِ معمول لان میں گھاس پر بیٹھے تھے۔ اردگرد کئی ملنے والے عام شہری اور چند سرکاری افسر بھی موجود تھے۔ افطاری کا سامان سامنے رکھا تھا، لیکن ابھی چونکہ افطاری میں ذرا دیر تھی، اس لیے اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں، اچانک صدر دروازے سے گزر کر ایک

www.tezpakistan.com

موٹر تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ موٹر رکی، تو اس میں سے مولانا امیر محمد خاں عرف مولانا بجلی گھر برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ مولانا نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اُسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ آدمی اپنی مرضی کے خلاف مجبوراً ان کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ دونوں قریب پہنچے، تو مفتی صاحب نے مولانا بجلی گھر کے تیور دیکھ کر پشتو میں کہا: ھلکا خہ چل دے، مُوڈ دے ڈیر خراب دے؟ (کیا بات ہے، آج مُوڈ بڑا خراب ہے؟)

"مُوڈ خراب نہ ہو، تو کیا ہو؟" مولانا بجلی گھر نے کسی قدر اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں جواب دیا۔ مفتی صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور مولانا بجلی گھر اور ان کے ساتھی کو اپنے قریب بٹھا کر تفصیل معلوم کی، باتیں شروع ہوئیں، تو عقدہ کھُلا کہ مولانا بجلی گھر کا ساتھی اُن کا ایک دوست ہے اور ایبٹ آباد میں ایس ڈی او ہے۔ اسے ایبٹ آباد میں ملازمت کرتے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں اس کے تبادلے کا حکم ہوا تھا۔ یہ خوش تھا کہ چلو دیر سے سہی، آخر اُس کی سُنی تو گئی اور اپنے علاقے پشاور میں ٹرانسفر ہو گئی، لیکن جلد ہی اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ حکام بالا نے اس کی ٹرانسفر کا حکم منسوخ کر دیا۔ اس نے سراغ لگایا، تو پتہ چلا کہ جن حضرت کو ان کی جگہ پشاور سے ایبٹ آباد جانا تھا، وہ اسمبلی کی ایک خاتون ممبر کا عزیز ہے اور اس نے سفارش کر کے تبادلے کا حکم منسوخ کرا دیا ہے۔ مولانا بجلی گھر اس بات پر برہم تھے کہ خاتون ممبر اسمبلی نے سفارش کرا کر اپنے عزیز کا تبادلہ کیوں رُکوا لیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ اپنے عزیز کی سفارش کر سکتی ہیں، تو پھر آپ میرے دوست کی سفارش کریں اور اس کے فوری تبادلے کا حکم جاری کریں۔

مولانا بجلی گھر کی باتیں سُن کر مفتی صاحب نے زور سے گردن ہلائی اور ہنستے ہوئے کہنے لگے: "آپ جن صاحب کی بات کر رہے ہیں، ان کی سفارش خاتون ممبر کے علاوہ اکوڑہ خٹک کے مولانا عبدالحق صاحب نے بھی کی ہے۔ اب یوں کرتے ہیں کہ آپ غصہ تھوک دیں، یہاں افطاری کریں، نماز پڑھیں، پھر تراویح پڑھیں گے۔ مولانا عبدالحق صاحب نے آنا ہے۔ اتنی دیر میں وہ بھی پہنچ جائیں گے۔ ان کے سامنے مسئلہ پیش کریں گے، پھر بحث ہو گی۔ آپ اپنے دوست کے تبادلے کے حق میں دلائل دیجیے گا۔ مولانا عبدالحق صاحب اپنے دلائل دیں گے۔ اس مباحثے میں جو جیت جائے اور مجھے اپنے دلائل سے قائل کر لے گا، مَیں اُس کے آدمی کے تبادلے کا حکم جاری کر دوں گا۔

مولانا بجلی گھر نے ہنستے ہوئے یہ چیلنج قبول کر لیا اور اپنے ایس ڈی او دوست سے کہا کہ وہ گھر چلا جائے۔ یہاں سے واپسی اب ذرا دیر میں ہو گی۔ دوست بے چارہ سرکاری افسر پہلے ہی وزیرِ اعلیٰ کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا، لیکن مولانا بجلی گھر اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے تھے۔ گھر جانے کی اجازت ملی، تو وہ فوراً اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔

تراویح ختم ہوئیں، تو مولانا عبدالحق بھی تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب نے ان کے سامنے ایس ڈی او کا معاملہ رکھا اور ساتھ ہی کہا کہ مولانا بجلی گھر اس سلسلے میں آپ سے باقاعدہ بحث کریں گے۔ مولانا عبدالحق ہنس پڑے اور کہا: نہ بابا، مَیں ان سے بحث نہیں کرنے کا۔ مَیں ان کے مقابلے میں اپنی سفارش سے دستبردار ہوتا ہوں۔ آپ ان کے آدمی کے حق میں ہی فیصلہ کر دیجیے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مفتی صاحب نہ مانے اور کہا: اس طرح نہیں مولانا، اس مسئلے پر باقاعدہ بحث ہو گی، مَیں آپ دونوں کے دلائل سُنوں گا، پھر ان کی روشنی میں کوئی فیصلہ ہو گا۔ . . . خیر یہ بحث ہوئی۔ مولانا بجلی گھر جیت گئے اور یوں چند دنوں کے اندر اندر ان کا ایس ڈی او دوست ایبٹ آباد سے تبدیل ہو کر پشاور آ گیا۔

عدالتی انکوائری ہو گی، عدالتی انکوائری نہیں ہو گی

انہی دنوں لتمبر میں دن دہاڑے سڑک پر ڈاکہ پڑا۔ لتمبر، کوہاٹ کے ساتھ واقع ایک مشہور گاؤں ہے۔ HIGHWAY ROBBERY پولیس کے نزدیک بڑی سنسنی خیز شے ہوتی ہے۔ اس طرح کی واردات میں جانی یا مالی نقصان خواہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، اس سے پولیس کی بدنامی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈاکے کی رپورٹ درج ہوئی، تو پولیس نے کچھ آدمیوں کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا اور انہیں مارا پیٹا بھی۔ ان میں سے ایک آدمی کا تعلق جمعیت سے تھا۔ کوہاٹ کے نعمت اللہ نے مفتی صاحب سے اس کی سفارش کی اور کہا کہ ہمارا ایک آدمی بے گناہ دھر لیا گیا ہے۔ مفتی صاحب اس کی بات سن کر خاموش رہے۔ کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ پشاور آیا اور مفتی صاحب سے اصرار کیا کہ ہمارا آدمی بے گناہ ہے۔

www.tezpakistan.com

اس بار بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اسے ناکام ونامراد لوٹنا پڑا۔ اس چکر میں کئی دن گزر گئے، وہ آتا اور مفتی صاحب اس کی بات سن کر ٹال جاتے۔ ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، تو وہ مفتی صاحب کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہا: میں قسم کھانے کو تیار ہوں، میری بات کا یقین کیجیے حلفیہ کہتا ہوں کہ ہمارا آدمی بے گناہ ہے، پولیس نے خوامخواہ اُسے دھر لیا ہے۔

"پھر؟" مفتی صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"پھر... "نعمت اللہ بولا، "پھر کیا... آپ انصاف کریں اور اسے رہا کریں۔"

"اللہ کے بندے،" مفتی صاحب نے کہنا شروع کیا، "اس طرح وہ رہا نہیں ہو گا۔ انتظامیہ نے ایکشن لے لیا ہے۔ ہم یوں کرتے ہیں کہ اس سارے واقعے کی عدالتی تحقیقات کرا لیتے ہیں۔" اگلے دن انہوں نے اس کے لیے حکم جاری کر دیا۔

عدالتی تحقیقات کرانے کا حکم جاری ہوا، تو کوہاٹ کے دو متعلقہ افسران بہت گھبرائے۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ نعمت اللہ کا آدمی فی الواقع بے گناہ پکڑا گیا ہے۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھے کہ عدالتی تحقیقات اور انکوائری کا سلسلہ چل نکلا، تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی اور نہ صرف اس شخص کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی بلکہ اور کئی انتظامی خامیاں اور کمزوریاں بھی منظرِ عام پر آجائیں گی اور ہم سب کو نکو بننا پڑے گا، چنانچہ انہوں نے بیوروکریسی کے مخصوص انداز میں سوچ سوچ کر ایک کہانی گھڑی اور منصوبہ بنایا کہ کچھ ایسا چکر چلانا چاہیئے کہ وزیرِ اعلیٰ کو اصل حقیقت کا کچھ پتہ ہی نہ چل سکے۔ سیدھا سادا مولوی آدمی ہے اتنی موشگافیوں اور ہیر پھیر کا اُسے کیا علم۔

آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ایک دن وہ مفتی صاحب سے ملنے چیف منسٹر ہاؤس پہنچ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد آخر اصل موضوع پر گفتگو شروع ہو گئی۔ انہوں نے کہا: مفتی صاحب، آپ نے ڈاکے کی واردات کی عدالتی انکوائری کرانے کا حکم دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن عرض یہ ہے کہ اس طرح کی انکوائری سے خوامخواہ کئی نئے مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ انتظامیہ پہلے ہی خاصی بدنام ہے، لوگ اور بھی زیادہ اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ غرض انہوں نے عدالتی انکوائری کے خلاف طویل تقریر کی۔ مفتی صاحب خاموش بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہے۔ وہ خوش کہ بات بن گئی۔ جب انہوں نے اپنی بات مکمل کر لی، تو اس کے جواب میں مفتی صاحب نے صرف ایک فقرہ کہا: ٹھیک ہے۔ اگر آپ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، تو پھر ہم اس واقعے کی عدالتی انکوائری نہیں کراتے! — افسروں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... ایں یہ 'مولوی' کیا کہہ رہا ہے؟ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد خاموشی سے وہاں سے کھسک گئے۔ مفتی صاحب نے یہ بات کہہ کر ان کی غلط فہمی دُور کر دی تھی کہ اس 'مولوی' کو اندھیرے میں رکھ کر بھی کوئی کام کرایا جا سکتا ہے۔

✺ **کھر صاحب! تجربے کی بات ہے...**

ایک بار ڈیرہ اسماعیل خاں کے مولانا عبدالقدوس کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ملتان سے فون آیا۔ وہاں کی مقامی جمعیت کے دفتر سے کوئی صاحب بول رہے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ ضلع مظفر گڑھ کے ساتھی مولانا لقمان گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان کی رہائی کا بندوبست کیجیے۔ کھر ان دنوں پنجاب کا گورنر تھا۔ مفتی صاحب نے کھانے کے بعد اپنے سیکرٹری کو بلایا اور کہا کہ کھر سے فون ملاؤ۔ فون پر رابطہ قائم ہوا، تو مفتی صاحب بولے: کھر صاحب! یہ بتائیے کہ آدمی زیادہ خوشحال کیسے ہوتا ہے؟ کھر نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کیا: آپ بتائیے۔ اس پر مفتی صاحب بولے: اللہ کے بندے، تجربے کی بات ہے۔ انسان کے دشمن زیادہ ہوں، تو دل پریشان ہوتا ہے اور اگر دوست زیادہ ہوں، تو وہ مطمئن اور خوش ہوتا ہے۔ دیکھیے! آپ کی اپنی پارٹی میں کئی لوگ آپ کے خلاف ہیں۔ پارٹی کے باہر بھی آپ کی مخالفت ہے۔ آپ نے ہمارا ایک آدمی ناحق جیل میں ٹھونس دیا۔ اس طرزِ عمل سے اگر ہمارے آدمی بھی آپ کے مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے، تو کیا ہو گا؟ ناحق آپ کے لیے پریشانیاں بڑھیں گی۔ دانشمندی کا تقاضا ہے کہ اپنے لیے کم سے کم پریشانیاں پیدا کیجیے۔

کھر ہنسا اور کہا: مولانا لقمان کی تقریر کا ٹیپ میرے پاس پڑا ہے۔ میں آپ کو سنوائے دیتا ہوں۔ آپ خود فیصلہ کر لیجیے گا۔ مفتی صاحب نے کہا: اللہ کے بندے، یہی ہو گا کہ اس نے کوئی گالی دی ہو گی، بُرا بھلا کہا ہو گا اور سیاست میں تو یہ سب چلتا ہے۔ آپ سیاسی لیڈر ہیں، اس طرح کی باتیں برداشت کرنا سیکھیے۔

www.tezpakistan.com

گفتگو ختم ہوئی، تو گھر، مولانا لقمان کو رہا کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔

غریب ضرور ہوں، بے مروّت نہیں ہوں....

وزیرِ اعلیٰ بننے کے بعد پہلی مرتبہ جب اپنے آبائی ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچے، تو پولیس کو اپنے ساتھ ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ جس طرح وزارت میں آنے سے پہلے لوگوں کی دکانوں پر بیٹھ کر ان سے آزادانہ گپ شپ لگاتے تھے، اس دن بھی اسی طرح سب دوستوں سے جا کر باری باری ملے، گپ شپ لگائی اور ان سے چائے پی۔ لوگ درخواستیں لے کر اکٹھے ہو گئے، تو ہنستے ہوئے کہنے لگے: اللہ کے بندو! میں یہاں وزیرِ اعلیٰ نہیں، مفتی محمود بن کر آیا ہوں۔ کبھی تو ذرا آرام سے بیٹھ کر کسی کے ساتھ سکون سے دو چار باتیں کر لینے دیا کرو۔

درخواستوں پر دستخط کر رہے تھے کہ ایک ساتھی بول اٹھا: حضرت! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ چھوٹے اور معمولی معمولی کاموں کے لیے لوگوں کی سفارشیں کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس پر مفتی صاحب ہاتھ روک کر بولے: اللہ کے بندے! ہمارا علاقہ بڑا پسماندہ ہے۔ ہم خود بہت غریب اور چھوٹے لوگ ہیں۔ ہماری خواہشیں اور آرزوئیں بھی بہت چھوٹی ہیں۔ ہمارے بھائیوں کے لیے یہی بہت ہے کہ کسی کا بیٹا کہیں ماسٹر ہو گیا یا کوئی سپاہی بھرتی ہو گیا۔ ہمیں زیادہ کا لالچ نہیں۔

شام کے وقت اپنے گاؤں عبدالخیل جانے لگے، تو ڈپٹی سی جو سارا دن ان کے ساتھ ساتھ رہا تھا، آگے بڑھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: اچھا جناب! مجھے اجازت دیجیے۔ آپ اپنے گھر جا رہے ہیں۔ میں اپنے گھر جاتا ہوں۔ مفتی صاحب نے سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگے: اللہ کے بندے! میں یقیناً غریب ہوں، لیکن اتنا بھی غریب نہیں کہ عبدالخیل میں تمہیں ایک پیالی چائے بھی نہ پلا سکوں۔ اب تک تم نے یہاں میرے ساتھ جتنا وقت گزارا اور تقریبات میں شرکت کی، وہ تمہاری ڈیوٹی تھی، اب میرے ساتھ میرے مہمان بن کر چلو۔ میرے گھر میں تمہیں یہاں کا سا آرام اور آسائش تو نہیں ملے گی، لیکن خلوص کے ساتھ تمہیں ایک پیالی چائے ضرور پلا سکتا ہوں۔ رات اگر وہیں رُکنا چاہو، تو ٹھہرنے کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ میں اتنا غریب نہیں، نہ اتنا بے مروّت ہوں۔

یہ تو میرے حج کی قبولیت کی نشانی ہے....

مفتی صاحب کو شوگر اور پیر کی تکلیف کے علاوہ بھی اور کئی طرح کے امراض نے گھیر رکھا تھا۔ دواؤں سے بھرا ایک بریف کیس ہر وقت ان کے ساتھ رہتا، لیکن دوا وقت پر شاذ و نادر ہی کھاتے۔ ساتھیوں میں سے اگر کوئی کہتا کہ مفتی صاحب! اپنا علاج ڈھنگ سے کرالیں، تو جواب دیتے: اللہ کے بندے! میں تو ان دواؤں سے دفع وقتی کرتا ہوں۔ ڈھنگ سے علاج کرانے کا وقت اور فرصت کسے میسر ہے!

پہلی بار بائیں پیر کی چھنگلیا میں تکلیف شروع ہوئی تھی۔ انگلیوں کے درمیان زخم سا ہو جاتا۔ چار پانچ ماہ کے علاج سے یہ زخم ٹھیک ہو گیا۔ دوسرے سال حج پر گئے، تو انگلی ٹھیک تھی، لیکن داہنے پیر کے انگوٹھے میں سامنے کے رُخ ایک لمبا زخم نمودار ہو چکا تھا۔ اکثر کہا کرتے، علاج سے وقتی طور پر زخم ٹھیک ہو جاتا ہے، لیکن جب کبھی حج سے لوٹتا ہوں، پیر میں کوئی نہ کوئی زخم ضرور ہوتا ہے۔ طواف کے دوران تو خاص طور پر یہ زخم زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ میں نے بھی اب سمجھ لیا ہے کہ میرا زخمی پاؤں میرے حج کی قبولیت کی نشانی ہے۔ حج کے لیے روانگی کے دن سے انتظار رہنے لگتا ہے کہ کب پاؤں کی کوئی انگلی زخمی ہوتی ہے اور میرا حج بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت پاتا ہے۔

ایک بار وزن زیادہ بڑھ گیا، تو دل کی تکلیف شروع ہو گئی۔ کئی دنوں تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ڈاکٹروں نے کہا جب تک وزن کم نہیں کریں گے، چھٹی نہیں ملے گی: چنانچہ انہیں مجبوراً اپنا وزن کم کرنے کا جتن کرنا پڑا۔ اناج ترک کر کے کچے پھلوں اور سبزیوں کا استعمال شروع کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وزن تیزی سے گھٹنے لگا۔ ہسپتال میں داخلے کے وقت وزن ۲۳۵ پونڈ تھا، لیکن جب وہاں سے چھٹی ملی، اس دن ان کا وزن گھٹ کر ۲۰۰ پونڈ ہو چکا تھا۔

وزارتِ اعلیٰ کے دنوں کا ذکر ہے، ایک مرتبہ مولانا بجلی گھر نے باتوں باتوں میں مفتی صاحب سے کہا: حضرت! علاج کے لیے یورپ کے کسی ملک میں چلے جائیے۔ شاید وہاں کے معالج شوگر وغیرہ کو ختم کرنے کی کوئی تدبیر کر سکیں۔ مولانا مفتی محمود نے ان کی بات سنی، تو آہستہ سے سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں بولے: اصلی معالج تو خدا ہے اور وہ یہاں بھی موجود ہے۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ان

www.tezpakistan.com

لوگوں کے ملک کا رخ کروں جنہیں ہم خبیث اور پلید کہتے ہیں۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ شروع ہوئی، تو مفتی صاحب نے ڈیرہ اسماعیل خاں کے ایک نوجوان وکیل چودھری محمد شریف کو اپنا پرسنل سیکرٹری بنا لیا۔ چودھری محمد شریف، مفتی صاحب کے ڈرائیور اور ڈسپنسر کے فرائض بھی انجام دیتے۔ ان دنوں مفتی صاحب کے جسم میں شوگر کی مقدار بڑھنے لگی تھی اور معاملہ گولیوں سے کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کے لیے انسولین کے انجکشن تجویز کیے تھے اور ہدایت کی تھی کہ دن میں ساٹھ یونٹ صبح، دوپہر، شام ۲۰، ۲۰ یونٹ کر کے لگایا کریں۔ انجکشن لگانے کے لیے تینوں وقت ایک کمپاؤنڈر کی ضرورت پڑتی۔ یہ دور بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ مفتی صاحب اتحاد کے صدر تھے۔ ایک جگہ ٹکنا نصیب نہ ہوتا۔ ہمیشہ دوروں پر رہتے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ پھر وقت بے وقت کمپاؤنڈر کا دستیاب ہونا بھی مشکل تھا؛ چنانچہ اس مشکل کا حل مفتی صاحب نے یہ نکالا کہ ایک دن چودھری شریف سے کہنے لگے: "اللہ کے بندے! تم خود ہی انجکشن لگانا شروع کر دو۔" چودھری شریف نے کہا: "مجھے سرنج پکڑنا نہیں آتی۔ آپ کہتے ہیں انجکشن لگاؤ۔ کیسے لگاؤں؟" مفتی صاحب مسکرائے "سیکھ جاؤ گے۔ چلو بسم اللہ کرو۔ یہ بازو حاضر ہے۔ اس پر مشق شروع کر دو۔" چنانچہ اس وقت سے چودھری شریف نے انہیں انسولین لگانا شروع کر دی۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں مفتی صاحب کو اینٹی بائیوٹک بھی لگانی پڑگئیں، کیونکہ ان کے پاؤں میں زخم بھی تھا۔ پہلے دن جب انہوں نے مفتی صاحب کو اینٹی بائیوٹک کا انجکشن لگایا، تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہ انجکشن کیسے لگے گا۔ اس انجکشن کا محلول خاصا گاڑھا ہوتا ہے اور اس کے لیے نسبتاً ہوئی سرنج اور سوئی استعمال کرنی پڑتی ہے تاکہ یہ دوا آسانی سے گزر سکے۔ چودھری شریف کو اس کا تجربہ نہیں تھا۔ انہوں نے انسولین لگانے والی عام اور چھوٹی سرنج ہی اس دوا سے بھری۔ جب مفتی صاحب کے بازو میں سوئی چبھو کر سرنج کو دبایا، تو سوئی تو بازو ہی میں رہ گئی اور سرنج دوا سمیت چودھری صاحب کے ہاتھ میں آ گئی۔ مفتی صاحب پکارے: "اللہ کے بندے! یہ کیا کر دیا۔۔۔" بعد میں اس سے سیپٹک ہو گیا، لیکن چونکہ گولیوں کی صورت میں بھی خاصی اینٹی بائیوٹک دوائیں کھا رہے تھے، اس لیے کچھ عرصے بعد یہ زخم خود بخود ٹھیک ہو گیا۔

مسٹر بھٹو نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط وزارتوں کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا؛ چنانچہ وہ شروع دن ہی سے ان کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ مرکز کی طرف سے قدم قدم پر کام میں رکاوٹ ڈال جاتی۔ اس کے باوجود مفتی صاحب مرکز سے تعاون کی پالیسی پر گامزن رہے اور جیسے تیسے کر کے کام چلاتے رہے۔ جلد ہی مسٹر بھٹو نے بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی مخلوط وزارت توڑ دی اور صوبہ سرحد کے گورنر ارباب سکندر خاں خلیل کو برطرف کر دیا۔ یہ اقدام اس معاہدے کے سراسر خلاف تھا جس پر ۲۷ اپریل ۷۲ء کو پنڈی پریذیڈنسی میں نیپ، جمعیت اور بھٹو صاحب نے دستخط کیے تھے۔ مولانا مفتی محمود نے اس غیر جمہوری اقدام پر احتجاج کیا اور وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ مسٹر بھٹو نے انہیں منانے کی بہت کوشش کی، طرح طرح کے لالچ بھی دیے، "آپ تو ہمارے امام ہیں۔ آپ سے کوئی لڑائی نہیں جیسا جی چاہے حکومت کیجیے۔ کوئی باز پرس نہیں ہو گی،" لیکن مفتی صاحب نہ مانے۔ ان کا جواب تھا "پہلے ہماری اس شکایت کا ازالہ کیجیے، جو استعفے کا باعث بنی ہے۔ اگر اس کے لیے آپ تیار نہیں ہیں، تو پھر میں بھی اپنا استعفیٰ واپس لینے کے لیے تیار نہیں۔" وزارت چھوڑنے کی خبر ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچی، تو خواجہ زاہد نے فون کیا: "ہیلو مفتی صاحب مبارک ہو!" جواب میں مفتی صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولے "آپ کو بھی مبارک ہو۔۔۔" وزیرِ اعلیٰ بننے پر انہیں مبارکباد کے اتنے پیغامات اور تار موصول نہیں ہوئے تھے جتنے مفتی صاحب کو وزارت چھوڑنے کے بعد موصول ہوئے۔

پُراسرار آدمی، پُراسرار اشارے

وزارتِ اعلیٰ سے الگ ہونے کے بعد مولانا مفتی محمود نے بڑے بھرپور انداز میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے آئین کی تشکیل اور قادیانی مسئلے کے محاذ پر اسمبلی کے اندر اور باہر تاریخی جنگ لڑی۔ سی آئی ڈی کے کارندے دن رات سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے رہتے اور انہیں ہر طرح سے ہراساں کرنے کی کوشش کی جاتی، لیکن مولانا مفتی محمود کے عزم اور حوصلے کو کوئی چیز کم نہ کر سکی۔

ایک بار مولانا عبید اللہ انور کی درخواست پر لاہور تشریف لائے اور ان کی مسجد واقع شیرانوالہ گیٹ میں دورہ حدیث شروع کیا۔ رمضان

www.tezpakistan.com

کے دن تھے۔ گرمی زوروں پر تھی۔ مفتی صاحب کے لیے مسجد کے ایک کونے میں پنکھا لگا دیا گیا تھا جہاں وہ نمازِ تراویح سے پہلے سنتیں اور نوافل
ادا کرتے۔ مولانا علم الدین شیرانی بھی ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے اور مسجد شیرانوالہ ہی میں نمازِ تراویح ادا کرتے۔ مولانا علم الدین شیرانی کا
تعلق قبائلی علاقے سے تھا اور مفتی صاحب سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک رات وہ نماز سے پہلے حوض پر بیٹھے وضو کر رہے تھے کہ اچانک
دو آدمیوں پر نظر پڑی۔ دونوں نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کی نقل و حرکت بڑی پُراسرار نظر آتی تھی۔ مولانا علم الدین شیرانی وضو کرتے
کرتے رُک گئے اور کنکھیوں سے ان کی حرکات کا جائزہ لینے لگے۔ ایک آدمی نے آہستہ سے کچھ اشارہ کیا۔ اس پر دوسرے ساتھی نے شہادت
کی انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔ مولانا شیرانی نے اس طرف نظر اٹھائی، تو دیکھا مولانا مفتی محمود اکیلے کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ ان کا دل
دھک سے رہ گیا۔ معاً خیال گزرا یہ لوگ کسی اچھی نیت سے نہیں آئے۔ کہیں مفتی صاحب کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ اس خیال کا
آنا تھا کہ پریشانی نے آن گھیرا۔ جوں توں کر کے نماز تو مکمل کر لی لیکن اس دوران خیال برابر مفتی صاحب کی طرف لگا رہا۔ نماز ختم ہوئی تو لپک کر
مفتی صاحب کے پاس پہنچے۔ مفتی صاحب اس انتظار میں ایک طرف کھڑے تھے کہ مولانا عبیداللہ انور اپنے مریدوں سے مل کر فارغ ہوں تو
وہ ان کے ساتھ ہی مسجد سے باہر نکلیں۔ مولانا شیرانی نے حوض پر پیش آنے والے واقعے کی تفصیل سنائی اور اپنے خدشات سے آگاہ کیا، تو مولانا
مفتی محمود بڑے زور سے ہنس پڑے اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے: "اللہ کے بندے! وہ سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ میں روزانہ
پنکھے والی جگہ پر نماز ادا کرتا ہوں، لیکن آج میں نے وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف نماز پڑھی۔ وہ مجھے اپنی مخصوص جگہ پر نہ پا کر پریشان ہو گئے
کہ یہ مولوی کدھر غائب ہو گیا۔ ان میں سے ایک بالکل نیا آدمی ہے۔ آج ہی ڈیوٹی پر آیا ہے۔ دوسرا ساتھی اسے اشارے سے بتا رہا تھا کہ وہ رہا
مفتی۔ اس پر نظر رکھنی ہے۔ جب تک مولانا عبیداللہ انور اپنے مریدوں سے فارغ ہو کر ان کے ساتھ نہیں آملے، مولانا مفتی محمود اور مولانا شیرانی
کھڑے اس واقعے کو یاد کر کے ہنستے رہے۔

ایک حقیر سا تحفہ ہے ـــ قبول فرمایئے

مولانا مفتی محمود کسی طرح کے حفاظتی اقدامات یا اپنے ساتھ کوئی مسلح محافظ رکھنے کے حق میں نہیں تھے، لیکن پے درپے جب ان پر تین چار
قاتلانہ حملے ہوئے، تو ساتھیوں اور ورکروں نے مجبور کیا کہ اپنے ساتھ مسلح محافظ رکھیں۔ مفتی صاحب نے ان کے کہنے اور مجبور کرنے پر ایم۔ جی تھری
کے لائسنس کے لیے درخواست دے دی۔ قومی اسمبلی کا ممبر ہونے کے ناطے انہیں ایم۔ جی تھری رکھنے کا استحقاق حاصل تھا۔ امید تھی لائسنس
بھی جلد مل جائے گا، لیکن درخواست دیے کئی دن گزر گئے، حکومت کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ مفتی صاحب بھی خاموش رہے کہ ٹھیک
ہے لائسنس بننا ہے، تو بن جائے گا؛ ورنہ ایم۔ جی تھری کی کیا ضرورت۔ اللہ مالک ہے۔
ایک بار پنڈی میں مقیم تھے کہ پرائم منسٹر ہاؤس سے بلاوا آیا، وزیرِ اعظم ملنا چاہتے ہیں۔ مولانا مفتی محمود قومی اتحاد کے صدر تھے۔ انہوں نے
جواب دیا، میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں گا، اگر انہوں نے رائے دی، تو ملاقات کروں گا؛ ورنہ مجبوری ہے۔ ساتھیوں سے مشورہ کیا، تو
انہوں نے کہا، ملاقات میں کیا حرج ہے۔ پرائم منسٹر ہاؤس چلے جایئے۔ دیکھیں مسٹر بھٹو کیا کہتے ہیں۔
مفتی صاحب شام کو پرائم منسٹر ہاؤس پہنچے۔ مسٹر بھٹو بڑی گرم جوشی سے ملے اور دیر تک مزاج اور صحت کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر
ایکا ایکی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ چند سیکنڈ بعد واپس آئے، تو دونوں ہاتھوں پر ایک لمبا سا ڈبہ اٹھا رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے مفتی
صاحب کے عین سامنے آ کر رُک گئے اور تقریباً رکوع میں جھکتے ہوئے یہ ڈبہ ان کے سامنے پیش کیا اور بولے: "قبول فرمایئے۔"
مولانا مفتی محمود اس ڈرامائی انداز پر کچھ پریشان سے ہو گئے۔ حیرت سے مسٹر بھٹو کا چہرہ تکنے لگے اور کہا: "جناب! یہ کیا ہے۔ . . . کیا
قبول کروں؟"
مسٹر بھٹو بولے: "ایم۔ جی تھری۔ آپ کے لیے۔ میری طرف سے ایک حقیر سا تحفہ!"
مولانا مفتی محمود چونک کر چند قدم پیچھے ہٹ گئے اور بولے: "جی نہیں۔ میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔"
"حیرت ہے!" مسٹر بھٹو نے کہا۔ "ایک مسلمان عالمِ دین ہو کر ایک بھائی کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں!"

www.tezpakistan.com

مولانا مفتی محمود کی سنجیدگی بدستور قائم تھی۔ بولے: "جناب! تحفہ کیسا۔ کہاں کا بھائی۔ مَیں نے اس کے لائسنس کے لیے آپ کی حکومت کو باقاعدہ درخواست دے رکھی ہے۔ تحفہ تو وہ ہوتا ہے جو بے طلب کسی کو عطا کیا جائے۔ یہ تو نہیں۔ مَیں معذرت خواہ ہوں۔"

مسٹر بھٹو نے بہت اصرار کیا کہ مولانا مفتی محمود کسی طرح ان کے ہاتھوں سے ایم۔ جی تھری کا ڈبہ لے لیں، مگر مفتی صاحب ان کا "تحفہ" قبول کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔

دو ماہ بعد ایم۔ جی تھری کا لائسنس مفتی محمود کے گھر کے پتے پر بھیج دیا گیا۔ اس دوران اسلحے کی قیمتیں خاصی بڑھ گئی تھیں۔ مفتی صاحب نے جب لائسنس کے لیے درخواست دی تھی، اس وقت ایم۔ جی تھری کی قیمت چوبیس سو روپے تھی، جب لائسنس ملا، تو چھ ہزار ہو چکی تھی۔ لائسنس ملنے کے بعد انہیں مجبوراً ڈاہ فیکٹری سے اسی قیمت پر خریدنی پڑی۔

کیا ہنگامہ ہے یہ — چلو سب لوگ

۱۹۷۷ء کے انتخابات کا مرحلہ آیا، تو مولانا مفتی محمود نے قومی اتحاد کے صدر کی حیثیت سے اس میں حصہ لیا۔ اس بار وہ ڈیرہ اسماعیل خاں کے علاوہ ڈیرہ غازی خان کے حلقے سے بھی قومی اسمبلی کے امیدوار تھے۔ ۱۹۷۰ء میں مسٹر بھٹو نے ڈیرہ اسماعیل خاں کی سیٹ پر ان کے ہاتھوں شرمناک شکست کھائی تھی۔ انہیں اس کا بدلہ چکانا تھا۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے ایک ایسے صنعت کار کو ٹکٹ دیا جس نے مفتی صاحب کے خلاف الیکشن میں ایک کروڑ روپے خرچ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

مولانا مفتی محمود نے الیکشن کے دن ڈیرہ اسماعیل خاں میں میاں محمد ظہور کی بیٹھک میں بیٹھ کر اپنی مہم کو کنٹرول کیا۔ بیٹھک میں فون موجود تھا۔ وقتاً فوقتاً فون کر کے مختلف پولنگ سٹیشنوں کی صورتِ حال معلوم کر لیتے۔ دوپہر کے قریب ایک زنانہ پولنگ سٹیشن سے اطلاع ملی کہ یہاں بوگس ووٹ بھگتائے جا رہے ہیں اور ہماری خاتون ووٹروں کو ووٹ ڈالنے سے روکا جا رہا ہے۔ مولانا مفتی محمود صورتِ حال معلوم کرنے خود وہاں پہنچ گئے۔ ان کے نوجوان کارکن سخت مشتعل تھے اور مرنے مارنے پر تُلے ہوئے تھے۔ سب کے سب مسلح بھی تھے۔ مفتی صاحب نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے انہیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا اور کہا: تم لوگ باہر ٹھہرو۔ مَیں اندر جا کر دیکھتا ہوں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کوئی قدم اٹھائیں گے۔ مفتی صاحب تنہا ایس پی کے ساتھ اندر گئے۔ جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ ہیرا پھیری کرنے اور بوگس ووٹ بھگتانے کا الزام کچھ غلط نہیں، لیکن سوچا اگر مَیں نے ان لوگوں کے الزام کی تصدیق یا تائید کر دی، تو بڑا خون خرابہ ہو گا اور کئی قیمتی جانیں ضائع ہو جائیں گی؛ چنانچہ انہوں نے کمال ہوشیاری سے کام لیا اور پولنگ سٹیشن سے باہر آتے ہی اپنے کارکنوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی: تم لوگوں نے یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ مَیں خود دیکھ کر آ رہا ہوں کوئی دھاندلی وغیرہ نہیں ہو رہی۔ چلو سب لوگ۔ اپنا اپنا کام کرو۔ یہاں شور مچانے یا ہنگامہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایس پی جو اُن کے ساتھ ساتھ تھا اور دھاندلی کا چشم دید گواہ بھی تھا، مفتی صاحب کی بات سُن کر حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ یہ کیسا سیاست دان ہے! مخالف امیدوار کی دھاندلیوں پر اپنے کارکنوں کو ہنگامے پر اُکسانے یا دھاندلی کا جواب دھاندلی سے دینے کے بجائے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر کے وہاں سے بھگا رہا ہے۔ ایک سیاستدان کا یہ طرزِ عمل اور کردار کا یہ رُخ اس کے لیے اچنبھے سے کم نہ تھا۔ چند لمحے پہلے وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ اگر مفتی صاحب نے دھاندلی سے متعلق ذرا سا اشارہ بھی کر دیا، تو خیر نہیں۔ یہاں بڑا زبردست قسم کا فساد ہو گا اور میرے پاس اتنی نفری نہیں کہ اس پر قابو پا سکوں۔ کیا بنے گا؟ مفتی صاحب کی بات سن کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور سر جھکا کر دوسری طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہجوم چھٹا، تو مفتی صاحب بھی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ڈیرہ اسماعیل خاں میں جن مقامات پر فون موجود تھے، وہاں سے دوپہر ہی کو مفتی صاحب کی کامیابی کی خبریں آنی شروع ہو گئیں۔ نتائج مرتب کر کے آگے بھجوانے والے عملے نے حکومت کی ہدایت پر مفتی صاحب کے مخالف امیدوار کو جتوانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن مفتی صاحب کے کارکن مستعد اور چوکس تھے۔ انہوں نے ان کی ہر چال ناکام بنا دی۔ حکومت کو رات گئے مجبوراً خبروں میں مفتی صاحب کی کامیابی کا اعلان کرنا پڑا۔ ڈیرہ غازی خاں کے حلقے میں بھی کامیابی نے مفتی صاحب کے قدم چُومے۔

www.tezpakistan.com

تین دن بعد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تھے، لیکن مولانا مفتی محمود اور ان کے ساتھیوں نے قومی اسمبلی کے انتخابات میں حکومت کی طرف سے دھاندلیوں کے خلاف بطور احتجاج ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ عوام مسٹر بھٹو کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس احتجاج نے ایک زبردست طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ مسٹر بھٹو نے مختلف حیلے بہانوں سے اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش کی، مگر بے سُود۔ ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کی صبح طلوع ہوئی، تو ان کے اقتدار کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا۔

❁ وَلے خیال مکوہ زہ بہ نہ مرم

۸ر اکتوبر ۸۰ء کو عصر کے قریب ڈیرہ اسماعیل خاں سے آنے والی آخری بس پنیالہ میں آ کر رُکی، تو دوسرے کئی لوگوں کے ساتھ اس میں سے مولانا علم الدین شیرانی بھی اُترے۔ زیادہ تر سواریاں پنیالہ ہی کی تھیں۔ مولانا علم الدین شیرانی کو ابھی سات میل آگے عبدالخیل جانا تھا۔ مفتی محمود حج پر جانے والے تھے۔ وہ انہیں الوداع کہنا چاہتے تھے۔ کسی سواری کا انتظار فضول تھا؛ چنانچہ پیدل ہی عبدالخیل کی طرف چل پڑے۔ پنیالہ کے کردھیلی چھوٹی چھوٹی ندیوں اور نالوں کا جال عبور کر کے ایک ٹیلے پر پہنچے جس کے قریب پولیس سٹیشن کی نئی عمارت زیرِ تعمیر ہے، تو ایک آدمی نے بتایا کہ مفتی صاحب خانقاہ یٰسین زئی گئے ہیں۔ آج وہاں ان کی دعوت تھی۔ ابھی تھوڑی دیر میں ادھر سے واپسی ہوگی۔ یہ سُن کر وہیں راستے سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔ انہیں انتظار کرتے آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ دُور سے مفتی صاحب کی موٹر آتی نظر آئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جب تک سڑک کے قریب آتے، موٹر آگے نکل گئی، لیکن مولوی عبدالحلیم نے انہیں دیکھ لیا؛ چنانچہ ڈرائیور نے موٹر پیچھے موڑی اور وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

عبدالخیل پہنچ کر مولانا شیرانی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا: سنا تھا آپ حج پر جا رہے ہیں، الوداع کہنے آ گیا۔ مفتی صاحب نے کہا: اللہ کے بندے! میں حج پر نہیں جا رہا۔ مولانا شیرانی چُپ ہو گئے۔ شام کے وقت قاضی عطاء اللہ اور مولوی فتح خاں بھی مفتی صاحب سے ملنے آ گئے۔ ان کے ساتھ دو ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے کہا: مفتی صاحب، ہم نے بھی چند دنوں تک جانا ہے۔ آپ مدینہ منورہ میں جہاں ٹھہریں گے، وہاں کا پتہ لکھوا دیجیے تاکہ ملاقات کے لیے حاضر ہو سکیں۔ مفتی صاحب نے پتہ لکھوا دیا۔ اس پر مولانا شیرانی نے اعتراض کیا: آپ عجیب آدمی ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں میں حج پر نہیں جا رہا، لیکن دوسری طرف لوگوں کو وہاں کا پتہ بھی دیا جا رہا ہے۔ مفتی صاحب مسکرائے۔ اللہ کے بندے! کیا پتہ تیاری ہو جائے! تھوڑی دیر بعد ایوب جان بنوری اور دو افغان مہاجرین بھی وہاں پہنچ گئے۔ خوب محفل جمی۔ رات ایک بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب محفل برخاست ہوئی اور مفتی صاحب اٹھ کر اندر جانے لگے، تو مولانا شیرانی بھی ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ انہوں نے کمرے سے باہر نکل کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: میں صبح سویرے پہلی گاڑی سے واپس چلا جاؤں گا۔ اس وقت آپ زنانے میں ہوں گے، شاید ملاقات نہ ہو، اس لیے ابھی سے خدا حافظ اور الوداع!

مولانا مفتی محمود نے ان کا ہاتھ چھوڑ کر دایاں شانہ آہستہ سے دباتے ہوئے کہا: اللہ کے بندے! ابھی دوبارہ ملاقات ہو گی۔ یہ الوداع اور خدا حافظ کیسا! پھر ہنس کر پشتو میں کہنے لگے: وَلے خیال مکوہ زہ بہ نہ مرم۔ (دل میں اندیشہ مت لاؤ۔ میں نہیں مروں گا) مفتی صاحب نے دوبارہ یہ فقرہ کہا اور اندر جانے کے لیے مُڑ گئے۔ مولانا شیرانی چند لمحے وہیں کھڑے انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔

چند دن بعد... مفتی صاحب کی حج کے لیے ملتان اور پھر کراچی روانگی کی اطلاع آئی۔ پھر ایک دن ان کی موت کی خبر آ گئی۔ مولانا شیرانی بھاگم بھاگ عبدالخیل پہنچے۔ وہاں سوگواروں کا ہجوم تھا۔ مفتی صاحب کی بیٹھک میں قدم رکھا، تو بے اختیار ان سے ۸ر اکتوبر کی اپنی ملاقات کا منظر نظروں میں گھوم گیا اور کانوں میں ان کے آخری الفاظ گونجنے لگے: وَلے خیال مکوہ زہ بہ نہ مرم — وَلے خیال مکوہ زہ بہ نہ مرم۔ جذبات میں ہلچل سی مچ گئی اور پلکوں پر ننھے ننھے ستارے جھلملانے لگے۔ دماغ نے کہا، موت سے کسے رستگاری ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ دل سے آواز آئی، مفتی صاحب کو تو نہ مرنے کا غم تھا... زہ بہ نہ مرم۔ پھر آج یہ کیا ہو گیا۔ اسی لمحے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور وہ آہستہ سے زیرِ لب بڑبڑائے: مفتی صاحب نے ٹھیک ہی تو کہا تھا، زہ بہ نہ مرم۔ میں نہیں مروں گا۔ وہ مر بھی نہیں سکتے جب تک یہ ملک باقی ہے، یہاں کے لوگ زندہ ہیں، تاریخ زندہ ہے، مفتی صاحب بھی زندہ رہیں گے — تاریخ بن کر — لوگوں کے دلوں میں —!

یہ کہانی مفتی صاحب کے بہت سے دوست احباب اور عقیدت مندوں سے طویل ملاقاتوں کے بعد مرتب کی گئی۔ ان میں صاحبزادہ عبدالحمید، صاحبزادہ محمد، مولانا بجلی گھر، مولانا علم الدین شیرانی، چودھری محمد شریف، مولانا عبداللہ دس، مولانا عبدالسلام، خواجہ زاہد، شیخ عزیز الرحمن، گل شیر اور مولوی عبدالحلیم کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں

www.tezpakistan.com

مفتی صاحب مرحوم کی اہلیہ محترمہ
سے چند سوال

میرے شوہر
میرے رفیقِ حیات!

۱۔ کھانے میں کوئی خاص چیز پسند تھی ـــ کوئی پھل، ترکاری۔ ایسی چیز جو بطورِ خاص فرمائش کر کے پکوائی ہو؟

○ ترکاریوں میں انہیں پالک کا ساگ بہت پسند تھا۔ پھلوں میں آم اور سیب بڑے شوق سے کھاتے۔ باجرے کی روٹی انہیں پسند تھی لیکن چنے اور گندم کی ملی جلی روٹی کو اس پر ترجیح دیتے اور اکثر فرمائش کر کے پکواتے۔ ایک بار گھر میں چنے پیسنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ مفتی صاحب مسالہ پیسنے والا پتھر اور دستہ لے کر بیٹھ گئے اور اسی پر چنے پیس کر روٹی پکوائی۔

۲۔ کپڑوں کے معاملے میں کسی خاص اہتمام کے قائل تھے یا جیسے بھی مل جاتے پہن لیتے؟

○ کپڑوں کے بارے میں کوئی خاص اہتمام تو نہ تھا۔ کپڑا بڑھیا، گھٹیا جیسا ہوتا، موسم کے مطابق پہن لیتے۔ ہمیشہ شلوار قمیص پہنتے۔ لمبا سا کرتا ہوتا جس کے دونوں طرف بڑی بڑی جیبیں ہوتیں۔ کپڑوں کے معاملے میں اگر کچھ اہتمام تھا، تو صرف اس حد تک کہ ان کے کپڑے صاف اور دُھلے ہوئے ہوں۔ کپڑے میلے ہوتے یا کوئی بٹن ٹوٹا ہوتا یا کہیں سے پھٹا ہوتا، تو ناراض ہو جاتے اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے، لیکن اس ڈانٹ ڈپٹ میں زیادہ شدت یا تلخی نہ ہوتی۔ صرف اتنا کہہ کر چُپ ہو جاتے: آپ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ دیکھ لیا کریں۔

۳۔ گھر میں ان کی مصروفیات اور معمولات پر کچھ روشنی ڈالیں گی؟

○ جب تک ہم لوگ ملتان میں رہے، مفتی صاحب روزانہ صبح سویرے اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کرتے۔ اس کے بعد مطالعہ کرتے۔ پھر ناشتے کا وقت ہو جاتا اور وہ ناشتہ کر کے پڑھانے چلے جاتے۔ یہاں عبدالخیل میں انہیں لوگوں سے ملنے ملانے ہی سے فرصت نہ ملتی؛ چنانچہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد باہر بیٹھک میں چلے جاتے اور وہاں تقریباً سارا سارا دن گاؤں کے لوگوں یا باہر سے آنے والے ملاقاتیوں سے گپ شپ اور بات چیت میں مصروف رہتے۔

۴۔ کیا بچّوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ان کا کوئی خاص پروگرام تھا ـــ اپنے بچّوں میں سے کسی کو ڈاکٹر، انجینئر یا اعلیٰ افسر بنانا چاہتے ہوں ـــ کسی بچّے سے زیادہ پیار ہو؟

○ مفتی صاحب نے اس طرح کبھی نہیں سوچا۔ ان کے ذہن میں ڈاکٹری یا افسری وغیرہ کا کوئی خیال نہیں تھا۔ ہاں بچّوں کی دینی تعلیم کے بارے

www.tezpakistan.com

میں ضرور متفکر رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر ان کی کوئی خواہش تھی، تو وہ یہ تھی کہ ان کا کوئی بچہ بڑا ہو کر دنیا کی مختلف زبانیں سیکھے۔ اکثر کہتے، خدا کرے ایسا کوئی بچہ ہو جسے ساری زبانوں پر عبور حاصل ہو۔ اپنے چھوٹے بچے ضیاء الرحمٰن سے انہیں بڑا پیار تھا۔ اس کے بارے میں کہتے: مجھے ایسا لگتا ہے یہ بچہ میری خواہش ضرور پوری کرے گا۔ یہ ذہین لگتا ہے۔ جب بھی کسی دورے سے گھر واپس آتے، ضیاء الرحمٰن کو اپنے پاس بٹھا کر اسے عربی کی مختلف دعائیں یاد کراتے۔ وہ بھی بڑے شوق سے سیکھتا اور یاد کرتا۔ اگلی بار جب دوبارہ گھر واپس آتے، تو اس کی یاد کی ہوئی پہلی دعائیں سنتے اور پھر اسے نئی دعائیں یاد کراتے۔

ضیاء الرحمٰن کے علاوہ انہیں اپنی بڑی لڑکی سے بھی دوسروں کی نسبت زیادہ پیار تھا اور اس سے عام طور پر ہنسی مذاق بھی فرماتے رہتے۔

۵۔ جب گھر میں ہوتے، تو کیا بچے ان سے خوف محسوس کرتے یا ان کا رویہ بچوں کے ساتھ دوستانہ ہوتا؟

○ بچے عام طور پر ان سے خوف نہ کھاتے، لیکن ان سے زیادہ بے تکلف بھی نہ تھے۔ جب غصے کے عالم میں ہوتے، تو پھر تو کوئی بچہ بھی ان کے قریب نہ پھٹکتا۔ اگر ایسے میں انہیں کوئی کام پڑتا، تو ہم سے کہتے کہ آپ کہہ دیں۔

۶۔ بیماری کی وجہ سے ان کے مزاج میں کچھ چڑچڑاپن تو پیدا نہیں ہو گیا تھا؟

○ جی نہیں۔ بیماری یا جسمانی تکلیف کی وجہ سے ان کی عادتوں یا مزاج پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ جس طرح شروع میں تھے، آخر دم تک اسی طرح رہے۔

۷۔ آپ پر کبھی کوئی پابندی یا قدغن لگائی ہو کہ یہ کام کرو، یہ نہ کرو، یا عزیز رشتہ داروں سے میل ملاپ کے بارے میں مفتی صاحب کی طرف سے کوئی سختی ہوتی ہو۔

○ مفتی صاحب اعتراض برائے اعتراض کے قائل نہ تھے۔ کسی معقول وجہ کے بغیر انہوں نے کبھی ہمارے کہیں آنے جانے یا عزیز رشتہ داروں سے ملنے ملانے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوتے اور کوئی عزیز آجاتے، تو ان کی مزاج پرسی کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ عورتوں، مردوں، بچوں، بوڑھوں سب سے یکساں بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتے اور پوری تفصیل سے ان کا حال احوال پوچھتے۔

فضل الرحمٰن کی شادی ہوئی، تو بارات پشاور گئی۔ اگلے دن یہاں عبدالخیل میں ولیمہ تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ فلاں رشتہ دار بھی ہمارے ساتھ بارات میں پشاور چلیں اور انہیں ضرور دعوت دی جائے۔ مفتی صاحب نہ مانے۔ انہوں نے کہا: نہیں میں انہیں اپنے ساتھ پشاور جانے کی دعوت نہیں دوں گا؛ البتہ عبدالخیل میں ولیمے پر سب کو ضرور مدعو کروں گا۔ اصل خوشی یہی ہے کہ دلہن گھر میں آجائے اور ولیمہ ہو۔ یہ بارات کے ساتھ جانے یا لے جانے کی رسم فضول ہے اور خواہ مخواہ لڑکی والوں کے سر پر بوجھ ڈالنے والی بات ہے۔ مفتی صاحب کی بات ٹھیک تھی؛ چنانچہ ہم نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔

۸۔ گھر میں کبھی کسی بات پر آپ سے لڑائی جھگڑا ہوا؟ اگر ہوا، تو پھر صلح کرنے میں پہل کس نے کی؟

○ خدا کا شکر ہے ایسی کبھی نوبت نہیں آئی۔ گھر میں روزمرہ کی عام اور معمولی معمولی باتیں اور رنجشیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں، لیکن ایسی باتوں نے کبھی طول نہیں کھینچا نہ تلخی میں شدت پیدا ہوئی۔

۹۔ آپ سے اپنی بیماری یا جسمانی تکلیف کی کبھی کوئی شکایت کی؟

○ جی نہیں۔ انہوں نے گھر میں اپنی تکلیف کا کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ اس رمضان میں انہیں تکلیف ہو گئی تھی کہ وہ آرام سے لیٹ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ جب میں لیٹتا ہوں، تو تھوڑی دیر بعد بوجھ سا محسوس ہونے لگتا ہے، لیکن جب اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں، تو آرام آجاتا ہے۔ رات کو سوتے سوتے اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ ہم پوچھتے تو بتاتے کہ سینے پر بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ذرا افاقہ محسوس ہوتا، تو دوبارہ لیٹ جاتے۔

۱۰۔ مفتی صاحب کے ساتھ اپنی زندگی کا کوئی خوشگوار واقعہ بتانا پسند کریں گی؟

○ ساری زندگی ان کے ساتھ خوشگوار گزری۔ کبھی ناگوار می کا احساس تک نہیں ہوا۔ ذہن میں کوئی واقعہ محفوظ نہیں۔

www.tezpakistan.com

مفتی صاحب کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں

۱۔ صاحبزادی خلیلۃ الرحمٰن کھڑی ہے۔ ۲: صاحبزادہ لطف الرحمٰن گود میں چھوٹے بھائی عبید الرحمٰن کو لیے بیٹھا ہے۔ ۳: ضیاء الرحمٰن۔ ۴: خلیلۃ الرحمٰن، عبید الرحمٰن اور عتیقۃ الرحمٰن ۔۔۔ دو بہنیں ایک بھائی۔

www.tezpakistan.com

۱۱۔ آخری بار ان کے سفرِ حج پر روانہ ہونے سے پہلے کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہو؟

○ حج پر جانے سے ایک دن پہلے صحن میں پیڑھی پر بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ وضو سے فارغ ہو کر کہنے لگے: یہ تو اس صدی کا آخری حج ہے۔ نہ معلوم ہم بھی ادا کر سکیں گے یا نہیں۔

۱۲۔ کوئی وصیت، نصیحت ـــــ بچّوں کے لیے یا آپ کے لیے؟

○ نصیحت یا وصیت تو کوئی نہیں، البتہ وہ لوگوں سے لین دین کے وقت اس بات کا بڑا خیال رکھتے کہ کوئی پرائی چیز استعمال نہ ہونے پائے۔ اس بات کا بھی بڑا دھیان رکھتے کہ کسی کا ان پر کوئی حق باقی نہ رہ جائے۔ اکثر فرماتے کہ اگر مجھ سے کسی نے چوری چھپے میری کوئی چیز لے لی اور مجھے اپنی زندگی میں پتہ چل گیا، تو میں وہ چیز اس سے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ لیکن اگر پتہ نہ چلا اور وہ رہ گئی، تو میں نے معاف کیا۔ پھر اللہ اور اس کا معاملہ ہے۔ میرا اس میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

یہ انٹرویو مفتی صاحب کے برادرِ نسبتی مولوی عبدالحلیم صاحب کے ذریعے لیا گیا۔

مفتی صاحب کی چارپائی اور تکیہ۔ سرہانے دواؤں کا بریف کیس کھلا پڑا ہے

پیڑھی، جس پر بیٹھ کر مفتی صاحب وضو کیا کرتے تھے۔ قریب ہی مٹی کا کوزہ رکھا ہوا ہے۔

www.tezpakistan.com

مولانا فضل الرحمٰن

جُوں جُوں مَیں بڑا ہُوا ابّاجان کی تصویر بھی بڑی ہوتی گئی!

کسی شخص کی عزت و عظمت کا اندازہ اس کے نام و نسب سے نہیں، بلکہ سیرت و کردار اور علم و فضل سے ہوتا ہے؛ تاہم نام و نسب سے بھی بسا اوقات کسی کی خاندانی روایات، علمی برتری اور روحانی وجاہت سامنے آتی ہے۔ میں اسے خدا کا فضل و کرم سمجھتا ہوں کہ میرے والدِ محترم مفتی محمود صاحب کو قدرت نے یہ دونوں شرف عطا فرمائے۔ ہمارا خاندان کئی پشتوں سے علم و فضل اور روحانیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا لیکن ہمارے روحانی سلسلہ میں ذکر و فکر کی محفلیں عام نہیں۔ یہاں روحانی علوم کو سینہ بہ سینہ سکھایا اور چلایا جاتا ہے۔ ذکر بھی آہستہ کیا جاتا ہے۔ کوئی باقاعدہ خانقاہ ہے نہ چلہ کشی، ریاضہ ہے نہ دکھاوا، بس ایک محنت ہے جو سالک سے کرائی جاتی ہے جس سے اس کا باطن روشن ہوتا ہے اور اس محنت سے حلقۂ ذکر کے بہت کم لوگ باخبر ہوتے ہیں۔ مفتی محمود صاحب کے علاوہ ہمارے تایا خلیفہ احمد اور چچا محمدؒ بھی عالم تھے۔ ہمارے دادا مولانا محمد صدیق بھی اپنے دور کے عالم و عارف انسان تھے۔ ان سے آگے ان کے والد اور دادا بھی علم و فضل کے حامل تھے۔ اس طرح ہمارا خاندان برسوں سے علم کا گہوارہ چلا آرہا ہے۔

مَیں سنِ شعور کو پہنچا، تو اپنے والد کو تعلیم و تدریس میں مشغول پایا۔ وہ اس زمانے میں مدرسہ قاسم العلوم کے استاد تھے۔ تدریس کا یہ منصب کوئی غیر معمولی نہیں ہوتا، لیکن ہماری نظر میں یہ اس وقت غیر معمولی تھا۔ ہم سمجھتے تھے ہمارے والد عام لوگوں سے مختلف ہیں، لوگ ان کی عزت کرتے ہیں، انہیں جُھک جُھک کر سلام کرتے ہیں۔ وہ گھر آتے ہیں تو گاؤں کے بہت سے معزز لوگ دُور جا کر ان کا استقبال کرتے ہیں اور جب گاؤں سے باہر نکلتے ہیں، تو کئی لوگ انہیں رخصت کرنے کے لیے گاؤں سے باہر ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ ہم سوچتے تھے ہمارا باپ گاؤں کا نمبردار ہے نہ جاگیردار، نہ وڈیرا، نہ کسی کو کچھ دیتا ہے نہ کسی کا کوئی کام کرتا ہے، اس کے باوجود لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ یہ ایک دینی مدرسے کا استاد ہے، اس لیے دینی مدرسے کا استاد ہم بچّوں کی نظر میں بہت بڑا آدمی ہوتا تھا، لیکن ایک طرف ہماری عقل بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف ان کی عظمت میں اضافہ ہو رہا تھا؛ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں جب وہ قومی اسمبلی کے ممبر بنے، تو اس احساس میں مزید اضافہ ہو گیا کہ ہمارے والد غیر معمولی آدمی ہیں، یہ ایسی جگہوں پر جاتے ہیں جہاں لوگوں کے مسائل پر بحث ہوتی ہے، حق داروں کو ان کا حق دلایا جاتا ہے اور مظلوموں کو انصاف مہیا کیا جاتا ہے۔ ان دنوں لوگ ان کے پاس اپنے مسائل لے کر آتے، ہم ان کی خدمت کرتے۔ ہمیں ان کی خدمت کرتے ہوئے کوئی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ہمارے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ یہ لوگ ہمارے باپ کو بڑا سمجھتے ہیں، اس لیے ہمیں ان کی خدمت

www.tezpakistan.com

کرنی چاہیے۔

۱۹۶۵ء میں جب میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، تو والد صاحب کو صدر ایوب خان نے بلایا۔ ان کا کہیں جانے کا پروگرام تھا۔ وہ اپنا پروگرام ملتوی کر کے اسلام آباد تشریف لے گئے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے والد کو عام لوگ ہی اپنے گھر نہیں بلاتے، ہمارے ملک کا صدر بھی ان کی عزت کرتا ہے۔ اس ملاقات کی تصویر اخبارات میں چھپی، تو ایوب خان کے ساتھ والد صاحب کے علاوہ مولانا غلام غوث ہزاروی اور دوسرے افراد بھی موجود تھے۔ میں نے یہ تصویر اخبار سے کاٹ کر اپنی کتاب میں رکھ لی۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں اور بھی بڑے لوگ ہیں، جن کی ہمارے والد کی طرح لوگ عزت کرتے ہیں۔ ایک دفعہ والد صاحب میرا امتحان لے رہے تھے کہ کتاب میں رکھی ہوئی اس تصویر پر ان کی نظر پڑ گئی۔ مجھ سے پوچھا تم نے یہ تصویر کیوں رکھی ہے؟ میں نے جواباً کہا کہ مجھے آپ کی تصویر اچھی لگی اور میں نے کتاب میں رکھ لی۔ کہنے لگے مسلمان بچے تصویریں نہیں سنبھالا کرتے۔ اس تصویر میں غیر لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اس پر ہمارے گھر کی کسی عورت کی نظر پڑی، تو بہت گناہ ہوگا۔ مسلمان عورتیں، غیر مردوں کی تصویریں نہیں دیکھا کرتیں۔ میں نے تصویر اسی وقت ضائع کر دی اور مجھے یہ تصویر ضائع کرنے کا کوئی رنج نہیں ہوا، کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی اچھا کام نہیں۔ مجھے انہوں نے پیار محبت سے اس طرح بات سمجھائی کہ کم عمری ہی میں مجھے دو مسئلے معلوم ہو گئے۔ ایک یہ کہ تصویر رکھنا بُری بات ہے اور دوسرے یہ کہ عورتوں کے لیے غیر مردوں کا دیکھنا ہی حرام نہیں، ان کی تصویر دیکھنا بھی حرام ہے۔

جُوں جُوں میری عمر بڑھتی گئی، ان کی عزت و شہرت میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ جب بڑا ہو کر مجھے اچھے بُرے کی تمیز ہوئی، تو میرے چھوٹے سے ذہن میں ان کی جو قدآور شخصیت تھی، وہ چھوٹی نہیں ہوئی، بلکہ پہلے سے زیادہ بڑی اور پُرکشش نظر آنے لگی۔ اگر بات گھر کے حوالے سے کی جائے، تو مجھے اپنے عہدِ شباب سے لڑکپن کے دَور تک جانا ہوگا جہاں میں تھا اور ان کی گود تھی۔ ان کے شانے تھے اور میرا وجود، میرا کھیلنا اور ان کا کھلانا تھا۔ میری طفلانہ شوخیاں تھیں اور ان کا محبت آمیز تبسم تھا۔ میرا تکرار تھا اور ان کا پیار۔ میرا مچلنا اور ان کا بہلانا تھا۔ میری ضد اور ان کی دانائی تھی۔ میرا ہاتھ اور ان کی انگلی تھی، وہ مجھے ساتھ لے کر چلتے تھے اور میں ان کے ساتھ چل کر نہ صرف خوش ہوتا تھا، بلکہ ہمیشہ کوئی نئی بات سمجھتا اور سیکھتا تھا، لیکن گیا وقت واپس نہیں آسکتا، بیتے لمحے پلٹ نہیں سکتے، گزرا دَور لَوٹنا ممکن نہیں، گزشتہ ساعتیں حال میں نہیں آسکتیں، ماضی کو حال و مستقبل نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ یہ طویل داستان ہے جسے زبان و قلم سے بیان نہیں کیا جاسکتا، صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن اپنی تربیت کے حوالے سے کچھ کہنا آسان ہے، اس لیے کہ وہ تربیت میرے حال سے پیوست ہے۔ مجھے وہ دور خواب کی طرح یاد ہے جب وہ مدرسہ سے چھٹی پر گھر آتے تھے اور چند دنوں کے بعد واپس چلے جاتے تھے۔ واپسی کے وقت میں ان سے لپٹ کر ضد کرتا تھا کہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ وہ ہر بار یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرتے تھے کہ میں جلد واپس آؤں گا اور پھر تمہیں کھلاؤں گا، تمہارے لیے چیزیں بھی لے کر آؤں گا۔ اس وقت ہمارے گھر تک کوئی سواری نہیں جاتی تھی، لوگ اونٹوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ والد صاحب بھی اونٹ پر سوار ہو کر گھر پہنچتے اور جاتے وقت بھی اونٹ پر بیٹھ کر گاؤں سے رخصت ہوتے۔ چونکہ ان کی وضع قطع دوسرے لوگوں سے مختلف تھی، اس لیے جب گھر آتے، تو دُور ہی سے ان کی سواری آتی دیکھ کر ہم انہیں پہچان لیتے اور خوشی سے بھاگم بھاگ ان کی طرف چلے جاتے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سوار کر کے گھر تک لاتے۔ میں ان کے دیر سے آنے کی شکایت کرتے ہوئے کہتا، آپ کہہ جاتے ہیں میں جلدی آؤں گا، آپ آنے کا ایک دن بتا ہی کیوں نہیں دیتے تاکہ ہم اسی دن آپ کا انتظار کریں۔ اس پر وہ فرماتے اگر اس دن میں نہ آسکوں، تو تمہارا انتظار تمہیں پریشان کرے گا۔ میں ضد کرتا کہ آپ ضرور آنے کا دن طے کریں۔ اس پر وہ فرماتے اگر دن طے کر کے نہ آیا، تو یہ جھوٹ ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں جھوٹ بول دُوں؟ ان کی یہ بات مجھے لاجواب کر دیتی۔ چونکہ وہ ہر بار میری اس ضد کے جواب میں یہی کہتے، اس لیے مجھے جھوٹ سے نفرت ہو گئی۔ میں سوچتا کہ جھوٹ ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اب سوچتا ہوں، تو گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ مجھے جھوٹ سے نفرت دلانے کے لیے ہی ایسا کرتے تھے، کیونکہ گھر آنے کے لیے چھٹی کے دن تو طے شدہ ہوتے ہیں، لیکن اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ بہرحال یہ بہت ابتدائی دَور کی بات ہے۔ اس دَور کی بات جب میں ان کا اس لیے انتظار کرتا تھا کہ وہ آئیں، تو میں ان کے ساتھ کھیلوں، وہ مجھ سے پیار کریں۔ وہ آتے، تو میرے لیے کوئی نہ کوئی کھانے یا استعمال کی چیز لے کر آتے۔ میں ان سے پہروں کھیلتا رہتا۔ جب واپس جاتے، تو اس وقت تک انہیں کھڑا دیکھتا رہتا جب تک ان کی سواری انہیں لے کر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ مجھے ان کے محبت بھرے

www.tezpakistan.com

الفاظ یاد آتے: "میں جلد واپس آؤں گا۔" ان کے جانے کے بعد دیر تک مجھے یہ الفاظ سنائی دیتے اور جب کچھ دنوں کے بعد واپس آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ایک زمانہ بیت چکا ہے، ایک عرصہ گزر گیا ہے، طویل عرصہ، میرے انتظار سے بھی طویل، مگر جب وہ گھر پہنچ جاتے، تو دل بہل بہل جاتا اور طبیعت سنبھل سنبھل جاتی۔

پھر انہوں نے مجھے سکول میں داخل کرانے کے علاوہ ابتدائی دینی کتب پڑھانے کے لیے اپنے چھوٹے بھائی خلیفہ محمدؐ کے سپرد کر دیا۔ وہ مجھے سکول کا سبق یاد کرانے میں بھی مدد دیتے اور دینی کتابیں بھی پڑھاتے۔ اس دوران والد صاحب میری صلاحیت دیکھنے کے لیے کبھی کبھی میرا امتحان بھی لے لیتے اور محنت سے مطمئن ہو کر کوئی نہ کوئی انعام دے کر حوصلہ افزائی کرتے۔ ابتداء وہ میرے ساتھ بہت بے تکلف تھے۔ میں ان سے بہت گھل مل گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہنسی کھیل میں شامل ہوتے۔ میرے کھیلنے سے خوش ہوتے۔ میری شوخیوں اور شرارتوں سے محظوظ ہوتے؛ البتہ تعلیم کے وقت کھیل کود کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے میرے لیے ایک اصول بنا دیا تھا: "کھیل کے وقت کھیل اور تعلیم کے وقت تعلیم"۔ تعلیم کے دوران کھیل اور کھیل کے دوران سبق مجھے کبھی یاد نہیں آئے، کیونکہ دونوں کا وقت مقرر تھا اور وقت سے بے وقت ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اس پابندی نے مجھے سمجھا دیا کہ وقت بہت قیمتی چیز ہے، اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے؛ چنانچہ دس بارہ سال کی عمر ہی میں کھیل کود کو میں نے خود ہی ترک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ تبدیلی بھی آئی کہ میری عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ والد صاحب کی بے تکلفی کم ہوتی چلی گئی؛ یہاں تک کہ جب میں سوچنے

بڑے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن، مفتی صاحب سے مصروفِ گفتگو ہیں۔

www.tezpakistan.com

سمجھنے کے قابل ہوا، تو میرے اور ان کے مابین ایک پُر وقار سا حجاب اور ایک غیر محسوس سا تکلف پیدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھے تمیز سکھانے کے لیے سختی کے بجائے حکمت استعمال کی۔ ان کا رویہ ہمیشہ حکیمانہ رہا۔ جب تک میری کھیلنے کی عمر تھی، کھیلا، جب کھیلنے کی عمر ختم ہو گئی، تو صرف پڑھنے کی طرف توجہ ہو گئی۔ مجھے کسی کے بتائے بغیر خود بخود ہی معلوم ہو گیا کہ والد کے ساتھ بچے ہنسی مذاق کرتے ہیں نہ بے تکلف ہوتے ہیں، اس کے سامنے زیادہ بولتے ہیں نہ شوخیاں کرتے ہیں۔ وہ ایک محترم ہستی ہوتا ہے۔ اس کا ہمیشہ اور ہر حال میں احترام کیا جاتا ہے اور یہی تصور والدہ کے بارے میں بھی دل میں پیدا ہو گیا۔ یہ سب کچھ ان کی حکیمانہ تربیت کا اثر تھا۔

ایک اور بات جو اس سے کہیں زیادہ میرے لیے تعجب کا باعث بنی، وہ یہ تھی کہ والد صاحب نے مجھے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں کیا پڑھوں اور کیا نہ پڑھوں۔ والدین کے لیے اولاد کی تعلیم کا مسئلہ ہمیشہ اہم رہا ہے۔ خاص طور پر عہدِ حاضر میں اکثر دیندار گھرانے اسی شش و پنج میں مبتلا رہتے ہیں کہ اولاد کو دینی تعلیم دی جائے یا عصری علوم سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے، لیکن ہمارے گھر میں اس بارے میں کبھی کوئی مشورہ نہیں ہوا۔ میرے سامنے اپنے والد کی شخصیت تھی۔ میں قدرتی طور پر اسی علم کی طرف توجہ دینے لگا جو میرے والد کا اوڑھنا بچھونا تھا؛ چنانچہ میں نے کسی جھگڑے یا اختلاف کے بغیر ہی ۱۹۶۹ء تک ابتدائی دینی کتب پر دسترس حاصل کرنے کے علاوہ میٹرک کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد والد صاحب نے مجھے ضلع میانوالی کے ایک دُور دراز قصبے میں مفتی محمد عیسیٰ صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ مفتی صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صَرف کے بہت ماہر استاد ہیں۔ وہ مروجہ کتب کے علاوہ صَرف کی ایک قلمی کتاب "ایجاز الصرف" بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ طالب علم بہت ذہین ہو، تو یہ کتاب چار ماہ میں پڑھ لیتا ہے۔ کم ذہین ہو، تو چھ ماہ میں، غبی ہو، تو آٹھ ماہ میں، بہت زیادہ غبی ہو، تو سال میں۔ میں نے یہ کتاب چار مہینے میں پڑھ لی، تو انہوں نے والد صاحب کو میرے ذہین ہونے کی خوش خبری دی۔ اس پر وہ محض مسکرا کر رہ گئے، کیونکہ اب میری عمر ایسی نہیں تھی کہ مجھے ایسی کتاب پڑھنے پر کوئی انعام بھی دیا جاتا، لیکن میانوالی کے دُور دراز قصبے میں بھیجنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مجھے علمِ صَرف کا ماہر بنانا چاہتے تھے، یہ چیز مجھے والد صاحب کے قریب رہ کر بھی حاصل ہو سکتی تھی۔ والد صاحب کے پیشِ نظر تین وجوہات تھیں۔ اسی وجہ سے مجھے میٹرک پاس کرنے کے فوراً بعد گھر سے دُور بھیج دیا۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ ہمارے گھر کا ماحول سیاسی تھا اور والدِ محترم مجھے اس ماحول سے دُور رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں اپنے موجودہ ماحول میں رہا، تو سیاسی دلچسپیاں مجھے اپنی طرف کھینچ لیں گی اور ان مشغلوں سے میری تعلیم متاثر ہو گی۔ اس موقع پر مجھ پہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ میری عادت، خصلت، طبیعت اور دلچسپیوں سے پوری طرح باخبر ہیں اور میری تعلیمی اور سیاسی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے اس بات کا اندازہ یوں ہوا کہ میرے گھر سے دُور بھیجنے کا ان کا فیصلہ اٹل اور حرفِ آخر تھا۔ ان دنوں میں چھپ چھپا کر ان کی اور دیگر سیاسی لیڈروں کی تقاریر سُنا کرتا تھا۔ تعلیم سے کچھ وقت نکال کر اخبار بینی بھی کر لیتا تھا۔ جس شخص کے صبح و شام سیاسی باتوں میں گزرتے ہوں، جس کے پاس سیاسی لیڈروں اور ورکروں کا آنا جانا ہو، اس کا اپنا بیٹا سیاست سے کیسے بچ سکتا ہے؟ انہوں نے اپنی زبان سے تو مجھے کچھ نہیں کہا، مگر ان کے تیور بتاتے تھے کہ میری چوری چھپے کی اخبار بینی اور جلسوں میں شمولیت سے وہ واقف ہیں اور اسی وجہ سے مجھے دُور بھیج رہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میٹرک کے بعد وہ مجھے کالج کے ماحول سے دُور رکھنا چاہتے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، تو میرے ایک استاد نے والد صاحب کے پاس آ کر مشورہ دیا کہ مجھے مزید تعلیم کے لیے کالج میں داخل کرایا جائے، لیکن انہوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملتان کے ایک مقامی کالج کے پرنسپل صاحب جو اُن کے دوست تھے، گھر آئے اور انہوں نے بھی والد صاحب کو قائل کرنے کی بہتیری کوشش کی، مگر وہ کسی صورت مجھے کالج میں داخلہ دلوانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ میرے استاد اور دوسرے محترم نے جو کوشش کی، میں اس سے بے خبر تھا۔ ان کی اپنی خواہش تھی کہ میں کالج میں داخل ہو کر مزید تعلیم حاصل کروں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، تو میں نے ذہنی طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے دینی کتابوں کی تکمیل کروں گا، اس کے بعد مزید عصری علوم کی طرف توجہ دوں گا، لیکن والد صاحب کا کہنا تھا دینی علوم کی تکمیل کے بعد بھی کالج میں داخلہ نہیں لینا۔ وہ اس تعلیم کے مخالف نہیں تھے، لیکن کالجوں کے ماحول سے بہت زیادہ غیر مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کالجوں کا موجودہ ماحول انسان کی انسانیت چھین لیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیز بھی ان کے پیشِ نظر تھی کہ کالجوں میں سیاسی

www.tezpakistan.com

سرگرمیاں طالبِ علم کو تعلیم سے ہٹا کر سڑکوں پر لے آتی ہیں۔ وہ حق و صداقت اور جمہوری اقدار کے احیا کے لیے ان نوجوانوں کا سڑکوں پر آنا بھی درست سمجھتے تھے، لیکن ان کا کہنا یہ تھا کہ حصولِ تعلیم کے دوران بنیادی توجہ تعلیم پر ہونی چاہیے۔

یہ بات کہ وہ انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں تھے، میں اس لیے وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ خود بھی قومی اسمبلی کا ممبر بننے کے بعد اپنے دوست شیخ محمد اقبال صاحب سے انگریزی سیکھتے اور پڑھتے رہے۔ انہوں نے ابتدائی طور پر ان سے کچھ انگریزی کتابیں پڑھیں۔ چونکہ وہ بہت زیادہ ذہین تھے، اس لیے تھوڑے ہی عرصے میں رواں ہو گئے۔ وہ انگریزی بولنے پر تو قادر نہیں تھے، لیکن سمجھنے پر انہیں پوری قدرت تھی اور پڑھنے میں بھی دقت محسوس نہیں کرتے تھے۔ اردو اخبارات کے ساتھ انگریزی اخبارات بھی ان کے مطالعے میں رہتے تھے؛ البتہ انگریز اور انگریزی تہذیب کے سخت مخالف تھے۔ کالجوں کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ یہاں جس قسم کا طرزِ تعلیم رائج ہے، وہ بچوں کو انگریزی تہذیب کا دلدادہ بناتا ہے اور فرنگی تہذیب کی مخالفت ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا حصہ تھی۔ اس بارے میں وہ خود کہا کرتے تھے کہ ایک بار میں نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ کریمؐ مجھے مخاطب کر کے فرماتے ہیں اپنے لوگوں کو تقلید سے بچاؤ۔" میں حیران ہوا کہ میرے تو تمام بزرگ مقلد تھے، پھر آپؐ مجھے کونسی تقلید سے لوگوں کو روکنے کا حکم صادر فرما رہے ہیں۔ پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا، "مسائلِ فقہ تو عینِ نص ہیں۔" اس سے خواب ہی میں میرا یہ اشکال رفع ہو گیا۔ آپؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ فقہی مسائل دراصل قرآن و حدیث ہی سے مستنبط ہیں، اس لیے ان کا ماننا ائمہ کرام کی تقلید نہیں، بلکہ قرآن و حدیث کی تقلید ہے۔ بیدار ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ دنیا میں کونسی ایسی قوم ہے لوگ جس کی زیادہ نقالی کرتے ہیں۔ محسوس ہوا کہ نقالی تو یہ کسی نہ کسی حد تک سب کی کرتے ہیں، لیکن انگریز کی نقالی سب سے زیادہ کی جاتی ہے؛ چنانچہ میں نے عہد کر لیا کہ اقوامِ غیر کی نقالی سے لوگوں کو تو پہلے بھی روکتا تھا اب اس چیز پر زیادہ محنت کروں گا، چنانچہ اس کے بعد میں نے ہر موقع پر انگریزی تہذیب کی مخالفت کی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے کالج میں داخل ہونے سے روک دیا اور ساتھ ہی اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ اگر تم چاہو، تو پرائیویٹ طور پر مزید تعلیم حاصل کر سکتے ہو؛ چنانچہ ان کی اجازت کے بعد میں نے ایف اے کا پرائیویٹ طور پر امتحان دیا جب دینی کتابوں کی تکمیل مکمل ہوئی، تو دل نے فیصلہ دیا کہ کتابیں پڑھانے سے علم میں پختگی آئے گی۔ یہ خیال اتنا پختہ ہوا کہ میں نے قاسم العلوم ہی میں تدریس کا کام شروع کر دیا۔ اس لیے ایف اے کے امتحان کے بعد مزید کسی امتحان کی تیاری نہ کر سکا۔ میانوالی سے واپس آنے کے بعد اگر مجھے قاسم العلوم میں داخلہ ملتا، تو میں جدید تعلیم میں آگے بڑھ سکتا تھا، لیکن ہوا یہ کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد مجھے دارالعلوم اکوڑہ خٹک میں بھیج دیا گیا۔ باقی کتابوں کی میں نے وہیں تکمیل کی۔

مجھے گھر سے دُور بھیجنے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ والد صاحب کا خیال تھا کہ گھر کی سہولتیں اور آسائشیں طالبِ علم کو سُست اور کاہل بنا دیتی ہیں۔ آرام پسندی اسے آگے بڑھنے سے روکتی ہے، جبکہ گھر سے دُور رہ کر وہ مشکلات و مصائب کا خوگر بنتا ہے۔ مشکلات اسے حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بخشتی ہیں۔ انسان کے اندر آگے بڑھنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ سے دور رہ کر اسے ان لوگوں کا خیال آتا ہے جو ماں باپ جیسی نعمت سے یتیم ہونے کے سبب محروم رہتے ہیں اور ایسے لوگ جب خود ماں باپ کی شب و روز کی شفقت و محبت سے دُور رہتے ہیں، تو ان کے دل میں یتیموں اور غریبوں کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ان کے دل میں عالمِ انسانیت کے لیے جذبۂ ترحم پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ کسی غریب، ناتواں اور کمزور پر ظلم کرنا یا کسی اور کو ظلم و ناانصافی کرنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے۔ ان کی اپنی تکلیف انہیں دوسروں کی تکلیف کا احساس دلاتی ہے اور جب دوسروں کو وہ تکلیف میں دیکھتے ہیں، تو اپنا آرام ان پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہیں سے ان کی سوچ انسان کے بنیادی حقوق کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص یا طاقت انسان سے اس کے بنیادی حقوق چھین رہی ہے، تو وہ سراپا کف ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور اس طرح گھر سے بے گھر، وطن سے بے وطن، آرام سے بے آرام ہونے والے اپنی ذات اور تجربات کے حوالے سے انسانیت کے محافظ اور قانون و انصاف کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ مزید برآں ماں باپ کے سایۂ عاطفت سے دُور رہ کر پیغمبرِ اسلامؐ کے ایامِ طفولیت سے ایک عملی مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اس دُرِ یتیم سے یہ مشابہت انسان کو اس کی پیروی اور اتباع کی راہ پر گامزن کرتی ہے اور ساتھ ہی پیغمبرِ کائنات کی ہجرت کی سنت بھی ادا ہو جاتی ہے۔ یہ تمام امور انسان کو سرفراز و سربلند بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں وہ اکثر کہا کرتے تھے، اس لیے جب میں حصولِ تعلیم کے لیے گھر سے جانے لگا، تو میں نے اپنے

www.tezpakistan.com

دل پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا، کیونکہ یہ سفر میری تعلیم و تربیت کا حصہ تھا اور والدِ محترم باتوں ہی باتوں میں مجھے اس کام کے لیے آمادہ کر چکے تھے اور میں نے ان کی زندگی ہی میں ان مراحل سے گزر کر درس و تدریس کا کام شروع کر دیا تھا۔

مجموعی طور پر میں نے اپنے والد کو اپنی ۲۰ سالہ شعوری زندگی میں پانچ حیثیتوں سے دیکھا ہے۔ باپ، مربی، استاد، عالم اور سیاستدان۔

بحیثیت باپ وہ قابلِ فخر تھے۔ وہ صرف "حقوقِ والدین" کے معلم ہی نہیں تھے، بلکہ حقوقِ اولاد بھی ان کے پیشِ نظر رہتے تھے۔ باپ کی حیثیت میں اولاد کے لیے جو شفقت ہر باپ کو قدرت نے دی ہے، وہ ان کو بھی دی تھی، لیکن میرے محسوسات یہ ہیں کہ یہ نعمت ان کو قدرت نے کچھ زیادہ فراوانی سے عطا فرمائی تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ گھر میں اس طرح گھل مل جاتے تھے کہ ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ کوئی بڑا آدمی اپنی اولاد کو اتنا خوش نہیں رکھ سکتا نہ اتنا بہلا سکتا ہے جتنا وہ خوش رکھتے یا بہلاتے تھے۔ گھر میں بیٹھ کر احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ شخص اتنا بڑا رہنما ہے جو ہر وقت ملکی اور قومی مسائل میں الجھا رہتا ہے۔ وہ چند لمحے جو بچوں کے ساتھ گزارتے تھے، بڑے خوشگوار ہوتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ان کا اور کوئی کام ہی نہیں، یہ صرف بچوں سے ہنسنا کھیلنا جانتے ہیں اور کبھی کبھی اس صورتِ حال میں فخر کا احساس بھی ہوتا تھا کہ اس عظیم انسان کی صورت میں اس کی جو شفقت اس گھر کے افراد کو حاصل ہے، وہ کسی اور کو ہرگز حاصل نہیں۔ عمر کے آخری دنوں میں بھی وہ گھر آتے، تو چھوٹے بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے کر آتے۔ ہوائی سفر کے دوران مسافروں کو وقت گزاری کے لیے ٹافیاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ والد صاحب یہ ٹافیاں ہمارے لیے سنبھال لیتے۔ گھر آتے، تو یہ میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو دیتے۔ میں ہنس کر پوچھتا آپ کو سفر میں بھی ان کا خیال رہتا ہے جو یہ ٹافیاں اب تک جیب میں ہیں۔ فرماتے جب تم باپ بن جاؤ گے، تو سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرو گے اور جب تک باپ نہیں بنو گے، اس سوال کا جواب نہیں سمجھ سکو گے۔ اولاد کے لیے رزقِ حلال فراہم کرنا، ان کی جائز ضروریات کو جائز طریقے سے پورا کرنا، ان کی صحیح رہنمائی کرنا، حتیٰ کہ ان کو شفقت سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔ جب وہ گھر میں کوئی بات کرتے یا کسی سوال کا جواب دیتے، تو ان کی باتوں میں علم و حکمت کی تعلیم ہوتی اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے باپ کی سیاسی اور تدریسی زندگی کی طرح ان کی خانگی زندگی بھی بڑی خوبصورت ہے۔

بحیثیت مربی انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، بود و باش، رہائش، خوراک اور جائز ضروریات کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی دلایا کہ جائز ضرورت وہی ہوتی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کی جائے۔ جس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انسان کو ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑیں، وہ جائز نہیں ہوتی۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی، تو وہ میری طرح اپنی دوسری اولاد کے شادی بیاہ کا بندوبست بھی کرتے، لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ ان امور کی انجام دہی سے پہلے ہی انہیں اپنے پاس بلا لے۔ ان کے طفیل ہمیں جو کچھ میسر تھا کافی تھا۔ میں نے یا میرے بہن بھائیوں میں سے کسی نے آج تک یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ ہم ضروریاتِ زندگی کے حصول کے سلسلے میں کسی سے پیچھے ہیں یا ہم سے کوئی بہتر پوزیشن کا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ہمارے لیے کوئی وسیع اراضی، بنک بیلنس یا کوئی دوسری بڑی جائیداد بنائی، بلکہ انہوں نے ہماری تربیت اس انداز میں کی کہ ہم نے تھوڑے کو ہمیشہ زیادہ سمجھا اور جو کچھ میسر آیا، اس پر قناعت کی، زیادہ کی حرص نہیں کی۔ اگر وہ ہمیں اربوں روپے کی جائداد بنا دیتے اور قناعت کی تعلیم نہ دیتے، تو میں اپنے آپ کو مفلس سمجھتا اور اس تعلیم کے ساتھ جو کچھ میسر ہے، وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ ہمارا سب سے بڑا سرمایہ اور سب سے اہم دولت قناعت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی، تو سب کچھ ہونے کے باوصف کچھ نہ ہوتا۔ یہ موجود ہے، تو کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں۔

بحیثیت استاد وہ سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ تعلیمی کوتاہی ان کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نرم خو بھی تھے۔ اگر سبق یاد نہ کرنے پر ان پر جلال غالب آجاتا تھا، تو سبق یاد کرنے پر ان کا جمال بھی دیدنی ہوتا تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر ہمیشہ نرمی کے آثار دیکھے ہیں، لیکن جب وہ میرا امتحان لیتے تھے، تو ان کے چہرے سے نرمی کے آثار یکسر غائب ہو جاتے تھے۔ اگر کسی سوال کا صحیح جواب نہ دیتا، تو سخت گرفت اور باز پرس کرتے تھے۔ سبق پڑھانے کا انداز حکیمانہ تھا۔ وہ پڑھانے سے زیادہ سمجھانے کے قائل تھے۔ ان کی سمجھائی ہوئی بات ناقابلِ فراموش ہوتی تھی۔ فنون کی کتابوں کے مشکل مقامات مجھ سے پوچھتے اور جہاں محسوس کرتے کہ میرا اظہارِ خیال مشکل اور طوالت لیے ہوئے ہے، وہاں مشکل ترین بحث کو چند آسان جملوں میں اس طرح سمجھاتے کہ وہی مشکل بحث سب سے زیادہ آسان نظر آتی اور اسے انتہائی

www.tezpakistan.com

آسان الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت حاصل ہو جاتی۔ منطق و فلسفہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ ان موضوعات کی اساس، افکار اور طولانی مباحث میں الجھے بغیر قانونی پیچیدگیوں اور فنی مشکلات کو اس طرح آسان انداز میں پیش کرتے کہ پڑھنے اور سننے والوں کو سخت حیرت ہوتی۔ منطق و فلسفہ کے ماہرین میں ایک خرابی یہ ہے کہ وہ ان فنون کے مضبوط دلائل و قوانین سے متاثر ہو کر کلام و عقائد کو دوسرے درجے کی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ دراصل ان موضوعات کی قطعیت کا ایک لازمی تاثر ہوتا ہے، لیکن والد صاحب ان موضوعات میں طلبہ کو آگے بڑھاتے، یہاں تک کہ ان میں تحقیق و تفتیش کا ذوق بڑھ جاتا۔ پھر وہ منطق و فلسفہ کے دلائل کا عقائد و کلام کے دلائل سے موازنہ کرتے اور عقائد کی برتری کے ثبوت پر ایسے دلائل دیتے کہ طلبہ پر واضح ہو جاتا کہ علوم و فنون میں منطق و فلسفہ اصل نہیں، عقائد و کلام اصل ہیں اور یہ فنون صرف اس حد تک ضروری ہیں کہ مبتدی کو غور و فکر اور تحقیق و جستجو کے بعد یہ معلوم ہو سکے کہ حق و باطل، سیاہ و سفید اور اصل و فرع میں کیا فرق ہے؟ ان کے پاس پڑھنے والے طلبہ میں کئی ایسے قابل مدرس بھی ہوئے جن کو منطق و فلسفہ پر بڑا عبور حاصل ہے، لیکن ان کے نزدیک ان فنون کے دلائل کو عقائد کے مقابلے میں کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اس طرح تدریسی اور تعلیمی میدان میں وہ ایک ایسی فکر دینے میں کامیاب ہوئے جو منطق و فلسفہ کے معلم اور متعلم کو توازن و اعتدال کی راہ دکھاتی ہے۔

بحیثیت عالم ان کا مقام بہت بلند تھا، لیکن اگر اس سے مراد مجرد علم ہے، تو اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کس پائے کے عالم تھے۔ اس کا فیصلہ کرنا خود علما کے لیے مشکل ہے جنہوں نے ان کے فقہی استدلال سنے، انہوں نے انہیں فقیہہ مانا۔ جنہوں نے حدیث پڑھی، انہیں محدث نظر آئے۔ جنہوں نے تفسیر پڑھاتے دیکھا، انہوں نے مفسر قرار دیا۔ جنہوں نے منطق و فلسفہ پڑھاتے دیکھا، انہوں نے ایک معقولی عالم سمجھا۔ جنہوں نے میدانِ سیاست میں بولتے دیکھا، انہوں نے ایک سیاستدان کی حیثیت سے پہچانا۔ وہ کتنے بڑے عالم تھے؟ یہ طویل بحث ہے تاہم اس بحث کو یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ پھل سے بھرا درخت جھکا ہوتا ہے۔ اہلِ علم کی پہچان یہ ہے کہ ان پر خشیتِ الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کا علم انہیں مغرور کے بجائے منکسر بنا دیتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم نے گھریلو زندگی میں انہیں دوسروں سے بڑھ کر دیکھا ہے۔ ان کے صبح و شام یادِ الٰہی میں بسر ہوتے تھے۔ بڑائی ان کے قریب سے بھی نہیں گزرتی تھی۔ انکسار ان کا رفیق تھا۔ وہ رات گئے تک قومی امور میں الجھے رہتے تھے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ گھر دیر سے آئے اور تہجد کا وقت انہوں نے بستر پر لیٹ کر گزار دیا۔ ہم نے اکثر انہیں راتوں کو خدا کے سامنے سربسجود پایا۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے "لوگو! علم سیکھو اور یہ جان رکھو کہ اللہ کی ایک مخصوص چادر ہے جس کو وہ محبوب رکھتا ہے، سو جو شخص علم کے درواز پر دستک دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی یہ چادر اسے پہنا دیتا ہے۔ پھر اگر اس سے کوئی غلطی بھی ہوتی ہے تو اس کو تین بار معاف کرتا ہے اور بخشش و مغفرت کا یہ سلسلہ اس کی موت تک جاری رہتا ہے۔" ابن المبارکؒ سے پوچھا گیا انسان کون ہیں؟ فرمایا علما۔ سوال کیا بادشاہ کون ہیں؟ بتایا عابد و زاہد۔ دریافت کیا سفلہ کون ہیں؟ ارشاد ہوا وہ لوگ جو دین کو بیچ کر دنیا حاصل کرتے ہیں۔ ابن المبارکؒ نے علما ہی کو انسان اس لیے قرار دیا کہ حیوانِ ناطق میں سے یہ اپنے علم ہی کی وجہ سے ممیز ہے اور اسی کی بدولت وہ اس شرف کا حامل ہے؛ ورنہ طاقت میں اونٹ اس سے کہیں بڑا ہے۔ جہاں تک ہڈی اور گوشت کی بہتات کا تعلق ہے، تو ہاتھی اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ شجاعت و بسالت میں درندے اس پر فوقیت رکھتے ہیں۔ کھانے پینے میں یہ بیل کا کیا مقابلہ کر سکے گا؛ اگر علم کی اس تعریف کی روشنی میں ان کی ذات کا تجزیہ کیا جائے، تو وہ ابن المبارکؒ کی تعریف پر پورے اترنے والے انسان تھے۔ خدا خوفی کا ایک وصف یہ ہوتا ہے کہ انسان، انسانوں کی طرف سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ مفتی صاحب کو قدرت نے ہر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات تھی اور وہ اس ذات کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔

بحیثیت سیاستدان وہ ایک خاص ڈھب کے انسان تھے۔ سیاسی زندگی میں صبح و شام لوگوں سے ایسے وعدے کیے جاتے ہیں جن کا ایفا غیر ضروری ہوتا ہے۔ لوگ رات کو ایک بیان دیتے ہیں اور صبح اس کے بالکل برعکس ایک نیا بیان موجود ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک سیاست عبادت تھی۔ اس عبادت میں جھوٹ کی آمیزش کو انہوں نے ہمیشہ گناہ سمجھا۔ جب وہ سیاست پر اظہارِ خیال کرتے، تو ان کی گفتگو میں کوئی ابہام، پیچیدگی یا پہیلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جس چیز پر بولتے، کھل کر بولتے۔ جس کی گرفت کرتے، کس کر گرفت کرتے۔ ذاتی حیثیت میں کسی کے دوست تھے نہ دشمن؛ ان کی دوستی بھی خدا کے لیے تھی اور دشمنی بھی خدا کے لیے۔ جب کوئی شخص اسلام کے خلاف لب کشائی کرتا، تو اس سے ان کی ٹھن

www.tezpakistan.com

جاتی۔ وہ ہر بات منہ پر کرتے، پشت پر وار کرنا اور سہنا ان کے نزدیک جائز نہ تھا۔ وہ اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے نظام کو لانے کے روادار نہ تھے اور ان لوگوں کو اسلامی نظام نافذ کرنے کا اہل نہیں سمجھتے تھے جن کی اپنی زندگی اسلام کے خلاف ہے۔ بعض لوگ ان سے کہا کرتے تھے کہ فلاں آدمی ذاتی حیثیت میں بڑا نیک ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مفتی صاحب فرماتے ذاتی نیکیاں اپنی ذات کے لیے ہوتی ہیں، قومی امور کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی صرف نماز روزے کا دعویدار نہ ہو، وہ دین کے بارے میں اتنا علم بھی رکھتا ہو کہ دین کو دین کی حیثیت میں نافذ کرے۔ اگر دین سے بے خبر آدمی کامل نیک نیتی سے بھی نافذ کرے، تو اپنی کم علمی کے باعث ایسی باتیں اور اقدامات کر گزرے گا، جو دین کے بجائے بے دینی کے زُمرے میں آئیں گے۔ علاوہ ازیں دین کے مبلّغ اور نافذ کرنے والے افراد کے لیے ان کا عادل و صادق ہونا بھی ضروری ہے۔ جو لوگ عدل سے دُور ہوں، ان کا وجود ہی ظلم کی دلیل ہو اور ان کے صدق و کذب میں کوئی فرق نہ ہو، ایسے لوگ اسلام کی بدنامی کا باعث تو بن سکتے ہیں، لیکن اسلام کو نافذ نہیں کر سکتے۔ اسلام کا نفاذ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنی ذات پر اسے نافذ نہیں کر سکتے، وہ خدا کی دھرتی پر بھی اسے نافذ نہیں کر سکتے۔ اسلامی نظام کا نفاذ ان کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ ہمیں اکثر ہدایت کرتے رہتے تھے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اپنی زندگی وقف کیے رکھنا، ظلم کو ظلم کہنے سے کسی حال میں باز نہ رہنا، حق کی حمایت کرنا اور باطل کے خلاف بھرپور جدّ و جہد کرنا۔ ہمارے لیے ان کی سب سے بڑی تعلیم اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ ہم اس تعلیم کو ہرگز نہیں بھول سکتے۔ ان کی میراث عدل و انصاف کا پیغام ہے۔ ہم اس پیغام کو تا حیات لوگوں تک پہنچاتے رہیں گے۔ ان کا مشن حق کی سرفرازی و سربلندی تھا۔ ہم اس مشن کو جاری رکھیں گے، اس وقت تک جب تک ہماری رگوں میں خون چلتا اور پہلو میں دل دھڑکتا ہے۔ (انشاء اللہ)

عارف باللہ، حضرت مولانا عبدالہادی صاحب دین پُوری رحمۃ اللہ علیہ ایک بار سخت بیمار ہُوئے۔ بغرضِ علاج ملتان لائے گئے جب خانقاہ سراجیہ خبر پہنچی تو حضرت مولانا خان محمد صاحب مدظلہ نے راقم الحروف کو حضرت دین پُوری کی خدمت میں حاضر ہونے کا حکم دیا کہ میں ان کی طرف سے بیمار پُرسی کر لُوں، اور سلام عرض کروں۔ مَیں جب حضرت دین پُوری کی خدمت میں حاضر ہُوا، تو بہت سے مریدین اور معتقدین حضرت کے پاس تھے۔ راقم الحروف نے حضرت مولانا خان محمد صاحب کی طرف سے سلام عرض کیا اور کہا کہ راقم الحروف ان کی طرف سے مزاج پُرسی کے لیے حاضر ہُوا ہے۔ حضرت دین پُوری صاحب مرحوم پر وجدی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وقفہ کے بعد مجھے فرمایا کہ فقیر کی طرف سے بھی حضرت مولانا خان محمد صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرے اور فقیر کی طرف سے اپنی پگڑی ان کے پاؤں مُبارک پر رکھے اور اُن سے دُعا کی درخواست کرے کہ اللہ تعالیٰ فقیر کو بغیر حساب لیے جنّت میں داخل فرما دے، حساب لینے پر آئے تو کوئی نہیں بچ سکتا"۔ رخصت لیتے وقت راقم الحروف نے مفتی صاحب کی صحت کے لیے دُعا کی درخواست کی تو حضرت نے استفسار فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب آج کل کہاں ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ وہ آج بہاولپور تشریف لے گئے ہیں۔ اس پر حضرت صاحب نے فرمایا کہ میرا رُخ بھی اس طرف کر دو۔ (مفتی صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور حضرت حسین احمد مدنی کے صحیح جانشین ہیں) تاکہ ان کی طرف سے مجھے ٹھنڈی ہوا آئے اور رُوح کو تسکین ہو۔

ایک بار مفتی صاحب گولڑہ شریف گئے۔ مَیں بھی ہمراہ تھا۔ مفتی صاحب، پیرِ طریقت، مناظرِ اسلام حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہُوئے۔ موجودہ سجادہ نشین بھی ہمراہ تھے۔ فاتحہ کے بعد مفتی صاحب نے دُعا کے لیے پیر صاحب سے درخواست کی، لیکن انہوں نے فرمایا کہ حضرت آپ ہی دُعا فرمائیں۔ مفتی صاحب نے دُعا فرمائی۔ فاتحہ سے فراغت کے بعد کھانا لایا گیا۔ کھانے میں حلوہ بھی تھا۔ مفتی صاحب چونکہ شوگر کے مریض تھے، اس لیے حلوہ کھانے سے معذرت فرمائی۔ پیر صاحب نے کہا مفتی صاحب، حلوا اور مل تو قومی اتحاد کا نشان ہے، اس لیے آپ کو حلوہ ضرور کھانا چاہیے۔ مفتی صاحب نے جواباً فرمایا: مٹھاس مجھ میں پہلے سے موجود ہے، اس لیے مَیں میٹھا نہیں کھاتا۔ آخر میں پیر صاحب کے اصرار پر ایک لقمہ تناول فرمایا۔

رانا مُبارک علی۔ خانقاہ سراجیہ۔ کندیاں شریف

www.tezpakistan.com

مولانا سید حامد میاں (جامعہ مدنیہ۔ لاہور)

باکمال شاگرد
کے
باکمال اساتذہ

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو حق تعالیٰ نے جن صفاتِ عالیہ سے نوازا تھا، آج سب اہلِ پاکستان اس کے معترف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم، عقل اور حلم و شجاعت جیسے اوصافِ عالیہ کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ یہ اوصاف جمع ہوں، مگر تقویٰ نہ ہو، تو بھی یہ کمالات ایک نقص کا نشانہ رہتے ہیں اور اعتدال میں بہت کمی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تقویٰ کی نعمت سے بھی مالا مال کیا۔ خداوندِ کریم نے انہیں موقع بخشا کہ وہ اپنے علاقے کے ایک بزرگ سے فیضیاب ہوئے اور منازلِ طے کریں۔

اساتذہ

حضرت مفتی صاحب نے بہترین اساتذہ سے علوم حاصل کیے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اساتذۂ کرام کا تذکرہ بھی کر دیا جائے:

۱۔ حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف پڑھی۔

مولانا فخر الدین صاحب ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف وغیرہ پڑھی تھی۔ اس زمانے میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ صاحب مالٹا میں اسیر تھے۔ مولانا فخر الدین صاحب نے جب مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھانا شروع کیا، تو معقولات و فلکیات کی مشکل کتابیں بھی پڑھاتے رہے۔ انہیں تمام علوم میں درجۂ کمال حاصل تھا۔

مدرسہ شاہی کا یہ نام اس لیے ہے کہ وہ شہر کے وسط میں ایک مسجد کے گرد بنایا گیا ہے۔ یہ مسجد شاہی دور کی ہے۔ اس مدرسے کی بنیاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، اس لیے اس کا دوسرا نام جامعہ قاسمیہ ہے۔ اور جب بنیاد رکھنے کے لیے اپیل کی گئی، تو کہتے ہیں کہ پردیسی نے سب سے پہلے چندہ دیا تھا اور عربی میں پردیسی کو وہاں غریب کہتے ہیں، اس لیے اس کا نام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسۃ الغربا رکھا تھا۔ یہ نام وہاں پتھر پر درج ہے اور روداد میں بھی لکھا جاتا ہے، لیکن لیٹر پیڈ وغیرہ پر صرف جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی تحریر ہے۔ یہ وجہِ تسمیہ عوام سے سنی گئی ہے، لیکن جامعہ قاسمیہ مراد آباد کی رُوداد ۱۲۹۶ھ میں یہ وجہ تحریر ہے کہ جب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے مراد آباد تشریف آوری کے موقع پر مدرسہ قائم کرنے کی درخواست کی گئی، تو آپ نے فرمایا تھا:

"اگر تم چند آدمی متفق ہو کہ غربا سے چندہ لینا شروع کر دو اور امراء میں سے جو صاحب بنظرِ ثواب شریک ہوں، ان کو شریک کر دو، تو خدا کے

www.tezpakistan.com

فضل سے امید ہے کہ ایک رقم معقول جمع ہو جائے اور پھر اللہ پر بھروسہ فرما کر یوں فرمایا کہ جاؤ اس کام میں جلدی کرو۔ اول ایک مدرسِ عربی جو جملہ کتبِ درسیہ پڑھا سکے، اس کو بہ تنخواہ مقرر کر کے مدرسہ جاری کر دو اور انتظام اس کا غرباء ہی کی رائے پر چھوڑ دو۔"

اس کے بعد مدرسہ قائم ہوا جو ماہ صفر ۱۲۹۶ھ سے آج تک جاری ہے۔ والحمد للہ تعالیٰ۔ اس درس گاہ سے بڑے بڑے علما فارغ التحصیل ہوئے۔ سابق صدر مہتمم دار العلوم دیوبند مولانا حافظ احمد صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہما کے صاحبزادے اور موجودہ مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کے والدِ ماجد تھے، یہیں کے فاضل تھے۔ مفتیٔ اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا عبد الغفور صاحب غزنویؒ (سابق قاضی القضاۃ غزنی) حضرت مولانا محمود صاحب طرزیؒ (سابق وزیرِ اعظم افغانستان) یہ سب حضرات اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ نے اس معیاری درس گاہ میں بہت طویل عرصہ پڑھایا کہ مراد آباد ہی گویا ان کے لیے وطن بن گیا۔ ۴۴ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانۂ اسارت میں اور پھر ان کی وفات کے بعد سے لے کر خود اپنی وفات تک دار العلوم دیوبند میں بخاری شریف پڑھاتے رہے۔ دار العلوم کے شیخ الحدیث رہے اور جمعیۃ علمائے ہند کے صدر رہے۔ انہوں نے بخاری شریف (مراد آباد اور دیوبند میں ملا کر) تقریباً ساٹھ سال پڑھائی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں علالت بڑھنے پر مراد آباد گئے۔ وہیں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ۔ تاریخ وفات ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ ہے۔

مدارسِ عربیہ میں ریٹائرمنٹ اور عمر زیادہ ہو جانے پر عالم کی صلاحیتیں ختم ہو جانے کا عقیدہ نہیں ہے، اس لیے ہر عالم بحمد اللہ تا وفات پڑھاتا رہتا ہے۔ اس کی جسمانی کمزوری کی یہ رعایت کر دی جاتی ہے کہ اسباق کی تعداد کم کر دی جاتی ہے۔ مولانا فخر الدین صاحب کی وفات ان دنوں میں ہوئی جب مفتی صاحب وزیرِ اعلیٰ ہونے ہی والے تھے۔ تقریبِ وزارت کے موقع پر (جمعیت علمائے اسلام) موجودہ نظام العلماء کے سب اراکین وغیرہ پشاور گئے تھے۔ میں نے اسی موقع پر حضرت مفتی صاحب کو ان کی وفات اطلاع دی تھی۔

۲۔ حضرت مفتی صاحب کے دوسرے استاذِ جلیل حضرت مولانا عجب نور صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ مولانا عجب نور صاحب بنوں کے رہنے والے تھے۔ علومِ عقلیہ کی تحصیل ریاست بھوپال میں نہایت قابل اساتذہ سے کی تھی۔ فلکیات میں بہت مہارت تھی۔ خود بھی بہت مطالعہ کرتے تھے اور ایسے طلبہ سے بہت خوش رہتے تھے جو اُن سے دورانِ سبق میں دقیق سوالات کرے۔ گزشتہ پڑھی ہوئی کتابیں یاد ہوں اور مطالعے کا عادی ہو۔ وہ سوالات کی کثرت سے خوش ہوا کرتے تھے۔ علمِ فلکیات کی کتاب تصریح پڑھاتے وقت مابین السطور بھی پڑھایا کرتے تھے۔ بہت جسیم اور جہیر الصوت تھے۔ تقسیم کے بعد اپنے وطن بنوں تشریف لے آئے اور مدرسہ معراج العلوم کی بنیاد ڈالی۔ مدرسہ شاہی میں ۴۴ء میں انہیں حدیث کی بڑی کتاب مسلم شریف دی گئی۔ حدیثِ پاک ایسا مضمون ہے جس میں بے حد حلاوت اور وسعت ہے؛ چنانچہ جب انہوں نے معراج العلوم کی بنیاد ڈالی، تو وہاں بخاری شریف بھی خود پڑھاتے رہے اور سب علوم و فنونِ عقلیہ سے ان کی طبیعت کلیتہً ہٹ گئی۔

مولانا عجب نور صاحب سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے فلسفہ، منطق (معقولات)، کی بڑی کتابیں، فلکیات کی کتابیں اور فقہ حنفی کی مہتم بالشان کتاب "ہدایہ اخیرین" پڑھی۔

۳۔ والدِ محترم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے علمِ ادب (عربی) کی تمام کتابیں پڑھیں اور حدیث کی اہم کتاب ترمذی شریف پڑھی۔

۴۔ جامعہ قاسمیہ میں حضرت مولانا قاری محمد عبد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسِ قرأت و تجوید تھے۔ ان سے حضرت مفتی صاحب نے قرأتِ سبعہ و عشرہ پڑھیں۔

مولانا قاری عبد اللہ صاحب تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ علمِ قرأت پر کمال درجے کا عبور تھا۔ حضرت اقدس مولانا اشرف تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ مجھے عرصے سے مسئلہ "ضاد" میں اشکال تھا جو کسی سے حل نہ ہوتا تھا؛ حتیٰ کہ عزیزی قاری عبد اللہ آئے۔ حضرت تھانویؒ کے مجموعۂ فتاویٰ کے پہلے نسخوں میں اس مضمون کا نوٹ تھا جو بعد کے نسخوں میں حذف کر دیا گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس پر اظہارِ افسوس فرماتے تھے۔ قاری عبد اللہ صاحب کو خداوندِ کریم نے نہایت اعلیٰ سیاسی بصیرت بھی بخشی تھی۔ ایسی بصیرت کہ جس کی تعریف حضرت مفتی صاحبؒ آخر وقت

www.tezpakistan.com

تک کرتے رہے۔ انہوں نے انگریز کے دور میں تحریکِ آزادی میں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائی تھیں۔

یہ سب حضرات جو اعلیٰ درجے کے اہلِ علم و کمال تھے، حضرت مفتی صاحب کے بڑے اساتذہ تھے، مگر کسی صاحبِ کمال سے کچھ حاصل کرنا حاصل کرنے والے کی اپنی صلاحیت پر موقوف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت مفتی صاحب کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ ان کا کمال تھا۔

تعظیمِ اساتذہ

علومِ دینیہ میں جب تک اساتذہ خوش نہ ہوں یا طالبِ علم کے دل میں اساتذہ کی محبت و عظمت نہ ہو، اس وقت تک علم حاصل کرنے والے سے آگے سلسلۂ فیض نہیں چلتا۔ حضرت مفتی صاحب ایسے ہی خوش قسمت تھے کہ جن سے اساتذہ خوش تھے اور وہ اساتذہ کا بہت احترام کرتے تھے۔

۷۰ء میں میری خوش دامن صاحبہ دیوبند سے لاہور تشریف لائی ہوئی تھیں۔ مفتی صاحب بھی جامعہ مدنیہ میں تشریف لائے۔ جب انہیں ان کی موجودگی کی اطلاع ہوئی، تو فوراً ان کے لیے ہدیہ ارسال فرمایا۔ میں نے منع کیا، تو فرمایا کہ آخر وہ میرے استاد (حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ) کی اہلیہ ہیں۔ میرے لیے بہت قابلِ احترام ہیں۔

۱۹۶۷ء میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے، تو حضرت مفتی صاحب جامعہ مدنیہ میں حاضرِ خدمت ہوئے اور دو دن قیام فرمایا۔ ان کے ساتھ ۶۵ء کے محاذِ لاہور کے نشانات، شالامار اور مقبرۂ جہانگیر وغیرہ مقامات دیکھے۔

اسی تعلق کی بنا پر جب مفتی صاحب وزیرِ اعلیٰ ہوئے، تو والد صاحب نے انہیں ایک گرامی نامہ تحریر فرمایا جس میں مبارکباد کے ساتھ تقوے پر قائم رہنے کی تلقین تھی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے رہبری ہوتی رہے گی، کیونکہ ایک مقام تک پہنچ جانا آسان ہے اور قائم رہنا مشکل ہے۔ اتنا مضمون مجھے یاد ہے۔ مضمون کی تقویت کے لیے جس آیت سے استدلال فرمایا گیا تھا، وہ یہ تھی:

یاایھا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً۔ (پ۹ سورۂ انفال)

میں نے ان کا یہ گرامی نامہ مفتی صاحب کو لاہور سٹیشن پر پہنچایا جب وہ وزیرِ اعلیٰ سرحد بننے کے بعد ریل سے سفر کر رہے تھے اور سٹیشنوں پر استقبال کیا جا رہا تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے بتایا کہ جس زمانے میں والد صاحب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" لکھ رہے تھے، تو ایسا بھی ہوتا رہا کہ انہوں نے اس کے مسودے کو صاف کر کے لکھا ہے۔

۱۹۴۱ء تک مفتی صاحب جامعہ قاسمیہ میں رہے ہیں۔ ان دنوں میں قرآن پاک کی تعلیم سے فارغ ہوا تھا۔ فارسی قواعد کا مروجہ رسالہ جس کا نام رسالۂ نادر ہے (اور وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے والد صاحب کی تصنیف ہے جو دارالعلوم دیوبند میں مدرس فارسی تھے) والد صاحب نے مجھے شروع کرایا۔ پھر مفتی محمود صاحب سے فرمایا کہ وہ مجھے اس رسالے کا سبق پڑھا دیا کریں۔ مجموعی طور پر میں نے اس کتاب کے اندازاً چھ سات سبق پڑھے تھے، پھر یا تو سالانہ چھٹیاں ہو گئیں یا باقاعدہ فارسی کی کلاس میں داخلہ ہو گیا۔

ہمارا وطن تو دیوبند ہے اور میں نے وہیں قرآنِ پاک کی تعلیم شروع کی تھی، لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مراد آباد میں مدرس تھے، اس لیے میں نے بھی جامعہ قاسمیہ ہی میں پڑھا ہے۔ پھر آخری دو سال دارالعلوم دیوبند میں پڑھ کر تکمیل کی ہے۔

غرض مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس وقت کا تعارف حاصل ہے۔ پھر پاکستان آنے کے بعد سے تاحیات تعلقات رہے اور وہ میرے ساتھ اسی طرح حسنِ سلوک فرماتے رہے جیسے کسی استادزادے کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، بلکہ میری اولاد کے ساتھ بھی اسی طرح بہت ہی زیادہ شفقت و محبت کا سلوک فرماتے رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

تصوف، تدریس اور افتاء

بہارِ عالمِ حسنش دو عالم تازہ میدارد برنگ اربابِ صورت را بہ بو اربابِ معنی را

www.tezpakistan.com

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۴۱ء میں فراغت کے بعد بہت محنت سے تمام علوم کی تدریس میں مشغول رہے، لیکن عشقِ مذہب اور حبِ وطن کے تقاضوں کے تحت سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں حصہ لیا اور اسیر رہے۔

۱۹۴۱ء کے بعد ہی کا زمانہ ہے جب حضرت مفتی صاحب نے اپنے علاقے کے ایک بزرگ شیخ طریقت سے منازلِ سلوک طے کیں اور طریقہ نقشبندیہ میں مجاز ہوئے۔

مفتی صاحب کے آخری دور کی سیاسی شہرت سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک سیاسی لیڈر ہی تھے؛ حالانکہ وہ بہت بڑے مدرس بھی تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ کے علاوہ فلکیات، فلسفہ اور منطق کے قابل ترین استاذ تھے۔ حق تعالیٰ نے سب علوم میں، کمال اور دقتِ نظر سے نوازا تھا۔ وہ اس دور کے بہت ہی بلند پایہ فقیہہ و مفتی بھی تھے۔ ان مشاغل کے ساتھ منصبِ افتاء پر بھی فائز رہے اور مدرسہ قاسم العلوم میں ان کے ہاتھ سے بیس ہزار سے زائد فتاویٰ تحریر ہوئے۔

ان سب کمالات میں جان ڈالنے والی چیز تقویٰ اور وہ معرفتِ الٰہیہ تھی جو ذکرِ الٰہی اور مراقبات سے مبدءِ فیاض سے عطا ہوا کرتی ہے۔ ایسا انسان ضرور مافوق الفطرت ہو جاتا ہے ؎

فان العلم نورٌ من الٰہ ونور اللہ لا یعطی لعاص

رویتِ ہلال، عائلی قوانین، مشینی ذبیحہ وغیرہ ایسے مسائل تھے جو پوری قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ان مسائل پر رائے دی، تو وہ اخبارات میں شائع ہوئی اور ان کی بالغ نظری اور بلند ترین فقہی مقام ملک کے سب علما کے سامنے آیا۔ اور اب آخر میں مسائل زکات پر گفتگو چل رہی تھی۔

غرض بنیادی طور پر حضرت مفتی صاحب ایک اعلیٰ مدرس، فقیہہ وقت، عارف باللہ اور متقی تھے؛ لیکن ایوب خاں کے آخری دور سے قیادتِ حزبِ اختلاف اور قیادتِ تحریکِ نظامِ مصطفیٰ تک وہ عوام میں بحیثیت لیڈر معروف ہو گئے اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی کامیاب قیادت مذکورہ بالا بنیادوں پر مبنی تھی۔ اگر کوئی ان جیسا بننا چاہے تو اسے یہی راہ اختیار کرنی ہوگی؛ ورنہ وہ فقط سیاسی شخص ہو کر رہ جائے گا۔ ان کی زندگی ان کے بعد والوں کے لیے سبق ہے اور اصولاً یہی مذہبی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

احیاءِ جمعیۃ

حضرت مفتی صاحب کا تعلق اکابر جمعیۃ علمائے ہند سے تھا۔ وہ سب حضرات مذکورہ بالا اوصاف کے حامل تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس جماعت سے تعلق رکھنے والے بزرگ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مغربی پاکستان کے قلب لاہور میں تشریف فرما تھے۔ مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی، مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی اسی جمعیت کے پرانے ارکان و عہدیداران رہ چکے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے ان سب حضرات کو ملتان میں جمع کیا۔ ان کے ساتھ پورے ملک کے چیدہ چیدہ علما کو مدعو کیا۔ اراکینِ جمعیت علمائے اسلام (جن کے قائد علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ رہ چکے تھے) کو بھی مدعو کیا۔ یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ میں خود بھی اس میں شریک تھا۔ یہ اجلاس حاجی باران خاں کی زیرِ تکمیل کوٹھی میں ہوا۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب کو امیر منتخب کیا گیا اور دیگر عہدیداران کا بھی انتخاب ہوا۔ اجلاس میں شریک مولانا غلام غوث صاحب کو ناظم منتخب کیا گیا۔ یہ سب کارروائی مولانا مفتی محمود صاحب نے کی تھی جو وقت اور ضرورت کے عین مطابق تھی۔ کام کرنے والے سب علما مجتمع ہو گئے اور جمعیت کا احیا ہو گیا۔ خداوندِ کریم نے مفتی صاحب کی اس کوشش کو بارآور کیا۔ تمام علماء ان حضرات کی سرکردگی میں دینی اور سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مفتی صاحب کی اپنی جماعت یہی تھی اور ہے اور ان شاء اللہ رہے گی۔ یہ جماعت ان کے باقیاتِ صالحات میں سے ہے اور ان کے لیے صدقۂ جاریہ۔ رحمۃ اللہ۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب تحریکِ شیخ الہند میں کام کر چکے تھے۔ انگریزوں کی سی آئی ڈی کی رپورٹ میں ان کے بارے میں لکھا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"مولوی عبداللہ سندھی کابل میں مولوی عبید اللہ سے جو فتاویٰ اور خطوط لایا تھا، وہ ایم احمد علی کے لیے تھے جس نے تمام خطوط وغیرہ

www.tezpakistan.com

مکتوب الیہم میں ٹھیک تقسیم کرادیے تھے۔ اس کا رابطہ محی الدین عرف برکت علی آف قصور، خواجہ عبدالحی آف گورداسپور، ڈاکٹر صدرالدین، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی وغیرہ وغیرہ سے تھا۔ جنودِ ربانیہ[1] کی فہرست میں وہ کرنل ہے۔ بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ایم احمد علی اتحادِ اسلامی کی سازشِ جہاد کا ایک سرگرم ممبر تھا۔ نظارۃ المعارف میں اس کی رہائش گاہ وقتاً فوقتاً سازشیوں کے لیے ملنے اور سازشیں گھڑنے کے لیے مرکز کا کام دیتی تھی اور آزاد علاقہ کو جانے اور وہاں سے واپس آنے والے سازشی اس میں ٹھہرا کرتے تھے۔"

تحریکِ شیخ الہندؒ ص ۳۹۱ (انڈیا آفس لندن میں محفوظ ریکارڈ کا اردو ترجمہ)

اس وقت موجود حضرات میں حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی امارتِ جماعت کے لیے سب سے موزوں تھے انہیں امیر منتخب کیا گیا۔ دیگر عہدیداران کا بھی انتخاب ہوا۔

اسلامی طرزِ سیاست

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جس جماعت کے ساتھ زمانۂ طالب علمی سے وابستہ ہوئے تھے، وہ یہی جماعت تھی۔ علم اور تقویٰ کی طرح سنجیدگی اور اعتدالِ فکر اس جماعت کی شان رہی ہے۔ (۱) اس جماعت میں علما کی طرح سجادہ نشین حضرات اور دیگر تعلیم یافتہ طبقے اور عوام ہی شامل رہتے آئے ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی حیاتِ طیبہ اور ان کی تحریک ریشمی رومال کے مطالعے سے جمعیت کے ماضی قریب کی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

(۲) اس جماعت میں ہمیشہ بکثرت اہل اللہ شامل چلے آئے ہیں۔

(۳) افراط و تفریط، بدزبانی، بیہودہ گفتگو، ترش روئی، سب و شتم، تکفیر وغیرہ جیسی چیزیں اس جماعت کے مزاج کے خلاف ہیں۔ ایثار و قربانی، بے لوثی، للّٰہیت اس کا طرۂ امتیاز ہے جبکہ آج کل مسلم ممالک میں بھی انگریزی سیاست ہی مروج ہے جس میں افراط و تفریط، بدزبانی، جھوٹ وغیرہ سب لوازمِ سیاست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی سیاست سے اسلام نے منع فرمایا ہے۔ یہ آج سے چودہ سو سال پہلے بھی کافروں کی سیاست تھی اور آج بھی ہے، مگر اسلام نے اسے سمجھنا ضروری اور اس کا استعمال ممنوع قرار دیا ہے۔ آخری دور میں آپ نے دیکھا کہ بھٹو صاحب نے دولتانہ اور قیوم خاں کا کس کس قسم کا مذاق اڑایا اور پھر انہیں ہی عہدے دیے۔ یہی آج کل کی رائج الوقت سیاست ہے۔

کہا جاتا ہے: "سیاست میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔" یہ غیر اسلامی سیاست کا وہ بھانک ہے جس میں عہد شکنی بھی داخل ہے۔ اسلام نے اس کے بالمقابل ایک اصول بتلایا ہے کہ غیر مسلموں کے عہد و پیمان پر بالکل بھروسہ نہ کرو، لیکن اخلاقی برتری قائم رکھتے ہوئے خود کوئی عہد شکنی نہ کرو۔ عہد شکنی اکبر کبائر میں ہے۔ معاہدے کے بعد ان پر اچانک حملہ ناجائز ہے۔

اسلام کا مارشل لا اور خارجہ معاملات کس قسم کے ہوں، اس کے متعلق امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی "سیر کبیر" ملاحظہ ہو۔ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح سمیت یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔

ہمارے اکابر کا اصول وہی رہا ہے جو اسلام نے بتلایا ہے کہ کافروں کے مکر و فریب، داؤ پیچ کو سمجھو اور ان کے وعدوں وغیرہ پر اعتماد نہ کرو۔ بدزبانی اور لغوبات سے احتراز کرو۔ ایثار و للّٰہیت اور بے لوثی پر عمل پیرا رہو۔ حضرت مفتی صاحب کو سب سے زیادہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت تھی۔ ان کا طرزِ سیاست جو پُر اعتدال تھا، انہوں نے اپنا رکھا تھا۔ ان کا پُر اعتدال ہونا لفظی دعویٰ نہیں ہے، ایک حقیقت ہے

(نامکمل)

---

[1] جنودِ ربانیہ: حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تنظیم کا خفیہ نام ہے جس میں جناب حاجی صاحب ترنگ زئی رحمۃ اللہ علیہ بھی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ وہ جنودِ ربانیہ میں لیفٹیننٹ جنرل تھے۔ (تحریکِ شیخ الہند ص ۴۲۶) کوہستانی مُلّا یا فقیر جو سوات میں سندا کی مُلّا کے نام سے معروف تھے، جنودِ ربانیہ کے لیفٹیننٹ جنرل تھے۔ (تحریکِ شیخ الہند ص ۴۳۹)

www.tezpakistan.com

لطف الرحمٰن
(میٹرک کے طالب علم ہیں)

ابا جان گھر آتے ہی کہتے، مجھے دیہاتی کھانا کھلاؤ ــــ آج پرہیز نہیں ہوگا

ابا جان کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے بیٹھا ہوں تو سوچ میں پڑ گیا ہوں مضمون کا آغاز کیسے کروں۔ ان کی زندگی کے جس پہلو نے مجھے اس کم عمری میں سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی تھی۔ کپڑا ہو یا کھانا کسی معاملے میں خصوصی اہتمام کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ اپنے گاؤں عبدالخیل آتے تو ملنے والے اُمنڈ پڑتے، بیٹھک میں چارپائیاں بچھ جاتیں۔ ابا جان لوگوں کے درمیان ایک کھری چارپائی پر بیٹھ جاتے اس پر بستر وغیرہ بچھانے کا تکلف نہ کرتے۔ اس کے بعد بے تکلفانہ گفتگو چھڑ جاتی۔ گاؤں کے مسائل زیر بحث آتے، ہنسی مذاق ہوتا۔ یہ سلسلہ دن بھر چلتا رہتا۔ اس محفل میں بیٹھنے والے کو یہ مطلق احساس نہ ہوتا کہ مفتی صاحب کوئی بہت بڑے عالم یا سیاسی لیڈر ہیں جب تک محفل میں ایک آدمی بھی موجود ہوتا میرے ابا کھری چارپائی پر بیٹھے رہتے۔ سب کے جانے کے بعد اُٹھ کر گھر جاتے۔ اس طرح عام طور پر انہیں آدھی رات کے بعد گھر جانا نصیب ہوتا ــــ لیکن کیا مجال جو انہوں نے کبھی لوگوں کی شکایت کی ہو یا ہجوم سے گھبرائے ہوں۔

گھر میں عورتوں کا ہجوم رہتا، ابا سب سے ان کی خیریت دریافت کرتے اور اگر ان کا کوئی عزیز، رشتہ دار بیمار ہوتا یا انہیں ابا جان سے کوئی کام ہوتا تو وہ اس کے بارے میں ان سے استفسار فرماتے اور ان کی مدد کرتے۔

ابا جان کو یوں تو ہم سب بچوں سے بے حد پیار تھا لیکن چھوٹا ضیاء الرحمٰن انہیں دوسروں کی نسبت زیادہ عزیز تھا۔ جب تک گھر میں ہوتے، وہ ان کے ساتھ رہتا۔ ابا اسے عربی کی دعائیں یاد کراتے اور جب وہ انہیں یاد کرکے فر فر سناتا تو بہت خوش ہوتے اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہتے: اس لڑکے جیسا ذہین بچہ میں نے نہیں دیکھا۔ ابا جان کو ہماری دینی تعلیم کا بہت خیال رہتا۔ کبھی کبھار تو وہ یہاں تک کہتے کہ انگریزی تعلیم تو تعلیم نہ دینے کے برابر ہے۔

ابا جان لسی، دودھ، دہی اور مکھن بڑے شوق اور رغبت سے کھاتے اور اسے دیہاتی کھانا کہتے۔ باہر سے جب بھی عبدالخیل آتے تو امی سے کہتے، آج تو مجھے دیہاتی کھانا کھلائیں، شہروں کے کھانے سے تنگ آ گیا ہوں ــــ بہت پرہیز کر لیا، آج پرہیز نہیں ہوگا۔

امی اگر ان سے ہماری شکایت کرتیں اور کہتیں کہ ان بیٹوں کو ذرا سیدھا کریں، تو ابا جان ہنس دیتے اور فرماتے: انہیں سیدھا کرنے کے لیے آپ کیا کم ہیں، میں ایک آدھ دن کے لیے آیا ہوں، خواہ مخواہ ان پر کیوں غصہ کروں۔

ابا جان بیمار تھے، لیکن دوا کبھی وقت پر نہیں کھائی۔ جب یاد آجاتی یا فرصت نصیب ہوتی، دوا مانگ لیتے اور کسی قدر ناراضی سے کہتے، آپ بھی

www.tezpakistan.com

عجیب لوگ ہیں مجھے دو اتک یاد نہیں کراتے۔

ابا جان گھر سے باہر ہمیشہ لوگوں کے ہجوم میں گھرے رہتے۔ کئی ضرورت مند سفارش کرانے کے لیے آتے، ابا جان بڑی خندہ پیشانی سے ان کے ساتھ پیش آتے اور ان کی مشکلات رفع کرنے کے لیے حتی المقدور کوشش کرتے۔ گھر میں اگر اماں یا کوئی اور گاؤں کے کسی آدمی یا عورت کے متعلق ان سے سفارش کے لیے کہتا تو بُرا مناتے اور کہتے کیا یہ لوگ خود مجھے نہیں پہچانتے کہ انہوں نے آپ کا سہارا ڈھونڈا۔ ایک دفتر باہر ہے، دوسرا آپ نے گھر میں بنا دیا ہے۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیے، میرے لیے باہر والا دفتر ہی کافی ہے۔

ظہور احمد

مفتی صاحب میری گاڑی میں سوار ہوتے، مَیں ان کا "ڈرائیور" تھا!

مولانا مفتی محمود سے میری نیاز مندیوں اور عقیدتوں کی کہانی کہاں سے شروع کی جائے، تو چلیے یہاں سے شروع کر لیں جب مَیں جُبے قبے اور لمبی ڈاڑھیاں دیکھ کر گھبرا جاتا تھا، ہر چند کہ ثواب طاعت و زہد کو جانتا تھا پر کبھی طبیعت اِدھر آنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ مذہبی گھرانے کا آدمی ہونے کے باوجود جب مذہبی پابندیوں کا تصور آتا، تو مجھے اختلاج ہونے لگتا۔

حضرت مولانا عبید اللہ انور ہمارے پورے گھرانے کے مُرشد ہیں، ۱۹۷۶ء کے آخر میں الیکشن کی تیاریاں شروع ہوئیں، تو انہوں نے میری ڈیوٹی حضرت مولانا مفتی محمود کے ساتھ لگا دی۔ مرشد کا حکم سر آنکھوں پر بجا لایا، اور مفتی صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ ان دنوں مَیں گاڑیوں کا کام کرتا تھا۔ اس کام میں نئی نئی گاڑیوں کی بہت سہولت تھی۔ مفتی صاحب میری گاڑی میں سوار ہوتے اور مَیں ڈرائیونگ کرتا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ناکہ سفر اور دسترخوان پر آدمی پہچانا جاتا ہے، تو انہی دو مرحلوں پر مفتی صاحب بھی پہچانے گئے اور یوں پہچانے گئے کہ مَیں بن داموں ان کے ہاتھ بک گیا۔ میرا دماغ میرا دل میری رُوح ان کے حُسنِ اخلاق اور ان کے مضبوط و پاکیزہ کردار کے صدقے رہن ہو گئے۔ اب مجھے پچھتاوا تھا ان دنوں پر، پشیمانی تھی ان لمحوں پر جب مَیں "مولویوں" سے گھبراتا تھا۔

مَیں نے ڈرائیور کی حیثیت سے مفتی صاحب کے ساتھ تقریباً پورے پاکستان کا سفر کیا اور اُس مفتی محمود کو دیکھا جسے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہو گا۔ کبھی کبھی تو ان کی ہمت اور جرأت میری حیرانی بن جاتی۔ بہت طویل سفر کے بعد رات گئے بھی اور صبح مین فجر کے وقت بھی انہیں مصلّے پر اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتے دیکھا۔ بیماری اور بڑھاپے کے باوجود چہرے پر تکان کے آثار کبھی نہ دیکھے گئے۔ ایک مرتبہ بہت

www.tezpakistan.com

لمبے سفر کے بعد ہم لوگ ساہیوال میں ٹھہرے اور وہیں بسرام کیا۔ مفتی صاحب کے ساتھ والے پلنگ پر مَیں لیٹا ہوا تھا۔ آپ یقین کیجیے احترام کے مارے بالکل نیند نہیں آئی۔ رات کے آخری پہر اٹھا اور زمین پر مفتی صاحب کی پائنتی کی طرف مصلّے پر لیٹ گیا، ان کے قدموں میں لیٹتے ہی نیند آگئی۔ دل کو سکون آجائے، تو نیند آ ہی جاتی ہے۔

مَیں گاڑی ڈرائیو کرتا، تو اللہ کا ذکر کرتے یا پھر مُلک و ملّت کے بارے میں سوچ بچار، کبھی کبھی پُوچھتے کہ تم میرے ساتھ دُور دراز کے سفر پر نکل پڑتے ہو، تمہارے کاروبار کا حرج نہیں ہوتا؟ مَیں کہتا آپ کی خدمت کے مقابلے میں کاروبار کا حرج کیا حیثیت رکھتا ہے؟ بہت کم بڑوں میں یہ وصف دیکھا ہے کہ اپنے سے چھوٹے لوگوں کا خیال رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب بھی انہی بڑے انسانوں میں سے ایک تھے۔ ایک مرتبہ گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، مَیں رقم دینے لگا، تو میرا ہاتھ روک دیا۔ اپنی جیب سے دو صد روپے نکالے، پٹرول پمپ والے نے پچاس روپے واپس کیے، تو وہ مجھے عنایت کر دیے اور فرمایا کہ بچّوں کے لیے مٹھائی لے جانا۔

ہر ملاقات پر میرے بچّوں کی خیریت ضرور دریافت کرتے۔ میرے بڑے بچّے عمر فاروق سے ازراہِ شفقت پوچھتے کہ بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ وہ کہتا "پائلٹ"، تو مسکرا کر اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہتے "اللہ کے بندے، ہم سے تو ایک پائلٹ ہی نہیں سنبھلتا"۔ اُن کا اشارہ اُس معروف سیاستدان کی طرف ہوتا جو پاک فضائیہ میں بہت اُونچے عہدے پر رہ چکے ہیں۔

وہ سی ایم ایچ سے آپریشن کے بعد لاہور تشریف لائے، تو مَیں ہی ان کا پرائیویٹ ڈسپنسر ہوتا۔ ان کے پاؤں کی پٹّی کرتا، پیشاب ٹسٹ کرواتا، انہوں نے پاؤں کا آپریشن بھی پاؤں سُن کیے بغیر کروایا تھا۔ ایک دن پٹّی کرتے ہوئے مَیں نے دیکھا چھ انچ لمبا زخم تھا۔ آج کل تو جسم کے زخموں کے علاوہ رُوحانی اعتبار سے بھی وہ زخم زخم تھے۔ مگر بہ ایں ہمہ ان کی طبعی شگفتگی کبھی ماند نہ پڑتی۔ ایک بار مَیں کچھ وقفے کے بعد ان کی

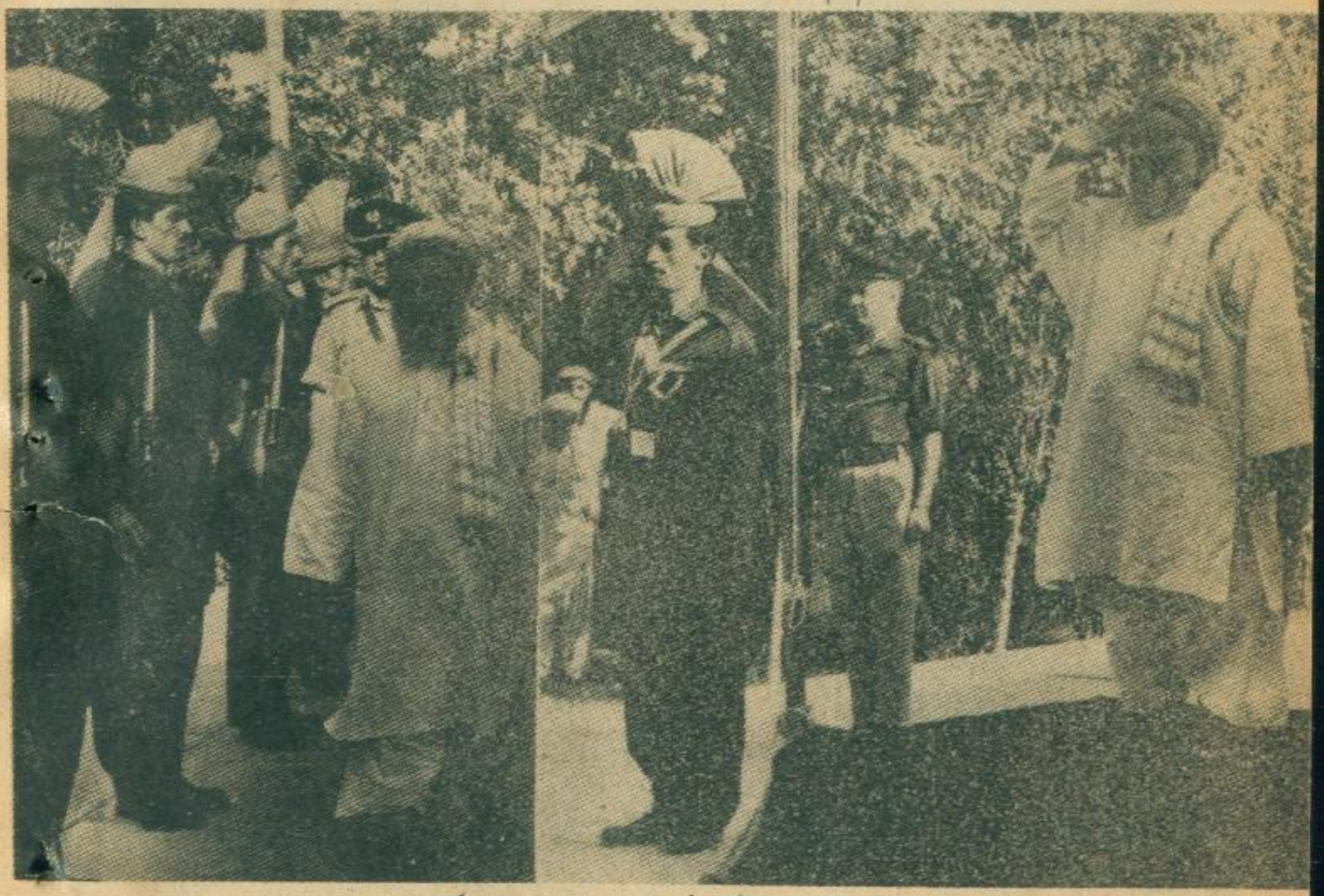

صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے گارڈ آف آنر کی سلامی اور معاینہ

www.tezpakistan.com

خدمت میں حاضر ہوا، تو اپنے خاص انداز سے دونوں ہاتھ مختلف سمتوں میں ایک دوسرے پر رکھ کر فرمایا "ظہور، تم مجھے بہت پریشان کرتے ہو۔" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا "حضرت، مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے؟" وہ مسکرائے اور فرمایا "تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگتا، تم کہاں غائب ہو جاتے ہو۔" اب ہم انہیں کیسے بتائیں کہ ان کے بغیر ہمارا دل کتنا اُداس ہے، ہماری رُوح کتنی بے چین ہے؟

مَیں نے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھا ہے، ان کی افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں سے مزیّن وسیع و عریض کوٹھیاں بھی دیکھی ہیں، ان کے غیر مُلکی اور قیمتی لباس پر بھی نظر ڈالی ہے، مگر یہ سادہ سے لباس اور سادہ سی معاشرت والا آدمی سب سے زیادہ جچتا تھا، سب میں جچتا تھا۔ اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس ہوئی، تو پنڈی جانے کے لیے ملتان سے لاہور کے ایئرپورٹ پر اُترے۔ آرام کے لیے جناب غلام دستگیر کی کوٹھی پر گئے۔ مَیں نے دیکھا چلنے میں پاؤں ذرا گھسٹتے ہیں۔ اس پاؤں گھسٹنے کی وجہ یہ تھی کہ جُوتا بہت پُرانا ہو کر کُھل گیا تھا۔ مَیں نے نئے جُوتے کے لیے کہا، مگر مسکرا کر ٹال دیا۔ عرض کیا کہ آپ اتنی اہم کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں، لوگ کیا کہیں گے؟ فرمایا: مَیں فقیر آدمی ہوں، مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ مَیں نے اس دوران ان کا پُرانا جُوتا اٹھایا اور اس کے ناپ کا نیا جُوتا لا دیا۔ دستگیر صاحب نے جُوتے کی قیمت دینا چاہی، تو مَیں آبدیدہ ہو گیا کہ وہ مجھے اس سعادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے رُوئے سُخن دستگیر صاحب کی طرف کیا اور فرمایا: "اس کا دل نہ توڑو"۔ وہ پُرانا جُوتا آج تک میرے پاس محفوظ ہے، اسے مَیں نے سرمایۂ حیات بنا کر رکھا ہوا ہے۔ بڑے آدمی کی جُوتی بھی تو بڑی ہوتی ہے۔

پھر میری آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا ہے کہ وہ شیرِ سیاست بچّوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا ہے۔ ہُوا یوں کہ ایک جمعہ کے روز ان کے پاؤں پر سُوجن اتنی تھی کہ چلنا تو درکنار، ہلنے جلنے کا یارا بھی نہ تھا۔ ڈاکٹروں نے بھی چلنے پھرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اس روز انہوں نے دوگانہ گھر پر ہی ادا کیا۔ مَیں جمعہ پڑھ کر آیا، تو دیکھا مفتی صاحب رو رہے ہیں۔ سوچا شاید پاؤں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ وجہ دریافت کی، تو تکلیف پاؤں کی نہیں تھی، رُوح کی تھی۔ فرمانے لگے: "ظہور، خدا جانے مجھے میری کس غلطی کی سزا ملی ہے کہ مَیں آج جمعہ کی نماز کے لیے مسجد نہیں جا سکا۔" پھر وہ دیر تک استغفار کرتے رہے۔

میرے اللہ کا کرم ہے کہ کاروباری آدمی ہونے کے باوجود ان سے کسی دنیاوی مفاد کا لالچ میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا۔ ان کا وجود ہی ہمارے لیے سب سے بڑا مفاد اور سب سے بڑی متاع تھی۔ آج بھی ان کی تحفہ دی ہوئی تسبیح دیکھتا ہوں، تو یہ سب کچھ خواب نظر آنے لگتا ہے۔

یہ جو آپ میرے چہرے پر ڈاڑھی دیکھ رہے ہیں، یہ سب میرے اللہ کا کرم اور مفتی صاحب کا فیضانِ نظر ہے۔ ہُوا یُوں کہ مَیں سی ایم ایچ میں انہیں وضو کروا رہا تھا۔ وہیں اپنے ایک ساتھی کے کہنے پر مَیں نے حج کی خواہش کا اظہار کیا۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "رقم بنک میں جمع کروا دو اور پاسپورٹ میرے پاس لے آؤ۔" مَیں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ دفعتاً کام بن گیا۔ پھر فرمایا: "روضۂ رسولؐ پر کیا ایسا ہی چہرہ لے کر جاؤ گے!" بات دل سے نکلی اور دل میں یُوں اُتری کہ مَیں نے اسی وقت سے ڈاڑھی رکھ لی۔ اس سے قبل مَیں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ مَیں ڈاڑھی رکھوں گا یا مولویوں کی سی وضع قطع بناؤں گا۔

مفتی صاحب نے کہیں اہم پیغام دینا ہوتا، تو مَیں ہی لے کر جاتا، وہ مجھ پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ کہیں میٹنگ ہوتی، تو میری نظر میں میری اہمیت بنانے کے لیے پُوچھتے: "فلاں مسئلہ کا کیا حل ہونا چاہیے یا فلاں بات کیسے ہو گی؟" مَیں بالکل معمولی آدمی ہُوں، تعلیم بھی واجبی ہے اور رموزِ سیاست سے بھی ناواقف ہوں، مگر وہ قرینے اور سلیقے سے میری حوصلہ افزائی فرماتے رہتے۔

۱۹۶۷ء میں میرے والد صاحب ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے تھے، اُن کے بعد مَیں نے خود کو اتنا بے سہارا محسوس نہیں کیا تھا، جتنا اب محسوس کرتا ہوں۔ یُوں لگتا ہے جیسے زندگی کا درخت جڑوں تک ہل گیا ہے۔

سفر میں مَیں اُن کے قریب رہتا تھا تاکہ انہیں آواز دینے کی زحمت نہ ہو، مگر جب وہ ہمیشہ کے لیے جانے لگے، تو مَیں ان سے بہت دُور لاہور میں تھا۔ پھر وہ آواز دیتے بھی کسے؟ ایسی سعید رُوحیں تو اپنے رب سے ملنے کی مشتاق ہوتی ہیں!

www.tezpakistan.com

مولانا محمد عبداللہ (بھکر)

مفتی محمود
کس گھرانے میں
پیدا ہُوئے،
کس ماحول میں
آنکھ کھولی؟

اللہ تعالیٰ نے سادات قندھار کے قبیلے یلین زئی کو یہ شرف عطا فرمایا کہ اس میں حضرت مولانا سید احمد گل شاہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے ولیٔ کامل اور اجل عالم ہُوئے، جن کے فیوض و برکات سے ایک دُنیا مستفیض ہُوئی۔ سادات کا یہ قبیلہ ایک خانہ بدوش قبیلہ تھا، جو سردیوں کے چار مہینے نواحِ قندھار میں خیمہ زن ہوتا اور چھ مہینے پنیالہ ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں قیام کرتا۔ دو مہینے آمد و رفت میں لگ جاتے۔ شاہ صاحب کا بھی یہی معمول رہا، آپ تصوف کے چاروں سلسلوں میں مجاز تھے، مگر اپنے مشائخ کے طریقے کے مطابق سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی تعلیمات کو فروغ دیا۔ اسی سلسلے میں بیعت فرماتے اور طالبین کو تعلیم دیتے تھے، آپ نے ہمیشہ علومِ دینیہ کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ درویشوں اور طالب علموں کی ایک بڑی جماعت آپ کے ساتھ رہتی، آپ کا قافلہ ایک چلتی پھرتی خانقاہ اور خانہ بدوش مدرسہ تھا، پنیالہ کے علاقے میں آپ کے متوسلین کا سلسلہ بہت وسیع تھا، پنیالہ کے رئیس شہاب الدین خاں بھی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔ ایک بار سردیاں گزار کر قندھار کی طرف کوچ کی تیاری میں تھے کہ سخت بیمار ہو گئے۔ نقاہت اتنی زیادہ ہو گئی کہ سفر کے قابل نہ رہے۔ شہاب الدین خان نے موقع غنیمت سمجھا اور پنیالہ میں مستقل قیام کی درخواست پیش کر دی۔ آپ نے شرفِ قبول سے نوازا۔ خان صاحب نے پنیالہ سے چار فرلانگ شمال کی طرف ایک قطعہ اراضی آپ کے لیے مختص کر دیا۔ آپ نے ذاتی مکانات، مسجد، طلباء اور ذاکرین کے لیے حجرے تعمیر کرا لیے اور اس سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا۔ آپ کے آٹھ صاحبزادے تھے جن میں سے چار آپ کے پاس رہے اور چار نے کچھ مدت خانہ بدوشی کی زندگی گزاری اور پھر قندھار میں سکونت اختیار کر لی۔ وصال کے بعد بڑے فرزند حضرت مولانا سید عبدالحلیم شاہؒ جانشین ہُوئے۔ آپ کے ایک فرزند مولانا سید عبدالعزیز شاہؒ نابینا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت میں بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ اپنے بھائی صاحب سے سلوک کی تکمیل کر کے اجازت و خلافت سے سرفراز ہُوئے اور ۱۹۲۵ء میں اپنے بھائی صاحب کی اجازت سے اباخیل ضلع بنوں میں قیام فرمایا اور وہاں عمر بھر سلسلہ مجددیہ کی ترویج و اشاعت فرماتے رہے۔

حضرت مولانا سید احمد گل شاہ صاحبؒ کے ایک مرید مولانا محمد صدیق تھے، جن کو خانقاہ اور متعلقین خانقاہ میں خلیفہ صاحب کہا جاتا تھا، علاقہ قندھار کے افغان تھے۔ افغانوں کے مشہور خانہ بدوش قبیلہ ناصر سے تعلق تھا، دینی علوم پڑھنے کی غرض سے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوئے لیکن کچھ عرصہ بعد طبیعت کا میلان ذکر و شغل کی طرف زیادہ ہو گیا، ضروری کتابیں پڑھ لیں اور پوری مستعدی سے افکار و مجاہدات میں مشغول ہو گئے۔ سلوک و تصوف کی منازل طے کر کے خلافت و اجازت سے مشرف ہُوئے۔ شیخ سے ایسی محبت اور عقیدت نصیب ہُوئی کہ زندگی انہی کے قدموں میں گزارنے

www.tezpakistan.com

کی ٹھان لی اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حضرت شاہ صاحب کا وصال ہُوا تو سلسلۂ مجددیہ کے دستور کے مطابق اپنے شیخ کے جانشین شیخ کامل حضرت مولانا سید عبدالحلیم شاہؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور بدستور خانقاہ میں مقیم رہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد صدیق کو ۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ شب دوشنبہ کو دوسرا فرزند عطا فرمایا جس کا نام حضرت مولانا سید عبدالحلیم شاہ نے محمود تجویز فرمایا۔ یہ وہ سعادتمند اور بلند اقبال فرزند تھا جس کو آج دُنیا مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمود کے نام سے یاد کرتی ہے۔ محمود نے خانقاہ کے پاکیزہ ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں چار سُو قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں تھیں۔ مراقبات کے حلقے اور اہل اللہ کے تذکرے تھے، خدا طلبی کا ذوق اور روحانیت کا شوق تھا۔ اس پُرانوار اور رُوح پرور فضا میں دِل و دماغ پر جو نقوش قائم ہُوئے وہ شاندار مستقبل کے لیے بنیاد ثابت ہُوئے۔ انہی دنوں کی بات ہے خانقاہ کے ایک صاحبِ دِل درویش آپ سے پیار کرتے تھے، آپ کو اُٹھا لیتے، پنیالہ کے بازار میں لے جاتے اور مٹھائی خرید کر کھلاتے۔ بعض لوگ کہتے کہ آپ اپنے پیروں کے بچوں سے پیار نہیں کرتے، مگر خلیفہ صاحب کے بچے سے اتنا پیار ہے۔ اس پر وہ فرماتے: "مجھے اس بچے کی پیشانی میں عظمت کی روشنی معلوم ہوتی ہے"۔

بالائے سرش زہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

چھ سال کے ہُوئے تو گورنمنٹ مڈل سکول پنیالہ میں داخل کرا دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں امتحان پاس کیا اور ساتھ اپنے والد اور اپنے ماموں مولوی شیر محمد پنیالوی سے قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں، پھر آپ کو اباخیل حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں بھیج دیا گیا جہاں چند مہینے اسباق پڑھے اور واپس خانقاہ پنیالہ میں آ گئے۔ یہاں دو سال میں والد کے علاوہ بہنوئی مولوی شیر محمد قندھاری اور مولوی غلام رسول صاحب سے شرح جامی، ہدایہ اوّلین، حسامی اور سلم العلوم تک کتابیں پڑھیں۔

ان دنوں فنون کی تعلیم میں مدرسہ شاہی مراد آباد کی شہرت تھی۔ غزنی کے مولانا عبدالغفور ترکئی جو خانقاہ کے متعلقین میں سے تھے اور مولانا عجب نور جو بنوں کے رہنے والے تھے وہاں مدرس تھے۔ حضرت مولانا سید عبدالحلیم شاہ نے ۱۹۳۶ء میں اپنے صاحبزادوں، بھتیجوں اور حضرت مفتی صاحب کو مراد آباد پڑھنے بھیجا۔ مفتی صاحب، ساتھیوں سے الگ ہو کر دیوبند چلے گئے۔ ابھی اسباق شروع نہیں ہُوئے تھے کہ خلیفہ صاحب کے فرمان پر موجودہ سجادہ نشین صاحبزادہ احمد صاحب نے آپ کو دیوبند سے مراد آباد لے جا کر مدرسہ شاہی میں داخل کرا دیا۔ وہاں مسلسل چھ سال پڑھتے رہے۔ آپ کے ساتھ حضرت سید عبدالحلیم شاہ صاحب کے فرزند صاحبزادہ محمد صاحب، صاحبزادہ عبدالحمید صاحب اور سید عبدالعزیز شاہ صاحب کے فرزند صاحبزادہ یار محمد صاحب اور صاحبزادہ جان محمد صاحب بھی پڑھتے تھے، ان سب حضرات نے وہاں چھ سال اکٹھے گزارے۔ سید عبدالعزیز شاہ صاحب آپ کو بھی اپنے صاحبزادوں کے برابر ہر مہینے رقم بھیجا کرتے تھے، آپ نے مراد آباد کے مولانا قاری محمد عبداللہ سے علمِ تجوید و قرأت بھی مکمل کیا تھا۔ آپ کے مشفق اُستاد مولانا سید محمد میاں نے اُسی زمانے میں اپنی معروف و مقبول کتاب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" تالیف فرمائی تھی، آپ مسوّدات کی نقل و تصحیح وغیرہ میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ مراد آباد کے بعد آپ نے کچھ عرصہ امروہہ میں حدیث پڑھی۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث امروہی ضعف کی وجہ سے پڑھانا چھوڑ چکے تھے، مگر آپ کا امتحان لے کر حدیث کی سند اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر عطا فرمائی۔

۱۹۴۱ء میں تعلیم مکمل ہُوئی اور وطن واپس آئے۔ حضرت مولانا سید عبدالعزیز شاہ صاحب کے فرمان پر مدرسہ معین الاسلام عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں تدریس شروع کی۔ اباخیل جا کر حضرت شاہ صاحب سے بیعت بھی ہُوئے۔ تدریس کے ساتھ اپنے وظائف بھی پُورے کرتے اور ہر دوسرے مہینے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں جا کر تین دِن قیام کرتے۔ تقریباً دس سال بعد سلاسل اربعہ میں شاہ صاحب سے مجاز ہُوئے۔

حضرت شاہ صاحب نے اباخیل میں مدرسہ قائم کیا اور ۱۹۴۵ء میں آپ کو اپنے مدرسے میں بُلا لیا۔ آپ نے اباخیل میں پڑھانا شروع کیا تو طلباء کا بہت زیادہ ہجوم ہو گیا۔ آپ کے ساتھ آپ کے رفیقِ درس اور شاہ صاحب کے فرزند صاحبزادہ جان محمد صاحب بھی پڑھاتے تھے، دو سال بعد مدرسہ کے اخراجات پُورے کرنے مشکل ہو گئے اور اس مدرسہ کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں مدغم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ دارالعلوم کے مہتمم مولانا عبدالحق صاحب کو بُلا کر مدرسہ کا سارا سامان ان کے حوالے کر دیا گیا اور آپ پنیالہ آ گئے۔

اوائل ۱۹۴۶ء میں آپ کے سسرالی گاؤں عبدالخیل کے ایک محلے میں امام کی ضرورت پیش آئی تو حضرت شاہ صاحب نے آپ کو وہاں امام

www.tezpakistan.com

مقرر فرمادیا۔ امامت کے ساتھ تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ایک مکان اور چھپر طالب علموں کی قیام گاہ اور درس گاہ تھے۔ کوئی فنڈ قائم نہیں کیا۔ محلے والے طلبہ کے لیے کھانا وغیرہ مہیا کر دیتے اور آپ ان کو لوجہ اللہ تعلیم دیا کرتے تھے، خود بھی شروع میں ایک مستعار مکان میں رہے، بعد میں اپنا ذاتی کچا مکان تعمیر کرالیا اور عبدالخیل کو اپنا مستقل وطن بنالیا۔

عبدالخیل ڈیرہ اسمٰعیل خان شہر سے کوئی پینتالیس میل کے فاصلے پر بے آب و گیاہ علاقہ میں ہے، جہاں شمال اور جنوب میں خشک پہاڑ اور درمیان میں ریت کے ٹیلے ہیں، پنیالہ کے علاوہ پورے علاقے میں نہ کوئی چشمہ ہے نہ کنواں، فصلوں کا انحصار بھی بارشوں پر ہوتا ہے، لوگوں نے گھروں میں پختہ تالاب تعمیر کر رکھے ہیں، بارش ہو تو گھروں کے صحنوں اور چھتوں کا پانی ان میں جمع ہو جاتا ہے، تقریباً پانچ سال پہلے تک لوگ اسی پانی سے ضروریات پوری کرتے تھے۔ اگر کسی سال بارش نہ ہوتی اور تالابوں کا پانی ختم ہو جاتا تو عبدالخیل کے لوگوں کو سات میل دور پنیالہ سے اونٹوں پر لاد کر پانی لانا پڑتا تھا، حضرت مفتی صاحب کی زمانہ وزارت کی سکیم پر ۱۹۷۵ء میں عملدرآمد ہوا اور پنیالہ سے عبدالخیل تک منزل در منزل تالابوں کی تعمیر اور ٹیوب ویلوں کی تنصیب سے پانی پہنچا دیا گیا، اس سے کچھ عرصہ پہلے بجلی بھی پہنچ گئی اور سڑک بھی پختہ ہو گئی تھی۔ جب آپ نے وہاں قیام فرمایا تھا اُس وقت عبدالخیل سے ڈیرہ بنوں روڈ تک سولہ سترہ میل کا سفر پیدل یا اونٹوں پر ہوا کرتا تھا۔ اس دور افتادہ علاقے میں رہنے کے باوجود آپ کی علمی قابلیت اور تدریسی مہارت کی شہرت دور دور تک ہو گئی۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان کی انتظامیہ نے ۱۹۵۰ء میں مسندِ افتاء و تدریس کی پیش کش کی، آپ نے اپنے شیخ سید عبدالعزیز شاہ صاحب کی اجازت سے عبدالخیل کی امامت اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد کے سپرد کی اور خود ملتان تشریف لے گئے۔ ملتان سے پہلے آپ کو "مولوی صاحب" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہاں مدرسہ قاسم العلوم میں تدریس کے ساتھ مفتی مدرسہ کا منصب بھی تفویض کیا گیا اور "مفتی صاحب" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کو صدر مدرس، شیخ الحدیث اور ناظم تعلیمات بھی بنا دیا گیا۔

سیاسی زندگی کا آغاز مراد آباد کے زمانۂ تعلیم میں ہوا۔ جب ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں جمعیۃ علمائے ہند کی حمایت میں کام کیا تھا اور انتخابی مہم کے سلسلہ میں دور دراز علاقوں کے دورے کیے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد باقاعدہ جمعیۃ علمائے ہند سے وابستہ ہو گئے اور آل انڈیا جنرل کونسل اور صوبہ سرحد ورکنگ کمیٹی کے رکن بنے۔ درس و تدریس کے ساتھ تحریکِ آزادی میں برابر حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو آپ بھی جنوبی اضلاع میں ساتھ رہے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر اپنے رفقاء سمیت جمعیۃ علماءِ اسلام میں شمولیت اختیار کی۔ حضرت مولانا شبیر احمدؒ کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی جمعیۃ علمائے اسلام کے جتنے مرکزی اجلاس ہوئے۔ ان میں شریک ہوتے رہے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختمِ نبوت میں حصہ لیا اور چھ مہینے ملتان جیل میں محبوس رہے۔ ۱۹۵۶ء میں علماء کنونشن بلانے کا فیصلہ ہوا، مجلسِ استقبالیہ کی تشکیل ہوئی، جس کی صدارت حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ نے منظور فرمائی اور نظامت کی ذمہ داری آپ کو سونپی گئی۔ حضرت لاہوریؒ اور آپ کی طرف سے دعوت نامہ جاری ہوا۔ ۷، ۸، ۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ملتان میں کنونشن ہوا، جس میں مغربی پاکستان کے تقریباً پانچ سو علما نے شرکت کی۔ اس کنونشن میں جمعیۃ علمائے اسلام کی از سرِ نو تشکیل ہوئی۔ امیر حضرت لاہوریؒ، نائب امیر آپ اور ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی منتخب ہوئے۔ اس انتخاب سے جمعیۃ علماءِ اسلام کا دورِ جدید شروع ہوا اور یہ ایک فعال دینی اور سیاسی جماعت کی حیثیت سے ابھری۔

✺

۱۹۵۰ء میں والد صاحب اور ۱۹۶۱ء میں والدہ صاحبہ کا وصال ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں چھوٹے بھائی مولانا محمد صاحب اللہ کو پیارے ہوئے۔ اب آپ نے سفرِ آخرت فرمایا، اپنے پیچھے دو بیوائیں، پانچ بچے تین بچیاں چھوڑیں۔ پہلی شادی ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں آپ کے بڑے فرزند مولانا فضل الرحمٰن کی ولادت باسعادت ہوئی۔ ان کے بعد گھر میں ایسی بیماری شروع ہوگی کہ بچے پیدا ہو کر فوت ہو جاتے تھے، چنانچہ ۱۹۶۰ء میں دوسری شادی کی، جس سے تین بچیاں اور تین بچے ہیں، لطف الرحمٰن، ضیاء الرحمٰن، عبید الرحمٰن، بعد میں خدا کی قدرت کہ پہلی اہلیہ سے ایک بچہ تندرست رہا، جس کا نام عطاء الرحمٰن ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بچوں کو علم و عمل کی دولت سے نوازے اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

www.tezpakistan.com

میدانِ سیاست کا شہسوار

www.tezpakistan.com

(مولینا) مفتی محمود
صدر قومی اتحاد پاکستان

ڈیرہ اسماعیل خان
15-8-78

مکرم و محترم مولانا صاحب زید مجدہم

سلام مسنون — بذریعہ گرامی —

اخبارات سے بھی جناب کا والا نامہ پہنچا —

اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں صراط مستقیم پر چلائے —

اور استقامت دے ساتھ ہی اسلامی نظام کے قیام کی توفیق بھی بخشے

جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے — جنہوں نے قومی اتحاد سے غداری کی ہے — یا غداری کرنے کا ارادہ

اللہ تعالیٰ انہیں خائب و خاسر کرے گا —

دعاؤں کی درخواست ہے —

والسلام
محمود

(مولانا محمد حسین ہزاروی کے نام خط)

www.tezpakistan.com

نوابزادہ نصراللہ خان

اتحاد کا سفیر

وہ آخری دَم تک پاکستان کے مختلف طبقوں اور گروہوں کو متحد کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔

مفتی محمود صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس سے کیا۔ دارالعلوم قاسم العلوم ملتان میں تدریسی خدمات کے دوران ان کی دینی خدمات مسلمانانِ پاکستان کے سامنے ذرا نمایاں ہو کر سامنے آئیں۔ انہوں نے طویل عرصے تک اپنی عملی زندگی کو خالصتاً تدریسی خدمات تک محدود رکھا۔ ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے، تو سیاسی زندگی میں بھی خود کو نمایاں کرتے چلے گئے۔ ایوب خاں کے غیر جمہوری آئین اور آمرانہ طرزِ حکومت کے خلاف جب تحریک شروع ہوئی، تو ان کی جماعت نے پی ڈی ایم میں شامل جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح جمہوری مجلسِ عمل دو آئینی مطالبات کی بنیاد پر وجود میں آئی، اوّلاً ملک میں ایوب خاں کے مخصوص صدارتی نظام کے بجائے پارلیمانی نظامِ حکومت کا قیام اور ثانیاً بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات۔ یہ تحریک بالآخر کامیاب ہوئی اور ایوب خاں مرحوم کو ہمارے یہ دونوں آئینی مطالبات تسلیم کرنا پڑے۔

۱۹۷۰ء میں مفتی صاحب اپنے آبائی علاقے سے دوبارہ منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ ان کا مقابلہ جناب بھٹو سے تھا۔ عوام میں مفتی صاحب کی مقبولیت کا یہ بہت بڑا ثبوت تھا کہ بھٹو صاحب، جو قومی اسمبلی کے کئی حلقوں سے بیک وقت انتخابات لڑ رہے تھے، صرف اسی حلقے سے ناکام ہوئے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد جب بھٹو برسرِ اقتدار آئے، تو کچھ عرصے بعد جمعیت العلمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کو جنہیں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں منتخب ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی، ان صوبوں میں وزارت بنانے کا موقع دیا گیا۔ مفتی صاحب صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ منتخب ہوئے۔ ایک سیاسی رہنما کی کامیابی کے بارے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جن اصولوں اور اقدار کے بارے میں وہ اقتدار میں آنے سے پہلے دعویٰ کرتا تھا، اقتدار میں آنے کے بعد اس نے ان اقدار اور روایات کو برقرار رکھنے یا فروغ دینے کے لیے کیا کام کیا؟ اسی طرح اگر وہ اقتدار سے محروم ہو گیا تو اس صورت میں وہ اپنے اصولوں اور نظریات پر استقامت سے کاربند رہ سکا یا نہیں؟

مفتی صاحب نے پہلی مرتبہ اس ملک میں یہ مثال قائم کر دکھائی کہ ایک بوریا نشین عالمِ دین ایک جدید جمہوری معاشرے میں حکومت کے فرائض کو اپنی تمام تر سادگی اور درویشی کے باوجود بطریقِ احسن چلا سکتا ہے۔ جہاں تک اسلامی روایات کی پاسداری کا تعلق ہے، انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں پہلا کام یہ کیا کہ شراب پر پورے صوبے میں پابندی لگا دی۔ سرکاری ملازمین کو قومی لباس پہننے کی ترغیب دی۔ اردو کو دونوں

www.tezpakistan.com

صوبوں میں دفتری زبان کی حیثیت سے اختیار کیا گیا اور جمعہ کے دن کی تعطیل کے لیے مرکزی حکومت سے سفارش کی گئی۔ جہاں تک جمہوری روایات کا تعلق ہے، انہوں نے ایک مرتبہ بھی اپنے دورِ حکومت میں کسی شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ نہیں کی۔ کسی بھی سیاسی حریف کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی، بغیر مقدمہ چلائے کسی سیاسی حریف کو نظر بند نہیں کیا۔ اخبارات پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ عام آدمی کو بغیر کسی روک ٹوک کے ان تک رسائی حاصل تھی اور جب بلوچستان کی منتخب نمائندہ حکومت کو غیر جمہوری طریقے سے برخاست کیا گیا، تو مفتی صاحب نے بغیر کسی تامل کے وزارتِ اعلیٰ کے منصب سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا اور یہ روایت بھی اس ملک میں پہلی مرتبہ قائم کی کہ اقتدار سے اصولوں کی خاطر علیحدہ ہوا جا سکتا ہے۔ ع ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

اس کے بعد ان کی سیاسی بصیرت اور حب الوطنی کا اس سے بڑا ثبوت نہیں فراہم کیا جا سکتا کہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ اس وقت کی مرکزی حکومت کے غیر جمہوری اقدامات کی وجہ سے دو صوبوں میں اقتدار سے محروم ہو چکے تھے اور اس کی وجہ سے رنج اور تلخی کا ہونا بالکل فطری امر تھا، لیکن جب آئین سازی کا مرحلہ آیا، تو ملک کو سیاسی استحکام بخشنے کے لیے اس حکومت سے بھی تعاون کرنا مناسب سمجھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس آئین میں اسلامی دفعات جس قدر ہیں، وہ مفتی صاحب اور ان کے رفقا کی کوششوں کے نتیجے میں ممکن ہوئیں، اس کے علاوہ صوبائی خود مختاری کی حدود کے تعین کے سلسلے میں انہوں نے نہ صرف خود ملک کے وسیع تر مفاد کو اور ملک کی سالمیت کے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے جائز حدود تک رکھنے کے لیے کوشش کی، بلکہ اپنے رفقا کو اس امر پر آمادہ کیا۔ یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ چھوٹے صوبوں کے رہنماؤں نے بلا تخصیص ۱۹۷۳ء کے آئین پر دستخط کیے اور اس کے بعد یہی رہنما پبلک میٹنگز میں اس بات کا اعلان بھی کرتے رہے کہ انہیں آئین میں تجویز کی گئی خود مختاری منظور ہے۔ اسی طرح تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران قوم نے مولانا محمد یوسف بنوری کی قیادت میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے تحریک چلائی، تو قومی اسمبلی کے اندر اس تحریک کی قیادت مفتی صاحب نے کی اور یہ ان کے اثر کی وجہ سے تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی نے اس حقیقت کے باوجود کہ وہ سیکولر نظام کی داعی تھی، اس مذہبی مسئلے میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے حق میں ووٹ دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ نوے سالہ پرانا مسئلہ ملتِ اسلامیہ کی خواہشات کے مطابق طے پا گیا۔

مفتی صاحب کا تعلق اگرچہ مسلمانوں کے ایک مکتبِ فکر سے تھا، لیکن ان میں فرقہ دارانہ تعصب قطعاً نہیں تھا۔ ہر مرحلے پر ان کی کوشش رہی کہ قومی اور ملی مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کی مختلف سیاسی اور دینی تنظیموں کا وسیع تر اتحاد ہونا چاہیے؛ چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ جمہوری مجلسِ عمل کے قیام میں پیش پیش رہے اور بعد میں جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا اعلان ہوا، تو نو جماعتوں کا جو اتحاد معرضِ وجود میں آیا، اس میں بھی ان کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ یہ ان کی شخصی عظمت کا اعتراف تھا کہ انہیں پاکستان قومی اتحاد کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بیلٹ بکس کی تقدیس کو جب مجروح کیا گیا اور انتخابی نتائج کو دھاندلیوں کے ذریعے تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی، تو مفتی صاحب کی قیادت میں پاکستان قومی اتحاد نے ان ۳۸ نشستوں سے، جہاں اس کے اُمیدواروں کو کامیاب قرار دیا گیا تھا اور مفتی صاحب بھی ان کامیاب ہونے والوں میں شامل تھے، دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا۔ صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کیا اور پورے ملک میں ہڑتال کی اپیل کی۔

یہ فیصلے اس قدر بروقت تھے کہ ان کی کامیابی سے بالآخر مجبور ہو کر بھٹو صاحب کو وہ فارمولا پیش کرنا پڑا جسے یحییٰ بختیار فارمولا کہا جاتا ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ازسرِ نو ہوں اور اگر قومی اتحاد اکثریت حاصل کر لے، تو قومی اسمبلی کے انتخابات بھی دوبارہ کرائے جائیں۔ صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کے بعد بھٹو صاحب اور پوری دنیا پر واضح ہو گیا کہ پاکستان قومی اتحاد کے بائیکاٹ کے بعد ان انتخابات کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس تحریک کے دوران حکومت کی طرف سے مختلف تجاویز اور پیش کشیں سامنے آئیں، لیکن مفتی صاحب کی طرف سے ہمیشہ یہ جواب دیا جاتا رہا کہ قومی اسمبلی کا ازسرِ نو انتخاب کرایا جائے؛ حتیٰ کہ ایک مرحلے پر جب ہم سہالہ میں نظر بند تھے، تو عرب ممالک کے بعض سفیر حضرات نے بھی مفتی صاحب سے ملاقات کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مفاہمت کی کوئی صورت نکلنی چاہیے، لیکن مفتی صاحب نے ہمیشہ یہ کہا کہ جب تک قومی اسمبلی کے انتخابات کے ازسرِ نو انعقاد کا اقرار نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک مذاکرات نہیں کیے جائیں گے۔ وہ اس بات پر اس وقت تک قائم رہے جب تک حکومت بالآخر اس نوعیت کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ فکری استقامت اور اپنے اصولوں پر قائم رہنے کی تابندہ

www.tezpakistan.com

روایت مفتی صاحب نے اپنے عمل سے قائم کی۔

پاکستان قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے مفتی صاحب کی قیادت میں ۳۲ نکات کی بنیاد پر بھٹو صاحب اور ان کی ٹیم کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا اور انہوں نے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت کی وجہ سے بھٹو صاحب سے ۳۲ میں سے ۳۱ نکات منوا لیے۔ برِصغیر کی تاریخ میں مختلف وقتوں میں اصلاحات کے نفاذ یا اقتدار منتقل کرنے کے سلسلے میں جو بھی مذاکرات ہوئے ہیں سیاسی تنظیموں میں سے کسی کو بھی ایک وقت میں اتنی بڑی کامیابی نصیب نہیں ہوئی جتنی پاکستان قومی اتحاد کی اس مذاکراتی ٹیم کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور بے پناہ عوامی تائید کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اس مذاکراتی ٹیم کے سربراہ مفتی صاحب تھے۔

مفتی صاحب نے بااصول سیاست کا اس وقت بے مثال مظاہرہ کیا جب حکومت کی طرف سے پاکستان قومی اتحاد کو حکومت میں شامل ہونے کی پیش کش کی گئی۔ انہوں نے اس پیش کش کے جواب میں کہا کہ جب تک یہ وزارت بامقصد اور بااختیار نہ ہو اس وقت تک اس میں شمولیت اختیار نہیں کی جاسکتی۔ حکومت سے اس سلسلے میں مذاکرات ہوتے رہے اور تقریباً ۵½ ماہ تک جاری رہے۔ آج جو یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ پاکستان قومی اتحاد نے حکومت میں شریک ہونے کے لیے بے تابی کا اظہار کیا، تو ان طویل مذاکرات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ الزام غلط تھا؛ حتیٰ کہ جب پاکستان قومی اتحاد کی ایک جماعت نے حکومت میں شمولیت اختیار کر لی تب بھی پاکستان قومی اتحاد اپنی شرائط سے دستبردار نہ ہوا۔ ان شرائط کے پورا ہونے کی یقین دہانی پر حکومت میں شمولیت اختیار کی گئی۔ اسلامی حدود اور زکوٰۃ وعشر کے جو قوانین نافذ کیے گئے وہ بھی مفتی صاحب اور ان کے رفقا کی کوششوں کی وجہ سے ہوا۔

موجودہ حکومت نے جب بلدیاتی انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا، تو مفتی صاحب کی قیادت میں پاکستان قومی اتحاد نے ان کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے میں بھی مفتی صاحب کے اعلیٰ سیاسی تدبر کا بڑا دخل تھا۔ گزشتہ سال ۱۶ اکتوبر کی پابندیوں کے بعد بھی مفتی صاحب نے بااصول سیاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کئی بار مفتی صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا، لیکن وہ ہمیشہ اس موقف پر قائم رہے کہ جب تک ۱۶ اکتوبر سے پہلے والی پوزیشن کو بحال نہیں کیا جاتا، اس وقت تک مفاہمت نہیں کی جاسکتی، حتیٰ کہ عالمِ اسلام کی ایک شخصیت نے بھی اس سلسلے میں مفتی صاحب سے رابطہ قائم کیا، مگر انہوں نے اصول پر سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ وہ اٹوٹ اصول تھے جن پر مفتی صاحب اپنی زندگی کے آخری سانس تک کاربند رہے۔

جب رُوسی افواج افغانستان میں جارحیت کا ارتکاب کر کے وہاں داخل ہوئیں، تو مفتی صاحب نے اپنی روایات کے مطابق اسلامیانِ پاکستان کی تمام سیاسی اور دینی تنظیموں کو اس عظیم خطرے کے پیشِ نظر متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، ملتان، آزاد کشمیر کے شہروں میں اجتماعات منعقد کیے گئے۔ مفتی صاحب اپنی پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود ان سب اجتماعات میں شریک ہوئے۔ زندگی کے آخری سانس تک استقامت کے ساتھ ملی فریضے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ ان پر مقدمات قائم کیے گئے، جیل جانا پڑا، لیکن ان کے جذبے میں ذرا بھر فرق نہ آیا۔ اپنے آخری خط میں مجھے لکھا: "جو تھوڑی بہت زندگی باقی رہ گئی ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ملک اور قوم کے کام آجائے۔"

کچھ عرصے سے مفتی صاحب اور ہماری یہ سوچ رہی ہے کہ عالمی کمیونزم ہماری سرحدوں پر دستک دے رہا ہے۔ ان نازک لمحات میں ملک کے اندر مختلف مکاتبِ فکر میں محاذ آرائی ختم کرنا ملک اور قوم کے مستقبل اور سلامتی کے لیے بے حد ضروری ہے اور جس قدر قومی اتحاد کا عملی مظاہرہ ہوگا، اتنا ہی ملک وقوم کے لیے بہتر ہوگا؛ چنانچہ مفتی صاحب نے اپنے اس سفرِ حج سے پہلے چار دن کراچی میں قیام کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وطنِ عزیز کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے مختلف عناصر کو متحد کیا جاسکے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو چکے تھے، لیکن موت نے ان کو اس مشن کی تکمیل کی مہلت نہ دی۔ مجھے یقین ہے پاکستانی قوم مفتی صاحب کے اس مشن کی تکمیل ضرور کرے گی، انشاء اللہ!

مفتی صاحب اوّل وآخر مسلمان تھے۔ ساری زندگی مسجد ومدرسے کے آدمی رہے اور دینی مباحث میں حصہ لیتے ہوئے ایک مدرسے میں، ایک مسجد کے زیرِ سایہ جان، جاں آفریں کے سپرد کی۔ وطنِ عزیز میں پاکستان اور اسلام کے لیے سب سے توانا اور مضبوط آواز مفتی صاحب

www.tezpakistan.com

کی تھی۔ سرحد اور بلوچستان کے دو حساس ترین خطوں میں وہ بڑی قوت تھے۔ وہ کبھی ملی تقاضوں پر مصالحت نہیں کرتے تھے جس کی مثال افغانستان کا مسئلہ ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے دیرینہ سیاسی رفقا کو بھی معاف نہیں کیا۔

قومی مسائل کے سلسلے میں ہماری سوچ میں ہمیشہ ہم آہنگی رہی ہے اور مفتی صاحب سے میری طویل رفاقت کی یہی بنیادی وجہ تھی۔ اس ملک میں اسلامی اقدار کے فروغ اور جمہوری اقدار کی بحالی کے لیے ہم نے مل کر کام کیا اور یہ رفاقت ان کی زندگی کے آخری لمحے تک رہی۔ میں ذاتی طور پر ان کی وفات سے جس قدر متاثر ہوا ہوں اس کا اندازہ کوئی دوسرا فرد نہیں لگا سکتا۔ وہ میرے نہایت عزیز دوست تھے، دوست بھی بھائیوں جیسے۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔

خان عبدالولی خان

ہم اُن سے مِل کر گھر پہنچے ہی تھے کہ موت کی خبر آگئی

مفتی محمود سے میری پہلی مُلاقات اگرچہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد ہُوئی، لیکن ان کے ساتھ ہمارا تعلق خاصا پُرانا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے دیوبند میں قوم پرست علما کا طبقہ موجود تھا۔ یہ لوگ پُرانی روایات کے حامل اور عالم باعمل تھے اور انگریز کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ دُنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو معلوم ہوگا کہ جب بھی کہیں کسی جابر اور فاشسٹ حاکم کے خلاف کوئی آواز اُٹھی یا تحریک بپا ہُوئی، مختلف سیاسی تنظیموں نے باہم مِل کر اس کا آغاز کیا۔ کسی ایک سیاسی تنظیم کے لیے تنہا کسی جابر اور فاشسٹ حاکم کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا؛ چنانچہ مختلف ہم خیال قوتیں باہم مِل کر اتحاد کی بات کرتی ہیں۔ برِصغیر میں انگریز جابر حکمران تھا۔ وہ مُلک میں کسی قومی یا آزادی کی تحریک کو برداشت نہیں کر سکتا تھا؛ چنانچہ وہ اسے بالکل کُچلنے کے لیے تُلا ہُوا تھا۔ یہ صورتِ حال اس کے خلاف اتحاد یا متحدہ محاذ قائم کرنے کی متقاضی تھی۔ سو ہم نے اس کے مقابلے میں انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا۔ دیوبند کے قوم پرست علماء نے بھی اپنا وزن اس پلڑے میں ڈال دیا۔ یہیں سے ہمارے اُس ذہنی ربط اور تعلق کا آغاز ہُوا جو بعد میں آخرِ دم تک قائم رہا۔

مولانا مفتی محمود سے میری پہلی مُلاقات ڈھاکہ میں ہُوئی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات ہو چُکے تھے اور ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ مجھے آنکھوں کی تکلیف رہتی ہے اور اس سلسلے میں مجھے اکثر بیرونِ مُلک اپنے ڈاکٹر سے مشورے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ صدر یحییٰ

www.tezpakistan.com

نے قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ کا اعلان کیا، تو مَیں ان سے ملا اور کہا مجھے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیے بڑی مدت ہو چکی ہے، مَیں اس سے مشورے کے لیے اب جلدی باہر جانا چاہتا ہُوں تاکہ وقت پر وطن لَوٹ سکوں۔ مجھے تعجب ہُوا جب انہوں نے کہا کہ بُھٹّو صاحب سے مِل کر جائیے۔ مَیں نے عرض کی، جناب! مَیں اب بُھٹّو صاحب کو کہاں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ میری خواہش ہے کہ جلدی جا کر قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے وطن لَوٹ آؤں۔ ایسے میں بُھٹّو صاحب سے کیسے ملوں گا۔ اس پر یحییٰ نے کہا، مُلاقات کا انتظام مَیں کروں گا۔

اخبارات سے پتہ چلا بُھٹّو صاحب ان دِنوں ملتان میں ہیں۔ صدر یحییٰ نے ان سے بات کی اور وہ مجھ سے ملنے آئے۔ اس مُلاقات سے ایک دن پہلے خبر آئی تھی کہ انہوں نے مفتی محمود صاحب سے مُلاقات کی ہے اور کوشش یہ ہے کہ اگر وہ سرحد میں ان کے ساتھ مل کر حکومت بنا لیں، تو اچھا ہو ..... خیر مُلاقات ہُوئی اور مَیں ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لیے لندن چلا گیا۔ بعد میں صدر یحییٰ نے ڈھاکہ میں ہونے والا اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس پر خاصی بے چینی پھیلی اور مشرقی پاکستان کے ساتھیوں نے ناراض ہو کر رابطہ ہی ختم کر دیا۔ لندن میں ایک روز اچانک صدر یحییٰ کا پیغام مِلا کہ فوراً وطن واپس آؤں، کچھ اُلجھن پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ مَیں واپس آ گیا۔ صدر یحییٰ نے کہا کہ شیخ مجیب کو سمجھا بُجھا کر بات چیت کے لیے راضی کرو۔ مَیں ڈھاکہ پہنچا، شیخ مجیب سے بات ہُوئی اور انہوں نے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی، تو مَیں نے صدر یحییٰ کو تجویز پیش کی کہ صاحب، بات چیت ہونی ہی ہے تو پھر قومی اسمبلی میں جتنی پارٹیوں کی نمائندگی ہے، اُن سب کو اس بات چیت میں شریک کیا جائے تاکہ آپ کو گفت و شنید میں کسی قسم کی دِقّت نہ ہو۔ مفتی محمود صاحب اپنی پارٹی کے لیڈر تھے، اس سلسلے میں وہ بھی ڈھاکہ پہنچے۔ یہیں پہلی بار میری اُن سے مُلاقات ہُوئی۔ اس مُلاقات میں کچھ گلے شکوے ہُوئے، کچھ انتخابات کے دِنوں کا ذکر چھڑا۔ انتخابی مہم کے دوران نیپ اور جمعیت کا رویّہ ایک دوسرے کے خلاف بڑا تلخ اور شدید تھا۔ اس مُلاقات میں کچھ قومی مسائل بھی زیرِ بحث آئے۔ انتخاب کے دِنوں کی تلخی ابھی تک ذہنوں میں تازہ تھی، لیکن اس کے باوجود چونکہ ذہنی طور پر ہم ایک ہی انداز سے سوچنے والے لوگ تھے، اس لیے الیکشن کے بعد جب ڈھاکہ میں مِل بیٹھنے کا موقع مِلا، تو ایک دوسرے کے قریب آنے میں کچھ زیادہ دِقّت نہ ہُوئی۔ ہمارے مخالفین کی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے الیکشن میں ہمیں ایک دوسرے کے خلاف لڑایا، ورنہ الیکشن تک تو ہم اکٹھے رہے ہیں۔ الیکشن میں جب ہماری آپس میں ٹھنی ہے تو اس کا فائدہ لازماً تیسری پارٹی کو ہُوا۔ اگر ہم اور مفتی صاحب اکٹھے رہتے، تو مُشکل سے پانچ، چھ سیٹیں ہارتے، مگر بدقسمتی کہ ہم آپس میں اُلجھے اور بالکل خلافِ توقع اُلجھے۔

سرحد اسمبلی میں ہماری پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی، لیکن ہم حکومت بنانے میں کوئی خاص دِلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ جب تک آپ کے پاس واضح اکثریت نہ ہو اور آپ کو قوم کا بھرپور اعتماد حاصل نہ ہو، مزہ نہیں آتا۔ دوسری پارٹیاں انتخابات کے بعد سے جوڑ توڑ اور صلاح مشوروں میں مصروف تھیں، آزاد اُمیدوار اپنا الگ چکّر چلا رہے تھے۔ کوئی کہتا، اس کو اُدھر لگاؤ، کسی کا مشورہ تھا مُسلم لیگ سے مِل جاؤ۔ پیپلز پارٹی کے پاس تو خیر کوئی سیٹ ہی نہیں تھی، وہ ایک دوسرے سے تلاش کے پتے لے کر اپنا کھیل بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہُوا، تو تب ایکا ایکی ہر ایک کے ذہن میں یہ سوچ پیدا ہُوئی کہ یہ تو واقعی کوئی گہری چال ہے اور پاکستان کو دولخت کرنے کی سازش ہے۔ اس پر لوگ ذرا سنبھلے اور دِلوں میں یہ احساس اُجاگر ہُوا کہ اب تو کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے اور ہمیں متحد ہو کر اس فتنہ و فساد کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کی ابھی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مَیں سمجھتا ہُوں یہی وہ احساس تھا جس نے نیپ اور جمعیت جیسے مختلف سیاسی عناصر کو اتحاد پر مجبور کیا اور سرحد میں ہماری مشترکہ حکومت کا قیام عمل میں آیا، تاہم یہ صوبائی سیاست کا مسئلہ نہ تھا، اس میں مُلکی سطح کی سوچ کارفرما تھی کہ ہمیں اب مُلک کو بچانے کے لیے متحد ہو جانا چاہیے۔

پنجاب اور سندھ کے برعکس صوبہ سرحد میں مقامی حکومت کو اپنے مخصوص حالات کے پیشِ نظر قدرے مختلف اور مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلوچستان میں بھی یہی مشکل پیش آتی ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان دونوں صوبوں کی حیثیت ایک جیسی ہے۔ دونوں صوبوں میں کچھ ایسا قبائلی علاقہ ضرور موجود ہے جسے سنٹرل ایڈمنسٹرڈ ایریا کہتے ہیں۔ پھر وہ پراونشل ایڈمنسٹرڈ ایریا بھی ہے۔ ان صوبوں میں ایک ضلع بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ کچھ قبائلی علاقہ نہ لگتا ہو، اس لیے یہاں کا نظم و نسق چلانے اور اسے بہتر بنانے کے لیے آپ قدم قدم پر مرکز کی امداد اور تعاون کے محتاج ہیں۔ جب

www.tezpakistan.com

تک مرکز [illegible] ایک پولیس والا بھی نہیں ہلا سکتے۔

مفتی صاحب نے سرحد میں وزارت بنائی، لیکن یہ زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ بدقسمتی سے مرکز میں اپنی ایک مخصوص سوچ اور ذہن رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے صوبائی حکومت کو کھل کر قطعی کام نہیں کرنے دیا اور یوں لوگوں کے دلوں میں جو شکوک و شبہات اور بداعتمادی موجود تھی، وہ کچھ اور بڑھ گئی۔

بلوچستان حکومت کی برطرفی کی خبر آئی، تو میں اس دن پشاور میں تھا۔ پارٹی کا کوئی جلسہ تھا۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد کے گورنر ارباب سکندر خلیل اپنے عہدے سے برطرف ہو چکے تھے۔ مفتی محمود سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے کہا، یہ تو انہوں نے صوبائی حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے وزارت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے۔ ان کا سیاسی مسلک اور سوچ اتنی واضح اور صاف تھی کہ اس فیصلے تک پہنچنے میں انہیں دو منٹ بھی نہیں لگے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا استعفیٰ لکھا اور وزارتِ اعلیٰ کو ٹھوکر مار کر حکومت سے الگ ہو گئے۔ الیکس میں سے چودہ ممبروں کے دستخط میں نے خود اپنے ہاتھ سے بھٹو صاحب کو بھیجے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بہت بڑا کردار تھا۔ اجتماعی طور پر اس حکومت کا اور انفرادی طور پر مفتی محمود کا۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ وزارت ہم نے حکومت کی خاطر نہیں، خدمت کی خاطر لی تھی۔ اگر ہمیں خدمت کا موقع نہیں ملتا، تو پھر حکومت میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر خدمت ہو سکتی ہے، تو حکومت کریں گے۔ خدمت نہیں ہو سکتی، تو پھر چھٹی کریں گے۔

مفتی صاحب کے عہدِ وزارت کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ مستعفی ہونے سے ایک ماہ پہلے باتوں باتوں میں فرمانے لگے: ایک بات بتائیں، ہمیں حکومت کرتے آٹھ ماہ ہو گئے ہیں، لوگوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ سفارشیں اور فرمائشیں ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتیں، لیکن آپ نے ایک مرتبہ بھی کسی کام کے بارے میں مجھ سے نہیں کہا۔

کچھ عرصہ قبل بھٹو صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ میں کسی معاملے میں گورنر ارباب سکندر خلیل سے کوئی بات کروں۔ میں نے ان سے کہا، ہمارے اور آپ کے طریقِ کار میں فرق ہے۔ جب ہم کسی آدمی کو کوئی ذمہ داری سونپتے ہیں، تو پھر اس پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ پھر یہ اس کی JUDGEMENT پر ہے کہ وہ کسی معاملے میں کیا فیصلہ کرتا ہے، ہماری ذمہ داری نہیں۔ نہ ہم اس سے جا کر کبھی کہتے ہیں کہ بھئی ایسا نہیں ہے، ایسا ہے یا یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا..... سو مفتی صاحب کو بھی میں نے یہی جواب دیا کہ جناب — ہمیں آپ کی دانش اور JUDGEMENT پر مکمل اعتماد ہے۔ ہمیں آپ کو کسی کام کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جو کچھ بھی کریں گے وہ ٹھیک ہی ہو گا، بداعتمادی کی کوئی بات نہیں۔

مفتی صاحب بڑے مجاہد آدمی تھے۔ ہماری پارٹی پر پابندی لگی اور حکومت کی طرف سے ہم پر بہت کچھ الزامات عاید کیے گئے، تو مفتی صاحب نے سپریم کورٹ کو لکھا کہ مجھے بھی اس مقدمے میں فریق بنایا جائے۔ صوبہ سرحد میں ہماری مشترک حکومت تھی اور میں اس کا وزیرِ اعلیٰ تھا۔ یہ ولی خان پر آپ کس خوشی میں مقدمہ چلاتے ہیں۔ اتحاد والوں نے بھی یہی کہا کہ وہ ہمارا اپوزیشن لیڈر تھا۔ ہمیں بھی پارٹی بنایا جائے۔ اس نے اتحاد کے جلسوں میں تقریریں کیں، این ڈی پی کے تحت کوئی جلسہ نہیں کیا۔

پشتو کی ایک مثل ہے کہ انسان، انسان کا شیطان بھی ہے اور انسان، انسان کا رحمٰن بھی ہے۔ کئی یار دوست ایسے مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے دلوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کچھ یہی صورتِ حال ہمارے اور مفتی صاحب کے تعلقات کے ساتھ پیش آئی۔ اتحاد سے الگ ہونے کے بعد ہم دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ تعلقات میں رخنہ پیدا ہو گیا اور سرد مہری آ گئی۔

مفتی صاحب کی موت سے ایک آدھ دن پہلے جس روز میں لندن سے کراچی پہنچا، اسی شام شیر باز مزاری صاحب نے فون کیا کہ مفتی صاحب کراچی تشریف لائے ہیں، حج پر جا رہے ہیں۔ انہیں جب پتہ چلا کہ آپ بھی یہاں ہیں، تو وہ ملنا چاہتے ہیں۔ دوسرے دن صبح دس بجے مزاری صاحب کے گھر پر ان سے ملاقات ہوئی۔ ذاتی اختلافات کے ساتھ ساتھ ملکی حالات اور مسائل زیرِ بحث آئے اور خوب گپ شپ ہوئی۔ مفتی صاحب نے شیر باز مزاری کی طرف منہ کر کے کہا، ان کے ساتھ جب بیٹھتا ہوں، تو یہ کافی ہنسا لیتے ہیں، لطیفے ہوتے ہیں۔ آج معلوم نہیں

www.tezpakistan.com

کتنے سال بعد مَیں واقعی دِل سے ہنسا ہُوں۔ کہنے لگے آج کل کچھ کہنے یا تقریر کرنے پر پابندی ہے لیکن ہم آپ سے اس سلسلے میں ذرا زیادہ خوش نصیب ہیں کہ اپنے دِل کی بھڑاس کم از کم مسجد میں تو نکال لیتے ہیں۔ پھر انہوں نے ہنستے ہُوئے بتایا کہ اب کے کراچی آیا، تو دوستوں نے تقاضا کیا کہ حج پر جانے سے پہلے جمُعہ کی نماز پڑھاؤں اور خطبہ دُوں۔ مَیں راضی ہو گیا، تو انہوں نے اس مضمون کا ایک اشتہار اخبار کو جاری کر دیا۔ اخبار والوں نے اشتہار لے لیا، لیکن اگلے دن جب یہ اشتہار چھپا، تو عجب مضحکہ خیز صورتِ حال سامنے آئی صاحبِ اختیار لوگوں نے اشتہار میں سے میرا نام حذف کرا دیا تھا.... نام کے بغیر اشتہار کی صورت کچھ یُوں ہو گئی ــــ "عوام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ مسجد میں نمازِ جمعہ ہو گی۔ امامت جناب ..... کرائیں گے۔" اس عجیب و غریب اشتہار کو جس نے پڑھا، مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اگلے دن نو بجے مفتی صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے اور تقریباً بارہ بجے تک ان کے ساتھ رہے۔ ان دونوں نشستوں میں باہمی اختلافات پر تفصیلی گفتگو ہُوئی۔ اس دوران مُلکی حالات میں چونکہ خاصی تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں اور صورتِ حال اچھی طرح واضح ہو چکی تھی، اس لیے مفتی صاحب اس وقت نسبتہً زیادہ واضح ذہن سے سوچ رہے تھے۔ ہمارا استدلال تھا کہ ہم اس وقت بھی حکومت میں شمولیت اختیار کرنے کے فیصلے کے خلاف تھے اور اب بھی اسے مناسب نہیں گردانتے ــــ کسی غیر جمہُوری طریقے سے حکومت میں جانا ہم اپنی سیاست کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ بات چیت سُود مند رہی اور بدگمانی کی فضا بڑی حد تک صاف ہو گئی۔

مفتی صاحب کو ان مُلاقاتوں میں مَیں نے مستقبل کے بارے میں خاصہ پریشان اور متفکر پایا۔ اصلاحِ احوال کے لیے شاید ان کے پیشِ نظر کوئی لائحہ عمل یا منصوبہ ہو، اس بارے میں میری ان سے کوئی بات نہیں ہُوئی ــــ نہ مَیں ان سے اس طرح کی بات چیت کرنے کا مجاز تھا، کیونکہ مَیں کسی پارٹی کا سربراہ نہیں ــــ ایسے معاملات پر بات چیت کرنے کے شیر باز مزاری ہی مجاز ہیں؛ تاہم مفتی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مَیں واپس آجاؤں، تو پھر ملیں گے۔ مَیں نے کہا، ٹھیک ہے، مَیں پھر ملتان آجاؤں گا یا آپ ڈیرہ اسماعیل خاں یا عبدالخیل میں ہوں گے تو وہاں آجاؤں گا۔ انہوں نے کہا، نہیں مَیں پشاور آؤں گا۔

یہ مُلاقات آخری ملاقات ثابت ہُوئی۔ ہمیں پیر صاحب پگارا کے پاس جانا تھا۔ مفتی صاحب سے پون یا سوا بجے رخصت ہُوئے۔ گھر پہنچے اور کھانا کھا کر ابھی بیٹھے تھے کہ مفتی صاحب کی موت کی خبر آگئی۔ حقیقتاً اتنا صدمہ ہُوا کہ کئی لمحوں تک ان کی موت کا یقین ہی نہ آیا۔ خیر بھاگم بھاگ مسجد پہنچے، وہاں سچ مچ ان کی لاش پڑی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہنسنے مُسکرانے والا انسان اب چُپ چاپ اور خاموش پڑا ہُوا تھا۔ بڑا سخت صدمہ ہُوا۔ اس وقت سے میرے ذہن پر ایک بوجھ سا ہے اور مَیں سوچتا ہُوں کہ یہ زندگی بھی آخر کوئی چیز ہے جس کے لیے آدمی کیا کچھ کرنے پر اُتر آتا ہے!!!

خان عبدالولی خان ــــ سوگواروں کے درمیان

www.tezpakistan.com

پروفیسر عبدالغفور

نہ تعصّب، نہ غصّہ،
نہ اشتعال،
وہ دلیل کے آدمی تھے

مفتی صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات قومی اسمبلی کی مرہونِ منّت ہے۔ ۷۰ء کے انتخابات میں مَیں کراچی سے رُکن منتخب ہوا تھا اور مفتی صاحب ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے۔ مجھے جماعتِ اسلامی کی نمایندگی کا شرف حاصل تھا اور مفتی صاحب جمعیتہ العلمائے اسلام کے رہنما تھے۔ مسٹر بھٹو نے ان کے مقابلے میں الیکشن لڑا تھا اور شکست کھائی تھی، اس لیے مفتی صاحب کی رکنیت کو انتخاب کے دن ہی سے ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی — بہرحال ۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران مفتی صاحب کی جماعت سے ہمارا راستہ مختلف تھا۔ غلط فہمیاں تھیں کہ ان سے ملحول اٹ گیا تھا — صرف اسی پر کیا موقوف، انتخابی مہم نے اکثر و بیشتر جماعتوں کے تعلّقات کو متاثر کر رکھا تھا۔ ایسی ایسی تلخیاں تھیں کہ اسمبلی کے اندر تعاون اور اتفاق اور اسمبلی سے باہر اتحاد و یگانگت کا تصوّر کم ہی لوگ کر سکتے تھے۔

آدھی سے کم قومی اسمبلی میں، جو کہ مشرقی پاکستان کے الیے کے بعد "نئے پاکستان" کی پوری اسمبلی تھی، ایک ایسی سیاسی جماعت کو بھاری اکثریت حاصل تھی جس کا انتخابی منشور دینی سیاسی جماعتوں سے بہت مختلف تھا، اور اس کے رویّے بھی عجیب تھے۔ ایک طرف یہ صورتِ حال تھی، دوسری طرف ایسی جماعتیں تھیں جن کے ارکان کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ یہ اقلیتی جماعتیں حکمران جماعت سے اختلاف رکھتی تھیں لیکن حکمران جماعت سے زیادہ خود ان کے درمیان عداوت تھی۔

نئی اسمبلی کے سپرد سب سے اہم کام دستور سازی کا تھا۔ جب حالات پر غور و خوض شروع ہوا اور معاملات عملی صورت میں سامنے آئے تو یہ حقیقت سب پر کھلی کہ اقلیتی جماعتیں الگ الگ رہ کر کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گی اور دستور ان کے نظریات کی عکاسی نہیں کر سکے گا۔ ایک دوسرے کو جاننے اور سُننے سے یہ خوشگوار حقیقت سامنے آئی کہ دستور کے بارے میں دینی جماعتوں کے مطالبات میں مکمل ہم آہنگی ہے اور اس کے اسلامی پہلوؤں پر ان کے درمیان قریباً اتفاقِ رائے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ فروعی اختلافات کی باتیں کوئی بنیاد نہیں رکھتیں، اور یہ کہ جو لوگ ان اختلافات کو اُبھارتے ہیں، ان کے سامنے صرف شخصی اغراض ہوتی ہیں تاکہ عام لوگوں کے جذبات کو

www.tezpakistan.com

اُبھار کر سیاسی فائدے حاصل کریں؛ وگرنہ قومی سطح پر نہ ان کی کوئی اہمیت ہے نہ ضرورت۔

دستور کے بارے میں قریباً مشترکہ نظریات اور پھر عددی کم مائگی کے احساس نے تعاون اور اتفاق کی راہیں کشادہ کر دیں — اور قومی اسمبلی کی اقلیتی جماعتوں کے ارکان میں ربط بڑھا، آپس میں مل بیٹھنے کے رستے کھلے، نہ صرف دستور کے بارے میں متفقہ موقف اختیار کیا گیا بلکہ قومی اسمبلی کے اندر ایک جماعت کی حیثیت میں کام کر کے حکمران جماعت کے عزائم کا سامنا کرنے کے مرحلے بھی طے ہوتے گئے۔

دستوری معاملات پر غور و خوض کرنے کے لیے چھوٹی جماعتوں کے ارکان کے اجلاس قومی اسمبلی کے ارکان کے ہوسٹل میں کبھی ایک کمرے میں ہوتے، کبھی دوسرے میں، کبھی مفتی صاحب کے ہاں نشست رہتی، کبھی نورانی میاں کے ہاں، کبھی میرے کمرے میں، اور کبھی کسی دوسرے رُکن کے پاس۔ یہ اجلاس رات گئے تک جاری رہتے، ان میں تلخیاں ختم ہوئیں، بے اعتمادی کی فضا صاف ہوئی، غلط فہمیاں دُور ہوئیں، ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کے مواقع ملے، اور یہ نقطۂ آغاز تھا اس معرکے کا جو آنے والے برسوں کے دوران اسمبلی سے باہر لڑا گیا جس میں پوری قوم کے آزاد جذبوں کا اظہار ہوا — جس نے کبھی متحدہ جمہوری محاذ (یو ڈی ایف) اور کبھی پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کی صورت میں قوم کے حقوق کی لڑائی لڑی، اور قدم قدم ان کو شکست دی کہ جو اقتدار کے نشے میں نتائج سے بے پروا ہو گئے تھے۔

اس تمام سفر کے دوران مفتی صاحب سے گہرا رابطہ رہا، ان کو قریب سے دیکھنے، سُننے اور ملنے کا اتفاق ہُوا اور ان کی عزت میرے دل میں مسلسل بڑھتی رہی۔ تفصیلی یادداشتیں کبھی مرتب ہوں گی، تو واقعات اور حالات کی تفصیل سامنے آئے گی مختصراً یہ عرض کروں گا کہ:

(۱) قومی اسمبلی کے اندر چھوٹی جماعتوں میں رابطے کا جو آغاز ہوا، اس کا مفتی محمود صاحب بھی ایک بڑا سبب بنے۔ ان کی شخصیت اور سُوجھ بُوجھ نے اس کا تعلق آسان بھی بنایا اور مضبوط بھی۔

(۲) مفتی صاحب میں معاملات کی فہم بھی تھی اور حرفِ ضبط بھی بلا کا تھا۔ مختلف اجلاسوں کے دوران مَیں نے دیکھا کہ جب ان پر تنقید کی جاتی تھی، یا ان کے کسی رویّے پر اعتراض کیا جاتا تھا، تو وہ برافروختہ نہیں ہوتے تھے، مشتعل نہیں ہوتے تھے، معترض کو ٹوکتے نہیں تھے۔ پورے سکون کے ساتھ بات سُنتے اور پھر بڑے ٹھنڈے دل سے اس کا جواب دیتے تھے اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

(۳) فروعی اور فقہی اختلافات کو حد سے بڑھانے کے سخت خلاف تھے، کسی دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والے صاحب کے پیچھے انہیں نماز پڑھنے سے گریزاں نہیں دیکھا، اور تو اور، ایک دن انہوں نے میری موجودگی میں مولانا نورانی میاں صاحب سے کہا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی بنیادی نوعیت کا اختلاف نہیں ہے، فقہی معاملات میں ہمارا اور آپ کا موقف یکساں ہے، پھر کیوں نہ ہم ایک مشترکہ جماعت کی تشکیل کر لیں — مفتی صاحب جب یہ کہہ رہے تھے، تو بالکل سنجیدہ تھے، لیکن انہیں کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔

(۴) یادداشت پر بے حد زور ڈالنے کے باوجود مَیں کوئی چیز ان کے خلاف نہیں ڈھونڈھ سکتا۔ انہیں کبھی ایک جماعت کے لیڈر کے طور پر بات کرتے نہ سُنا، وہ ہمیشہ سب کے رہے، سب ہی کے نظر آئے۔ انہیں حلیف سیاسی جماعتیں مشترکہ متاع سمجھتی تھیں اور لاریب وہ تھے بھی — صرف ایک موقع پر اور وہ بھی اس وقت جبکہ صوبہ سرحد کی انتخابی نشستوں کی تقسیم ہو رہی تھی، پاکستان قومی اتحاد کے اجلاس میں انہوں نے اپنی جماعت کے حق میں سخت موقف اختیار کیا۔

(۵) نیپ کا تعاون انہوں نے جس طرح حاصل کیا، اس سے ان کے تدبّر کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے — نیپ کو یہ فائدہ ہُوا کہ دینی جماعتوں کے ساتھ اس کی دُوری ختم ہوئی۔ اگرچہ خان عبدالولی خاں کا رویّہ بھی بڑا فراخدلانہ رہا اور انہوں نے وسیع تناظر میں چیزوں کو پرکھا، لیکن کہا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب کا بھی اس میں بڑا حصّہ ہے۔ نیپ نے جو سیکولرازم کی علمبردار تھی، تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوّت کے دوران احمدی حضرات کو اقلیت قرار دینے کے حق میں موقف اختیار کیا اور دوسری حلیف جماعتوں کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔

(۶) تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوّت کے دوران بھی قومی اسمبلی کے اندر اور باہر مفتی صاحب بڑے سرگرم رہے۔ ان کی بصیرت نے، ان کے علم نے، اور ان کی محنت نے ہمارا مسلسل ساتھ دیا۔ ان دنوں بھی ہم لوگ، جو قومی اسمبلی کے اندر تھے، رات رات بھر جاگ کر تیاری کرتے تھے۔ مرزا ناصر احمد جب قومی اسمبلی میں اپنا موقف بیان کرنے آئے، تو کسی رُکن کو اُن سے براہِ راست سوال پوچھنے کی اجازت نہیں تھی۔ طریقِ کار

www.tezpakistan.com

یہ طے کیا گیا تھا کہ اٹارنی جنرل کی وساطت ہی سے سوال کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی رُکن نے کوئی سوال کرنا ہوتا، تو وہ لکھ کر اٹارنی جنرل کو چٹ بھیج دیتا، وہ اسے اپنے طور پر پُوچھتے۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ ان سوالات کے نتیجے میں مرزا صاحب کی اپنی زبان سے یہ اعلان سرزد ہو گیا کہ وہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔

(۷) مفتی صاحب نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انہوں نے جس معاملے کو حق سمجھا، اس کے لیے جان تک لڑا دی۔ وزارتِ اعلیٰ کا ایوان ہو یا جیل کی دیواریں، کوئی بھی ان کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکا۔ انہوں نے اصول کی خاطر بلوچستان کی صوبائی حکومت کو غیر آئینی طور پر برطرف کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے، وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور جب جیل میں تھے اس وقت بھی مسٹر بھٹو کی شرائط پر مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اپنی شرائط پر اصرار جاری رکھا، انہیں منوایا۔

(۸) مفتی صاحب مرحوم کو انگریزی زبان پر عبور نہیں تھا۔ وہ مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے، مغربی علوم سے بھی شناسائی نہیں تھی، مگر جب وہ کسی بل پر یا کسی آئینی اور قانونی مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے تو معاملے کی تہہ تک پہنچ کر بات کرتے تھے۔ وہ صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ رہے، اور معاملات کو حُسن و خوبی سے چلایا۔ انہوں نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ مدرسے کا پڑھا ہوا ایک "مولوی" بھی بہترین ایڈمنسٹریٹر بن سکتا ہے۔

(۹) مفتی صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ سیاسی معاملات کو سیاسی معاملات کے طور پر دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ نہ مذہبی تعصبات کو ان پر اثر انداز ہونے کی اجازت دیتے تھے اور نہ غیر سیاسی اقدامات کی تائید پر آمادہ ہوتے تھے۔ انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم کے لیڈر کی حیثیت سے اس بات کی مسلسل کوشش کی کہ سیاسی عمل جاری رہے، لیکن افسوس مسٹر بھٹو نے تعاون نہ کیا۔ مفتی صاحب نے قومی اتحاد کے اندر بھی دباؤ کا سامنا کیا، اور ایئر مارشل اصغر خاں صاحب کے اس موقف سے اتفاق نہ کیا کہ مارشل لا لگ جانا چاہیئے۔ خاں صاحب کہتے تھے کہ مسٹر بھٹو کی موجودگی میں انتخابات منصفانہ نہیں ہوں گے، اس لیے مارشل لا نافذ ہو جانا چاہیئے۔ نوّے دن کے اندر اندر انتخابات کرا کر مارشل لا اُٹھا لیا جائے گا — لیکن مفتی صاحب سیاسی عمل کے جاری رہنے پر اصرار کرتے تھے۔ اگر مسٹر بھٹو تعاون کرتے، اور نکتہ آفرینیوں سے گریز کرتے، تو سیاسی عمل جاری رہ سکتا تھا۔

مسٹر بھٹو سے طویل مذاکرات کے بعد، ان کا موقف معلوم کرنے کے بعد ہم نے اپنی طرف سے معاہدے کا ایک مسوّدہ تحریر کیا، اسے قومی اتحاد کی مرکزی کونسل نے منظور کیا اور مذاکراتی ٹیم سے کہا کہ اس میں اب کوئی تبدیلی منظور نہ کی جائے۔ اس مسوّدے کے ہر صفحے پر مفتی صاحب نے دستخط کیے اور اس کی ایک ایک فوٹو سٹیٹ کاپی ہر جماعت کو دے دی گئی۔ ہم نے اسے لے جا کر مسٹر بھٹو کو دیا، انہوں نے اس میں بعض ترامیم تجویز کیں جو کسی خاص اہمیت کی حامل نہ تھیں۔ اگر مسٹر بھٹو اس مسوّدے کو قبول کر لیتے کہ یہ اُن سے مذاکرات کی روشنی میں، اور ان کے نتیجے ہی میں مرتب کیا گیا تھا، تو حالات کوئی اور رُخ اختیار نہ کرتے، لیکن مسٹر بھٹو نے ان میں ایسی ترامیم تجویز کر کے کہ جو بنیادی نوعیت کی نہیں تھیں، اور میرے خیال میں محض نکتہ آفرینی کی مثال تھیں، مذاکرات کو طول دے دیا — کہ ہمیں پھر قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کے سامنے جا کر اس کا ردِ عمل معلوم کرنا تھا۔

(۱۰) مفتی صاحب، اتحاد کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اس کے لیے اپنی رائے کے برعکس بھی فیصلے ماننے سے انہیں انکار نہیں ہوتا تھا۔ شخصی طور پر وہ مارشل لا کے تحت وزارتیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، مگر جب ایک جماعت نے اتحاد سے بالا بالا وزارتیں قبول کر لیں، تو پھر اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے انہوں نے بھی حالات کا از سرِ نو جائزہ لیا اور اتحاد کو بچا لیا۔

(۱۱) مفتی صاحب کو ملک کے معاملات اور حالات سے اس قدر گہری دلچسپی تھی کہ انہوں نے خرابیٔ صحت کے باوجود، اور ڈاکٹروں کی تلقین کے باوجود اپنی سرگرمیوں کو محدود کرنے پر اتفاق نہیں کیا۔ میری اُن سے آخری ملاقات کراچی ہسپتال میں ہوئی۔ وہ سخت علیل تھے، اور انہیں "انٹینسو کیئر" میں رکھا ہوا تھا۔ مَیں ملنے پہنچا، تو اجازت نہیں مل رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر کی منّت سماجت کر کے ان کے کمرے تک پہنچا۔ مجھے دیکھا، تو اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا، اور ایک گھنٹے تک مُلکی معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ اپنی صحت کے بارے میں شاید ہی کچھ کہا ہو۔

www.tezpakistan.com

آخر نرس نے آکر یہ ملاقات ختم کرائی، اور کہا کہ اب مزید اجازت نہیں مل سکتی۔
اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ مفتی صاحب کے جذبۂ اتحاد، تدبّر، اُن کے حوصلے، ان کی تقوے اور ان کی معاملہ فہمی کو عام کردے۔

سردار عبدالقیوم خان (سابق صدر، حکومت آزاد کشمیر)

وہ اپنے
دُشمنوں کی عزّت کو بھی
عزیز رکھتے تھے۔
اب قومی سطح کا کوئی رہنما نہیں
جو ہر صُوبے کو عزیز ہو!

مجھے صحیح طور پر تو یاد نہیں کہ میری اور مفتی صاحب کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی، لیکن تعلق اور رابطہ خاصا قدیم ہے۔ یہ تعلق اس وقت زیادہ پختہ ہوا جب صوبہ سرحد میں بطور وزیرِ اعلیٰ ان کی اعلیٰ کارکردگی میرے سامنے آئی۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے تین بار آزاد کشمیر میں حکومت بنانے کا موقع دیا ہے۔ مَیں نے جب تیسری بار ۱۹۷۰ء میں آزاد کشمیر میں منصب صدارت سنبھالا، تو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات کا فیصلہ کیا۔ اس وقت بھی مفتی صاحب سے راہ و رسم موجود تھی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ان کی جماعت لاہور کے مرکزی دفتر میں مجھے ایک دعوتِ استقبالیہ بھی دے چکی تھی۔ اس کے علاوہ آزاد کشمیر میں موجود مفتی صاحب کے عقیدت مند علما اور شاگرد میرے پُرزور حامی تھے۔ ان امور کی وجہ سے ہمارے درمیان ایک غیر رسمی اور قلبی رابطہ موجود تھا، چنانچہ جب مَیں نے آزاد کشمیر میں اسلامی نظام کے احیاء کے لیے عملی اقدامات شروع کیے، تو مجھے علما سے مشورے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مَیں نے اس موقع پر دو کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک یہ کہ اسلامی نظام کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے علما سے مشورہ حاصل کروں۔ دوسرا یہ کہ گفتگو کی انہی علمی مجلسوں کے ذریعے مختلف مکاتیبِ فکر کے علما کی جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، کیونکہ میری دیانتدارانہ رائے یہ تھی کہ جب تک علمائے کرام متحد نہیں ہوں گے، پاکستان یا آزاد کشمیر میں اسلامی نظام کی تحریک کی کامیابی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔ یہ سوچ کر مَیں نے پاکستان کے مختلف الخیال علما سے رابطہ قائم کیا، اُن کی باتیں سُنیں، اپنا نقطۂ نظر سمجھایا، مسائل پر دلائل چلتے رہے، دلائل پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور اس کوشش و کاوش کے نتیجے میں قدرت نے میری نیت کے صلے میں دو ثمرات عطا فرمائے۔

پہلا ثمر یہ تھا کہ مجھے علمائے کرام بالخصوص مولانا محمد یُوسف بنوریؒ اور مفتی محمود سے انتہائی اہم علمی مشورے ملے جن کی روشنی میں مَیں نے کام کو آگے بڑھایا اور یہ جان کر مجھے بے پایاں مسرت ہوئی کہ ان کی علمی ملاقاتوں اور مشوروں کی روشنی میں، مَیں نے جو اقدامات کیے، ان کے

www.tezpakistan.com

خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور مشکلات کم سے کم تر ہوتی چلی گئیں۔ مَیں اپنے تجربات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی نظام وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں جنہوں نے اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور جو اسلام کے بنیادی تقاضوں سے آگاہ ہونے کے علاوہ اس کے عملاً پیروی کرنے والے ہوں۔ صرف زبانی طور پر اس کا نام لینے اور بے خبری کے عالم میں نوبہ نو اقدامات کرنے والے اس بھاری پتھر کو چوم تو سکتے ہیں، اُٹھا نہیں سکتے۔

دوسرا ثمر یہ تھا کہ تھوڑی ہی محنت کے نتیجے میں قدرت نے مختلف الخیال علما اور جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ دُوریاں قربت اور نفرتیں محبت میں بدل گئیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ثمر مجھے ہی نہیں، اُن علمائے کرام کو بھی ملا جو باہم مل بیٹھے تھے؛ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں فاصلوں کے باعث اگر وہ منزلِ مُراد سے بہت دُور تھے، تو ۱۹۷۷ء میں قربتوں کے باعث منزلِ مُراد اور مرحلۂ اُمید سے بہت قریب ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ وقت اور حالات نے انہیں پابہ زنجیر بنا دیا، لیکن شوقِ عمل اور ذوقِ جنوں میں کمی واقع نہیں ہوئی؛ تاہم جو مشکلات درپیش ہیں، وہ بھی اتحاد کی فضا کے تکدر کا نتیجہ ہیں، جونہی یہ تکدر ختم ہو گا کردار و ولولہ کی آنچ آنے لگے گی اور قافلے سُوئے منزل گامزن ہو جائیں گے۔

۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک میرے اور مفتی صاحب کے باقاعدہ تعلقات کا پہلا دور تھا۔ اس دور میں مَیں نے انہیں بحیثیت عالم مفتی اور حکمران بہت قریب سے دیکھا۔ جب وہ صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے، اس وقت باتوں اور ملاقاتوں میں اضافہ ہوا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ وہ ایک کامیاب حکومت کے بانی و رہنما ہیں، لیکن اس احساس میں اس وقت یقین بھی شامل ہو گیا جب مَیں نے ان کے سینیئر افسروں سے ملاقات کر کے ان کی باتیں سُنیں۔ مجھے ان کے اعلیٰ افسروں نے بتایا کہ مفتی صاحب ہر کام پورے اعتماد اور حوصلے سے کرتے ہیں اور یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ حکومت میں آنے کا ان کا یہ پہلا موقع ہے۔ بعض افسروں نے تو خود مجھ سے سوال کیا کہ مفتی صاحب بڑے تجربہ کار وزیرِ اعلیٰ ہیں۔ یہ پہلے کب اور کس صوبے میں وزیر رہے ہیں؟ مَیں نے جب انہیں بتایا کہ مفتی صاحب پہلی بار وزیر بنے ہیں، تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے جیسے انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔

جب بھٹو حکومت نے بلوچستان میں نیپ کی وزارت کو دھونس اور دھاندلی سے توڑ دیا، تو مفتی صاحب بھی صوبہ سرحد کی وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ مسٹر بھٹو چاہتے تھے کہ مفتی صاحب کام کرتے رہیں اور انہیں دوبارہ راضی کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ انہی کوششوں کے دوران بھٹو نے مجھے کہا آپ مفتی صاحب کو سمجھائیں، ہم نے اُن سے کوئی تعرض نہیں کیا، تو وہ ہم سے کیوں تعرض کرتے ہیں اور آرام سے حکومت کیوں نہیں کرتے؟ مَیں نے ہنستے ہنستے برسبیلِ تذکرہ مفتی صاحب سے بات کی، تو وہ انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگے: صوبہ سرحد میں میری وزارت دراصل دو جماعتوں کے اتحاد اور معاہدے کا نتیجہ تھی، جب ایک صوبے میں بھٹو صاحب نے حکومت توڑ دی ہے، تو اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ مَیں صرف بھٹو صاحب کی خواہش پر حکومت کروں؟ مَیں نے پوچھا: "کیا نیپ جمعیت کے درمیان ہونے والے معاہدے میں یہ شرط شامل ہے؟" اس پر مفتی صاحب نے فرمایا: "ہمارے معاہدے میں شرط شامل ہو نہ ہو، اسلام میں تو یہ بات موجود ہے کہ اپنوں سے بے وفائی نہ کی جائے۔ یہ لوگ آخر مجھ سے اس بات کی کیوں توقع رکھتے ہیں کہ مَیں وزارت کی خاطر اپنے دوستوں کو چھوڑ دوں گا۔ ایسا نہیں ہو گا، کبھی نہیں ہو گا۔" مَیں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ مفتی صاحب کے کردار کے اس پہلو نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

اس کے بعد جُوں جُوں میرے اور مفتی صاحب کے روابط و تعلقات بڑھے، ان کی ذات پر میرا اعتماد بھی بڑھتا گیا؛ چنانچہ آزاد کشمیر میں ۱۹۷۵ء کے ہونے والے عام انتخابات کے موقع پر مفتی صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ مَیں ان انتخابات کا بائیکاٹ کروں، کیونکہ ان کی معلومات کے مطابق ان انتخابات میں "انتخابات" کا صرف نام استعمال کیا جائے گا اور کچھ نہیں ہو گا۔ ہر چند کہ اس وقت آزاد کشمیر میں میری انتخابی مہم چل رہی تھی اور حکومت نے مجھے پنڈی روک رکھا تھا۔ مجھے اپنے حلقۂ انتخاب میں جانے سے روکنا بہت غیر معمولی اقدام تھا، لیکن میرا خیال تھا کہ حکومت کی دھاندلی کے باوجود مَیں جیت جاؤں گا، تاہم مَیں نے مفتی صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ بعد میں جو اطلاعات میرے علم میں آئیں، انہوں نے مفتی صاحب کے بیان کی تصدیق کر دی۔ اگر بات دھاندلی تک ہی محدود ہوتی، تو پھر بھی میری جیت یقینی ہوتی، یہاں تو معاملہ ہی اور تھا، حکومت نے پہلے ہی اپنے پسندیدہ اُمیدوار کے بیلٹ بکس بوگس ووٹوں سے بھر دیے تھے۔ ان حالات میں میرا انتخابات میں حصّہ لینا نہ لینا برابر تھا۔ اگر مَیں انتخابات میں حصّہ لیتا، تو حکومت کی نیک نامی ہوتی اور میری شکست، کیونکہ

www.tezpakistan.com

مخالف اُمیدوار کے بکس تو پہلے ہی بھرے جا چکے تھے۔ پولنگ اسٹیشنوں پر محض ڈرامہ کرنا باقی تھا جو میرے بائیکاٹ کے باوجود کیا گیا۔ مجھے بائیکاٹ کا مشورہ دیتے وقت مفتی صاحب کے پیشِ نظر ان کی معلومات ہی نہیں، بلکہ ان کی سیاسی بالغ نظری اور ایمانی فراست بھی تھی۔ یہاں تک تو میرے ذاتی اعتماد کی بات ہے، واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب کی ذات پر ملک کے دوسرے رہنما بھی اعتماد کرتے تھے، بلکہ مَیں اپنے مشاہدات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ مفتی صاحب کے علاوہ میری نظر سے آج تک کوئی ایسا رہنما نہیں گزرا جس پر اس کے رفقا اور متعلقین اتنا اعتماد کرتے ہوں۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے مولانا محمد علی جوہرؒ اور دوسرے بعض علما حضرات ایسے گزرے ہیں جنہیں اجتماعی طور پر عوامی تائید و حمایت اور اعتماد میسّر آیا ہے، لیکن یہ ایک کتابی بات ہے۔ مَیں نے مفتی محمود صاحب پر قوم کے مختلف الخیال افراد اور قومی رہنماؤں کو اعتماد کرتے ہوئے دیکھا، تو مولانا محمد علی جوہرؒ جیسے علما کے بارے میں کتابوں میں جو لکھا ہے، اس پر یقین آگیا۔

جہاں تک مفتی صاحب کی علمی اور سیاسی حیثیتوں میں سے کسی ایک حیثیت کو دوسری حیثیت پر ترجیح دینے کا سوال ہے، تو یہ ایک مشکل بات ہے، مَیں نے ان کو دونوں حیثیتوں میں دیکھا، ان کی دونوں حیثیتوں پر غور کیا۔ مَیں نے انہیں علمی اور سیاسی ہر دو اعتبار سے غیر معمولی انسان پایا، البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی ذات شخصیت اور وجود پر علم غالب تھا۔ بسا اوقات یُوں محسوس ہوتا تھا کہ سیاست میں وہ مجبوراً حصّہ لے رہے ہیں، ان کی اس سے ذاتی دلچسپی نہیں، ان کی دلچسپی کا مرکز صرف اور صرف علم ہے۔

علم کے ساتھ ایک اور چیز جو مفتی صاحب کی ذات پر غالب تھی، وہ ان کا حلم تھا۔ وہ بیحد وسیع القلب اور وسیع نظر انسان تھے۔ عفو و درگزر کو زیادہ پسند کرتے تھے اور بلاوجہ بات کو بڑھانے کے قائل نہ تھے۔ اس کی مختلف مثالیں میرے سامنے موجود ہیں۔

مسٹر بھٹو کے ساتھ جمہوری جنگ کے دوران ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ان سے کوئی رہنما بات یا ملاقات نہیں کرے گا۔ ایک بار ایسا ہُوا کہ مفتی صاحب نے ملاقات کی اور اس کے بعد اس ملاقات میں ہونے والی باتوں سے دوسرے رفقا کو مطلع کیا۔ ان کی اس ملاقات پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، لیکن مَیں اپنے طور پر پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ جب بات طے ہو چکی ہے کہ بھٹو سے ملاقات نہیں کرنی، تو پھر آپ نے ملاقات کیوں کی؟ مفتی صاحب ہنس کر کہنے لگے: "خدا کے بندے، ملاقات نہ کرتا تو کیا کرتا، بات ہی ایسی تھی کہ بھٹو سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔ میرے پاس ایلچی کے طور پر مسٹر سعید احمد خاں آئے اور کہنے لگے ایک بار بھٹو صاحب سے ضرور مل لیں۔ مَیں نے انکار کیا، تو اس اللہ کے بندے نے میرے پاؤں میں اپنی ٹوپی رکھ دی۔ کہنے لگا "مفتی صاحب! یہ میری عزت کا مسئلہ ہے، مَیں بھٹو صاحب سے کہہ آیا ہوں کہ مَیں مفتی صاحب کو منا لُوں گا، اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔" مَیں نے سوچا اگر میرے بھٹو کے ساتھ ایک بار ملنے سے اس آدمی کی عزت بچ سکتی ہے، تو مل لینے میں کیا حرج ہے؟ اِس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب کی ذات پر حلم اور بُردباری کا کتنا غلبہ تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کی عزت کو بھی عزیز رکھتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ مسٹر سعید احمد خاں کی ذات سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مفتی صاحب ان اوصاف کے ساتھ ساتھ "ٹیبل ٹاک" کے بھی بڑے ماہر تھے۔ بھٹو کے آخری دَور میں جب فریقین کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی مذاکراتی ٹیم حکومت کی مذاکراتی ٹیم سے علم، عقل، تجربے اور دلائل میں کسی طرح بھی کم نہ تھی، بلکہ مفتی صاحب کے رفقا بعض مسائل میں سرکاری ٹیم کے ارکان سے زیادہ فہم رکھتے تھے، لیکن مفتی صاحب کا طرزِ استدلال سب سے نرالا تھا۔ مسٹر بھٹو جب کسی بات پر اڑ جاتے تھے، تو انہیں راہِ راست پر لانا مشکل ہوتا تھا، لیکن مفتی صاحب الزامی جواب، زورِ استدلال اور اپنے منطقیانہ طرزِ تکلم سے انہیں راہِ راست پر لے آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاکرات کے دوران کبھی تو تعطل پیدا ہو جاتا تھا اور کبھی یکایک پیش رفت ہو جاتی تھی۔ یہی وہ دو مراحل تھے جہاں دو شخصیتوں کے دلائل کا ٹکراؤ ہوتا تھا۔ جب مسٹر بھٹو کسی بات پر اڑ جاتے تھے، تو مذاکرات تعطل کا شکار ہو جاتے تھے اور جب مفتی صاحب دلائل سے انہیں راہِ راست پر لے آتے تھے، تو مذاکرات میں پیدا ہونے والا تعطل ختم ہو جاتا تھا۔ بالخصوص آخری مذاکرات کا مرحلہ تو انتہائی نازک تھا۔ مذاکرات کا یہ دَور کئی بار ٹوٹنے کے بعد شروع ہوا تھا۔ اس میں سابقہ حالات و واقعات کی تلخیاں بھی شامل تھیں۔ فریقین کی طبیعت میں تکدّر پیدا ہو چکا تھا۔ یہ اتفاق ہی ہُوا کہ ان مذاکرات کو دوبارہ شروع کرانے کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہو گئی اور مَیں ایک "حادثہ"

www.tezpakistan.com

کے طور پر درمیان میں آگیا۔ ہمارے تمام رفقا مختلف جیلوں میں تھے۔ بھٹو صاحب مجھے کہنے لگے "مذاکرات ہونے چاہییں۔ میں نے کہا "قیدی اور حکمران کیا مذاکرات کر سکتے ہیں؟ اگر آپ ان رہنماؤں کو جیل میں بند کر کے مذاکرات کرنا چاہتے ہیں، تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ پہلے مذاکرات کے لیے آزاد اور خوشگوار فضا پیدا کریں، اس کے بعد مذاکرات کی بات کریں۔ بھٹو صاحب کہنے لگے "میں تو انہیں "سہالہ کیمپ" میں بلا کر باعزت طور پر رکھنا چاہتا ہوں اور آبرومندانہ طریقے سے بات کرنے کا خواہشمند ہوں۔ اب سوال یہ تھا کہ اُن کے پاس جا کر اُن کی رائے کون دریافت کرے، پہلے تو انہوں نے نوابزادہ نصراللہ خاں صاحب سے کہا، انہوں نے اپنی علالت کے باعث یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار مجھے کہا گیا کہ میں اپنے ساتھیوں کی رائے معلوم کر کے بھٹو صاحب کو مطلع کروں۔ یہ درست ہے کہ میں نے اپنے ساتھیوں کی رائے طلب کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے رفقا کو مذاکرات پر آمادہ بھی کیا، کیونکہ میری دیانتدارانہ رائے یہ تھی کہ بات چیت ہی میں مسئلے کا حل ہے اور مذاکرات ہی میں ہماری کامیابی ہے۔ خود مفتی صاحب، نوابزادہ نصراللہ خاں اور پروفیسر عبدالغفور احمد کی بھی یہی رائے تھی، لیکن حتمی فیصلہ تو سب نے مشورے سے کرنا تھا، چنانچہ جب آخری بار میں نے ساتھیوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی، تو تمام احباب مذاکرات پر آمادہ ہو گئے۔ مفتی صاحب نے ان مذاکرات میں جس حوصلے اور تدبر کا ثبوت دیا، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مفتی صاحب کی شخصیت ہی ناقابلِ فراموش تھی۔ ایک بات میں بطور خاص کہنا چاہتا ہوں کہ سرحد یا بلوچستان میں کوئی علیحدگی کی تحریک موجود تھی یا نہیں، اس بات سے قطع نظر یہ الزام بہرحال موجود تھا۔ مفتی صاحب کو نہ صرف ان دو صوبوں میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا، بلکہ ان کی مدبرانہ حکمتِ عملی کے باعث وہ لوگ بھی ان کی بات مانتے تھے جن پر علیحدگی کا الزام لگایا جاتا ہے اور مفتی صاحب کی موجودگی میں کوئی ایسی تحریک وہاں پنپ نہیں سکتی تھی۔ مفتی صاحب کی وفات کے بعد ملک میں قومی سطح کا کوئی رہنما نہیں رہا جو ہر صوبے میں یکساں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ اس اعتبار سے مفتی صاحب کا وجود ملک کی اہم ترین ضرورت تھا۔

بیگم نسیم ولی خان

مولانا مفتی محمود —
حاجی بلّور کے گھر سے
مذاکرات کی میز تک

ہمارا گھرانا شروع سے سیاست کے میدان میں سرگرم ہے۔ شادی سے پہلے میں اپنے والد کی وجہ سے سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتی تھی۔ شادی

www.tezpakistan.com

ہُوئی تو سُسرال میں بھی تقریباً ایسا ہی ماحول مِلا اور یُوں میری سیاسی معاملات سے وابستگی بڑھتی گئی۔ مفتی محمود صاحب کا نام مَیں نے ایک عرصے سے سُن رکھا تھا اور ان کے لیے دِل میں ایک عقیدت سی تھی۔ وہ ہمارے ہاں آتے، خان صاحب سے ملتے اور چلے جاتے۔ مَیں کبھی ان کے سامنے نہ آئی کہ مَیں پردے میں ہُوا کرتی تھی، پھر حالات کی مجبُوری، خوش بختی یا بد بختی کہہ لیجیے کہ مجھے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا پڑا اور پہلی بار پشاور میں حاجی بلور صاحب کے ہاں میری مفتی صاحب سے پہلی مُلاقات ہُوئی۔ مفتی صاحب کے مرتبے، سوچ اور مذہبی بالادستی جو خدا نے انہیں دی تھی، کے پیشِ نظر بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ سچی بات ہے۔ مجھے ان سے ملنے میں کچھ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ یہ بھی تاثر تھا کہ مفتی صاحب عورتوں سے ملنا پسند نہیں فرماتے۔ مَیں نے حاجی صاحب سے کہا کہ حاجی صاحب مُلاقات کا یہ مرحلہ بڑا کٹھن لگ رہا ہے۔ انہوں نے ہمت بندھائی اور کہا، حوصلہ نہ ہارئیے خان صاحب کی بندش کے بعد مفتی صاحب آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ قصّہ مختصر، مفتی صاحب سے مَیں مِلی۔ انہوں نے اِس ملاقات میں جو پہلی بات کہی وہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ انہوں نے کہا: بیگم صاحبہ! خان صاحب اپوزیشن لیڈر تھے۔ ان کی نظر بندی کے بعد ساتھیوں نے مجھے ان کی جگہ منتخب کیا ہے۔ انہیں اسمبلی کی طرف سے اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے جو تنخواہ مِلا کرتی تھی، مَیں وہ آپ کو دینے آیا ہُوں۔

مجھے بہت ہنسی آئی۔ مَیں نے کہا، مفتی صاحب یہ میری آپ سے پہلی مُلاقات ہے اور سیاسی طور پر مَیں آپ سے بہت کمتر درجے میں ہُوں، لیکن یہ مجھے خان صاحب نے نہیں کہا کہ میرے بعد اسمبلی میں جو میرے وارث ہوں گے، ان سے روپے پیسے کا حساب کتاب تم لیا کرنا۔ یہ ناممکن سی بات ہے۔

مفتی صاحب نے جواب دیا، اس پر میرا حق نہیں بنتا۔ مَیں بولی، جب ساتھیوں نے آپ کو خان صاحب کی جگہ دے دی ہے، تو پھر یہ مشاہرہ بھی خود بخود آپ کا حق بن جاتا ہے۔

یہ پہلی اور مختصر سی مُلاقات تھی۔ اس کے خاتمے پر ہم دونوں اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن مَیں نے اور مفتی صاحب نے مِل کر کوئی تحریک چلانی ہے۔

مذہبی رہنماؤں کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ نہ تو عورتوں سے مِلنا پسند کرتے ہیں نہ ان سے بات کرنا۔ مفتی صاحب سے مُلاقات کے وقت میرے دِل میں بھی کچھ یہی اندیشہ اور کھٹکا تھا کہ نہ جانے وہ میرے ساتھ کیسا رویہ اختیار کریں، لیکن ان سے مِلنے کے بعد میرے تمام اندیشے باطل ثابت ہُوئے۔ ان سے بات کر کے یُوں لگا کہ نہ تو مفتی صاحب کو مجھ سے بات کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی اور نہ وہ مجھے یہ تاثر دے رہے تھے کہ مجھے چاہیے کہ مَیں ان سے بات کرتے ہُوئے جھجکوں۔ ان کا انداز ایک شفیق بزرگ کا سا تھا۔ انہیں خان صاحب سے ایک تعلق تھا اور وہی تعلق اب میرے لیے خلوص اور شفقت میں ڈھل گیا تھا۔ یہ میرا ان کے متعلق پہلا تاثر تھا۔ پھر جُوں جُوں ان کے ساتھ ربط ضبط بڑھا اور مِلنے کا اتفاق ہُوا، مَیں نے اپنے اس تاثر کا رنگ کم ہونے کے بجائے مزید گہرا ہوتے دیکھا۔

..... پھر این ڈی پی بنی۔ پارٹی بنتے وقت مَیں موجود نہیں تھی۔ خان صاحب سے مِلنے گئی تھی۔ انہیں پنڈی میں ریویو بورڈ کے سامنے لایا گیا تھا۔ وہاں بیگم محمودہ سلیم نے مجھ سے کہا کہ سردار شیر باز خان مزاری ایک پارٹی بنانے کے لیے بات چیت چلا رہے ہیں۔ سردار صاحب سے اسمبلی کے دنوں کی واقفیت اور ملاقات تھی۔ مَیں ان سے مِلنے گئی، لیکن ان کی پریس کانفرنس میں جس میں وہ پانچ نکاتی پروگرام کا اعلان کر رہے تھے، اس میں مَیں بیٹھی نہیں، کیونکہ میرا ذہن اس وقت یہ سوچنے پر آمادہ ہی نہیں تھا کہ مَیں نے گھر، گھر داری کے جھنجھٹوں سے نکل کر سیاسی لائن لینی ہے۔ خان صاحب جیل میں تھے، بیٹا بھی جیل میں تھا اور گھر میں جوان بچیاں تھیں۔ غرض حالات کچھ ایسے تھے کہ مَیں اپنے آپ کو سیاست کے لیے SPARE نہ کر سکتی تھی اور نہ مَیں ذہنی طور پر عملی سیاست کے لیے تیار تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک بار کراچی میں تھی کہ وہاں کے ایک شام کے پرچے میں اپنے متعلق خبر پڑھی۔ خبر یہ تھی کہ مَیں نے این ڈی پی جوائن کر لی ہے۔ میرے لیے عجب مُشکل صورت پیدا ہو گئی۔ اس راہ پر چلنے سے انکار کرتے بھی بن نہ پڑتا اور اسے اپنانے میں بھی مشکل محسوس ہو رہی تھی۔ سوچ بچار کے بعد آخر کار این ڈی پی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ وقتی طور پر اس خیال سے کہ لوگ کہیں یہ تاثر نہ لے لیں کہ ہمارا گھرانا سیاست سے الگ

www.tezpakistan.com

تھلگ ہو رہا ہے۔ خیال یہی تھا کہ میں چار آنے کی ممبر بنوں گی اور پارٹی کا ایک نام رہے گا، بہرصورت جو اس وقت خدا کو منظور تھا۔ میں اس میں بھی ایک مصلحت سمجھتی ہوں کہ ہوتے ہوتے حالات نے ایسا رُخ اختیار کر لیا کہ مجھے مجبوراً میدانِ عمل میں اُترنا پڑا۔

مجھے قدم قدم پر اپنی پارٹی کے ساتھیوں کا تعاون حاصل رہا اور اپوزیشن کی میٹنگوں میں مفتی صاحب نے مجھے بہت سہارا دیا۔ جب اتحاد بنا اور مفتی صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے تو مفتی صاحب کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ عام میٹنگوں میں اس قُربت کا احساس اور بھی گہرا ہوتا۔ حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ دو چار لوگ کہیں بیٹھے ہوں تو فطری بات ہے کہ جو ہم زبان ہوتے ہیں، ان کا جُھکاؤ باقی لوگوں کی نسبت ایک دوسرے کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ یہی صورت حال ان میٹنگوں میں مفتی صاحب کی میرے ساتھ ہُوا کرتی تھی۔ اکثر میٹنگوں میں بیٹھ کر ان سے پشتو میں بات چیت کرتی ۔ نوابزادہ صاحب کبھی کبھی ہنس کر کہتے: یہ آپ اور مفتی صاحب ہمارے خلاف کیا سازش کر رہے ہیں۔ اس دوران تحریک چلی اور اس سلسلے میں سہالے بھی جانا پڑا۔

۱۴ مارچ کو پاکستان بھر میں مختلف شہروں میں جلوس نکالنے کا پروگرام بنا۔ لاہور میں بیٹھے جب ہم یہ پروگرام بنا رہے تھے، تو کچھ ساتھیوں نے کہا، بی بی آپ لاہور سے جلوس نکالیں گی۔ مفتی صاحب نے کہا کہ نہیں یہ لاہور سے جلوس نہیں نکالیں گی، پشاور سے نکالیں گی؛ چنانچہ مقررہ تاریخ کو جب پشاور سے جلوس نکلا، تو اس کی قیادت مفتی صاحب نے کی۔ میں ان کے ساتھ تھی۔ مسجد مہابت خان میں نمازِ جمعہ کے بعد باہر نکلے، تو پولیس نے تقریباً ہر راستہ روکا ہُوا تھا، لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود ہم سامنے ایک جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ سیڑھیوں پر چڑھ کر مفتی صاحب نے چند جملے کہے۔ پھر مجھ سے کچھ کہنے کے لیے کہا۔ میں نے کہا، آپ کی موجودگی میں مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں پہنچتا ۔ مفتی صاحب بولے، نہیں بی بی، یہ لوگ جو یہاں اتنی دُور سے اور اتنی مشکلات جھیل کر یہاں آئے ہیں، ایک اعتبار سے خان صاحب کے عقیدت مند ہیں ۔ انہیں آپ کی باتوں سے بہت تسلی ہو گی اور ان کی ہمت بندھے گی؛ چنانچہ میں نے تقریر کی۔ دو چار جملے ادا کیے تھے کہ پولیس آئی اور ڈی آئی جی ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے لے چلے۔ ہمارا تاثر یہ تھا کہ ہمیں یقیناً گرفتار کیا جا رہا ہے اور اب کسی جیل لے جایا جائے گا، لیکن ہُوا اس کے بالکل برعکس، ہمیں کمشنر ہاؤس لے جایا گیا۔ مفتی صاحب اور میں چونکہ صبح سے بھوکے تھے۔ کمشنر ہاؤس میں پولیس نے ہمیں چائے وغیرہ پلائی اور خاطر تواضع کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی۔

اس کے بعد مفتی صاحب الگ جگہ اور میں دوسری جگہ ۔ لیکن چونکہ سیاست کا محور ایک تھا، اس لیے گھوم پھر کر کہیں نہ کہیں مُلاقات ہو جاتی۔ میں نے اگر کوئی کام کرنا ہوتا تو سردار صاحب مزاری چونکہ یہاں قریب نہیں تھے تو ایک اعتبار سے میں مفتی صاحب سے ہی صلاح لیا کرتی تھی کہ مفتی صاحب یہ قدم اُٹھانا ہے یا یہ کام کرنا ہے، کیسے کریں ۔ اور چونکہ اتحاد بھی تھا اور وہ اتحاد کے صدر تھے، اس طرح باہمی مشاورت بھی ہو جاتی۔

تحریک کے دنوں کا ایک ایک لمحہ اور واقعات ایسے ہیں کہ نہ قوم کے ذہن سے مٹ سکتے ہیں نہ میرے ذہن سے ۔ اتحاد بننے سے پہلے ۔ اتحاد بننے کے بعد ۔ تحریک کے وقت ۔ اور پھر سہالے میں نظر بندی؛ ایک ایک لمحہ یادگار ۔ ایک ایک پل ناقابلِ فراموش ۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے جس دن ہمیں الیکشن کے بعد قومی اسمبلی کی سیٹوں سے احتجاجاً مستعفی ہونے اور صوبائی اسمبلیوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کرنا تھا ۔ ہماری میٹنگ لاہور میں ہونا قرار پائی تھی۔ مفتی صاحب ملتان میں تھے۔ اس وقت یاد نہیں وہ کس وجہ سے پہنچ نہ سکے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی ۔ یا شاید فلائٹ نہ مل سکی تھی، بہرحال ان کی غیر حاضری میں اجلاس ہُوا ۔ لاہور سے ان کے ایک ساتھی مولانا عبیداللہ انور صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بعض ساتھیوں کا خیال تھا کہ مفتی صاحب اسمبلی کی سیٹوں سے مستعفی ہونے والی تجویز کو پسند نہیں کریں گے۔ نوابزادہ صاحب کو اصرار تھا کہ خواہ کچھ ہو، مفتی صاحب سے بات تو کر لینی چاہیئے؛ چنانچہ ہم نے فون پر ملتان مفتی صاحب سے رابطہ قائم کیا۔

ہمارا فیصلہ یہ تھا کہ بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ قومی اسمبلی کی سیٹوں سے استعفیٰ دے دیں ۔ کچھ ساتھی راضی نہیں تھے۔ اپنا اپنا خیال اور ذہن تھا۔ وہ کہتے تھے کہ سیٹیں باقی رہیں اور اس کے بعد حکومت سے نمٹا جائے۔ کچھ ساتھی اس کے برعکس سوچتے کہ ہمیں بیک وقت اپنی سیٹوں سے استعفیٰ دینے اور بائیکاٹ کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا اس سے لوگوں پر اچھا تاثر مرتب ہو گا۔ میری ذاتی رائے بھی یہی تھی، کیونکہ ان دنوں حاکمِ وقت یہی پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ یہ لوگ کچھ کام وام تو کرتے نہیں صرف تنخواہ لینے آتے ہیں اور بائیکاٹ کرنے کے عادی ہیں ۔ مفتی صاحب سے بات ہُوئی۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگاتے ہُوئے کہا: بی بی، یہ عجیب سی بات ہے۔ یہ ہمارے منتخب ہونے والے ساتھی مانیں گے نہیں۔

www.tezpakistan.com

میں نے ہنس کر کہا، مفتی صاحب، میں عورت ذات دو سیٹوں سے استعفیٰ دے رہی ہوں، تو یہ مرد حضرات کم از کم ایک سیٹ سے استعفیٰ دینے کے لیے تو ضرور تیار ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا، بی بی آپ کو علم ہے ہم نے کن حالات میں الیکشن لڑا اور یہ چند سیٹیں حاصل کیں، اب میں ان لوگوں سے کیسے کہہ دوں کہ استعفیٰ دے دو ۔۔۔ بہرحال اگر اس وقت مفتی صاحب ساتھ نہ دیتے، تو کچھ ساتھی جو استعفیٰ دینے پر آمادہ بھی تھے، ممکن ہے اپنے ارادے سے باز رہتے اور یہ بات یوں خوش اسلوبی سے نہ ہو پاتی یا آپس میں بدمزگی اور کشیدگی پیدا ہو جاتی۔ اس وقت اتحاد حقیقی معنوں میں اتحاد تھا۔ ہم جو بات کرتے یا فیصلہ ہوتا اس میں ہمیشہ ایک دوسرے کو مطمئن کیا جاتا۔ کسی کو کسی کی نیت یا فیصلے پر شک نہیں تھا۔ ایسا ہونا ضروری تھا، کیونکہ آپس میں اعتماد ہو تو پھر ہی اتحاد ہو سکتا ہے۔

سہالے کی نظر بندی کے دوران جب حکومت سے مذاکرات کے لیے بات چیت کا آغاز ہوا اور معاملہ طول کھینچتا چلا گیا، تو اکثر ساتھیوں کو احساس ہونے لگا کہ مذاکرات نہ کیے جائیں اور اگر مجھ سے پوچھا جائے، تو میں بھی انہی لوگوں میں سے تھی جو یہ چاہتے تھے کہ مذاکرات ختم کر دیے جائیں۔ میں ابتدا میں یقیناً مذاکرات کے حق میں تھی، کیونکہ بات کرنے سے ہی بنتی ہے۔ اگر آپ کسی سے کوئی بات ہی نہیں کرتے، تو پھر کسی معاملے میں کوئی پیش رفت کیسے ممکن ہو سکتی ہے، لیکن اگر دوسرا فریق اس کوشش میں ہو کہ مذاکرات یا گفت و شنید صرف اس کی شرائط اور TERMS پر ہوں اور اس کی نیت آپ پر آشکارا ہو جائے، تو پھر اس سے مذاکرات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہی صورت یہاں تھی۔ مذاکرات کے انداز سے ہمیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ حکومت اس سے مہلت حاصل کر کے اپنی طاقت مجتمع کرنے کی فکر میں ہے اور اس کی کوشش ہے کہ لوگوں کے سامنے ہمیں جوابدہ ہونا پڑے اور وہ بری الذمہ ہو۔

یہ مذاکرات جوں جوں لمبے ہوتے گئے، لوگ مایوس ہوتے گئے۔ اتحاد کے لیڈروں کے بارے میں عام لوگوں کی جو رائے اور تاثر تھا، اسے یہ مذاکرات یقیناً DAMAGE کر رہے تھے۔ میٹنگوں میں یہ صورتِ حال زیرِ بحث آتی، فضا میں گرما گرمی پیدا ہو جاتی اور مفتی صاحب کے ساتھ ہمارا رویہ خاصا گستاخانہ اور تلخ ہو جاتا اور ان سے لڑ بھی لیتے۔ میں تو بالخصوص دل کی جو بھڑاس ہوتی، وہ ان کے سامنے نکال لیتی اور یہ صرف اس وجہ سے ہوتا کہ میں اور لوگوں کی نسبت اپنے آپ کو مفتی صاحب کے زیادہ قریب محسوس کرتی۔ وہ میری باتوں پر کبھی ہنس دیتے، کبھی غصے بھی ہو جاتے۔ ایک بار بیرسٹر ظہور سے کہا کہ اسے سمجھاؤ، یہ تو پاگل ہو رہی ہے۔ مفتی صاحب کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اتحاد کے سربراہ تھے اور ان پر ہم سے زیادہ ذمہ داریاں تھیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک طرح سے بے بس اور بندھا ہوا محسوس کرتے تھے کہ خدانخواستہ کل اگر مذاکرات نہ کرنے کی صورت میں حالات خراب ہوتے ہیں، تو لوگ کہیں گے کہ مفتی صاحب نے مذاکرات نہیں کیے اور اگر مذاکرات کرتے ہیں اور بات خراب ہوتی ہے، تو لوگ کہیں گے کہ مفتی صاحب نے مذاکرات کیوں کیے۔ ہم لوگ تو بیٹھ کر ان کو صرف کوئی مشورہ یا صلاح ہی دے سکتے تھے۔ یہ خاصا مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا، لیکن اس تمام عرصے میں مفتی صاحب نے اپنے ساتھیوں کو یہ تاثر کبھی نہیں دیا کہ وہ کسی معاملے میں ان کا ساتھ دینے سے ہچکچاتے ہیں یا تیار نہیں۔ وہ ہر ایک کی بات سن لیتے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے پن کا تاثر دیا، کبھی دھونس نہیں جمائی۔ ان کی کوشش یہی تھی کہ وہ مذاکرات کریں ضرور، لیکن اس طرح کہ اگر وہ اس کے نتیجے میں قوم کو کچھ دے نہ سکیں، تو حکومت کو اس سے کچھ چھیننے بھی نہ دیں۔

✺

سہالے کا ریسٹ ہاؤس یا جیل جہاں ہم لوگ نظر بند تھے، دو مختلف WINGS پر مشتمل ہے۔ دونوں کے درمیان ایک سڑک گزرتی ہے۔ ایک ونگ میں مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ، پروفیسر عبدالغفور، اشرف خان، میاں طفیل محمد وغیرہ مقیم تھے ——— دوسرے ونگ میں ایئر مارشل اصغر خان، شاہ احمد نورانی، سردار شیر باز مزاری، سردار عبدالقیوم خان اور میر اقیام تھا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل اور اس کا عملہ بھی ہمارے والے ونگ میں رہائش پذیر تھا۔ ہر آدمی کو ایک الگ کمرہ ملا ہوا تھا جس کے ساتھ ملحق باتھ روم تھا۔

سہالے میں پہلے دن جب اکٹھے ہوئے، تو مولانا نورانی نے کہا، بیگم صاحبہ کو کچن کا انچارج بنا دیا جائے۔ میں ہنسی اور کہا، جناب۔ میں گھر، گھرداری کے کاموں میں ذرا سست واقع ہوئی ہوں۔ اس جھنجھٹ میں نہ ڈالیں ورنہ کل آپ کو شکایت ہوگی۔ اس پر سب کی متفقہ رائے ہوئی کہ مولانا نورانی کو ہی کچن انچارج بنا دیا جائے، چنانچہ وہ ہمارے لنگر کمانڈر مقرر ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنا فرض آخر وقت تک بڑے خوبصورت طریقے سے نبھایا۔

www.tezpakistan.com

جب تک ہم لوگ وہاں مقیم رہے، اس مقام پر جیل سے زیادہ ہوٹل کا گمان گزرتا۔ صبح سویرے تمام لوگ باجماعت نماز ادا کرتے ——— میں اپنے کمرے میں پڑھ لیتی۔ پھر ناشتہ ہوتا۔ اس کے بعد باتیں ہوتیں۔ گیارہ بجے چائے یا کافی کی ایک پیالی ملتی۔ اس دوران باتوں یا بحث مباحثے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ گرمیوں کے دن تھے، اس لیے لنچ کے وقفے کے بعد تمام لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ کچھ لوگ سو جاتے، کچھ مطالعے وغیرہ میں مصروف رہتے۔ مجھے دوپہر کو سونے کی عادت نہیں تھی، اس لیے امبرائیڈری یا سلائی کا کام لے کر بیٹھ جاتی۔ شام کو دوبارہ مل بیٹھتے۔ رات تقریباً گیارہ بجے بی بی سی کی آخری خبریں سننے کے بعد یہ محفل برخاست ہو جاتی۔ ان دنوں ہمارے لیے خبروں کا واحد معتبر ذریعہ بی بی سی ہی تھا۔ ملکی ذرائع ابلاغ ناقابلِ اعتبار اور غیر معتبر ٹھہر چکے تھے۔ جو بھی خبر ہوتی، ہم اُسے بی بی سی کے حوالے سے ہی صحیح سمجھتے یا مانتے تھے۔

حکومت کی طرف سے روٹی، کپڑے اور مکان کا جو وعدہ تھا، وہ ہمارے ساتھ بالکل پورا ہوا۔ کپڑے البتہ اس وقت تک ہم اپنے ہی پہنے ہوئے تھے اور وہ ابھی بوسیدہ نہیں ہوئے تھے۔ مذاکرات اگر کچھ اور طویل ہو جاتے تو شاید اس کی نوبت بھی آجاتی۔

مفتی صاحب کی صحت ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں تھی، دوا اور پرہیز چل رہا تھا۔ سب ساتھیوں کی کوشش ہوتی کہ وہ حتی المقدور ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کریں۔ میں نے ایک مرتبہ باہر ایک ڈاکٹر سے بات کی کہ شوگر کے مریضوں کی سوچ کا انداز یا کیفیت کیا ہوتی ہے۔ فیملی میں اگرچہ شوگر چل رہی ہے، لیکن مجھے ایسے مریضوں کی ذہنی کیفیت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ ڈاکٹر نے میرے استفسار پر بتایا کہ ایسے لوگ جلد تھکن کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہی کیفیت میں مفتی صاحب کی محسوس کرتی تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرنے کے بعد وہ قریب قریب نڈھال ہو جاتے۔ ایسے عالم میں ہم جو بات بھی کرتے، اس کا جواب وہ بڑی مجبوری کے عالم میں دیا کرتے۔ اس ناگفتہ بہ حالت کے باوجود انہوں نے کئی بار طویل بحث مباحثوں اور مذاکرات میں حصہ لیا اور کئی کئی گھنٹوں تک کرسی پر بیٹھے رہے۔

انسولین کا ٹیکہ لگانے کے لیے ایک آدمی روزانہ آتا۔ اس کے علاوہ مفتی صاحب کو دن کے مختلف اوقات میں پانچ چھ قسم کی رنگ برنگی گولیاں بھی نگلنی پڑتیں۔ مفتی صاحب نے ہمارے سامنے اپنی زبان سے اپنی کسی تکلیف یا بیماری کا ذکر نہیں کیا تھا؛ چنانچہ ہم میں سے بھی کبھی کسی کو یہ پوچھنے کا خیال نہیں آیا کہ وہ یہ گولیاں کس بیماری یا مقصد کے لیے کھا رہے ہیں۔

سہالے کی نظر بندی کے دوران انہیں دو تین مرتبہ ہسپتال لے جانا پڑا۔ ان کی حالت اچانک اتنی بگڑ جاتی کہ انہیں فوراً ہسپتال منتقل کرنا پڑتا۔ ان کے ایک پاؤں کے انگوٹھے کا زخم انہیں مسلسل تکلیف دے رہا تھا۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اسے کٹوا ڈالیں۔ مفتی صاحب راضی نہیں ہو رہے تھے۔ ایک بار میں اور سردار شیر باز خان مزاری خصوصیت سے ان کے پاس کنونس کرنے گئے کہ وہ یہ انگوٹھا کٹوا دیں۔

(iii)

مذاکرات کے آغاز سے قبل ہم نے سہالے میں باہمی صلاح مشورے کے بعد ۳۲ نکات پر مشتمل ایک دستاویز تیار کر کے حکومت کو بھیجی۔ بھٹو نے اگلے دن اس پر قومی اسمبلی میں تقریر کی اور ہمیں بُرا بھلا کہا۔ اسی رات سب لیڈروں کو سہالہ سے مُلک کی مختلف جیلوں میں منتقل کرنے کے احکام جاری ہو گئے اور ساتھ ہی اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ ہمارے ساتھیوں کو راتوں رات وہاں سے منتقل کر دیا گیا۔ مفتی صاحب، پروفیسر عبدالغفور اور میں باقی رہ گئے۔ پروفیسر صاحب اس لیے پیچھے رہ گئے تھے کہ انہیں بذریعہ طیارہ کراچی جیل بھجوانا تھا۔ میرے رُکنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب پولیس کی جیپ مجھے لینے آئی، تو مفتی صاحب نے کہا کہ یہ شام کو اس وقت نہیں جائے گی۔ اس پر ان کی پولیس والوں سے خاصی لے دے ہوئی۔ پولیس والوں نے کہا: مفتی صاحب، یہ تو رات ایک بجے پشاور سے گرفتار ہو کر آئی ہیں اور ابھی تو سرِ شام ہے۔ پھر انہوں نے کچھ زیادہ دُور بھی نہیں جانا ہے، ٹیکسلا کے قریب خانپور ہے، ہم انہیں وہاں لے جا رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے ہنس کر کہا: ARREST ہو کر سرحد سے آئی ہے۔ سرحد کی پولیس اور پنجاب کی پولیس میں بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کے ساتھ رات کو نہیں جائے گی اور اگر تم لوگ اسے لیجانے پر بضد ہو تو ٹھیک ہے، میں نے ہری پور جانا ہے، ہمیں ایک ساتھ جیپ میں بٹھاؤ اور لے چلو۔ میں اسے راستے میں خان پور چھوڑ دوں گا اور خود ہری پور جیل چلا جاؤں گا۔ گارد انچارج نے کہا: نہیں مفتی صاحب، آپ صبح جائیں گے اور یہ اس وقت جائے گی۔ اس پر مفتی صاحب ڈپٹ کر بولے: پھر یہ بھی صبح ہی جائے گی۔ اس پر میں نے ہنس کر کہا، مفتی صاحب، یہ لوگ آپ کو یہاں رکھنا چاہتے ہیں، بعد میں آپ سے مذاکرات کریں گے۔ مفتی صاحب نے کہا، نہیں۔ میں نے کہا، مذاکرات کرنے ہیں، یہ بات

www.tezpakistan.com

مَیں نے مذاق میں کی تھی اور خود مفتی صاحب کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ سب لیڈروں کو مختلف جیلوں میں بھجوانے کے بعد ان سے بات چیت ہو سکتی ہے۔ مفتی صاحب کے تیور دیکھ کر پولیس والوں نے ہار مان لی اور مَیں اپنے ڈنگ سے منتقل ہو کر مفتی صاحب والے ڈنگ میں اُٹھ آئی۔

صُبح سویرے پانچ بجے مفتی صاحب نے میرے دروازے پر دستک دی — اللہ مغفرت کرے — بی بی اُٹھیں ناشتہ کرلیں، آپ کے لیے گاڑی آگئی ہے۔ مَیں اُٹھی اور پُوچھا، مفتی صاحب آپ نہیں جا رہے؟ — بولے، نہیں، مجھ سے کہا گیا ہے کہ مَیں نے نہیں جانا۔ مَیں نے ہنس کر کہا، وہی بات ہُوئی نا! بولے: ہاں شاید تمہاری ہی بات صحیح ہو رہی ہے۔

خیر، مَیں خانپور جیل پہنچ گئی۔ مفتی صاحب وہیں رہے۔ پھر مَیں نے جیل میں سُنا نوابزادہ صاحب کو سہالہ لایا گیا۔ سردار قیوم کو نکالا گیا اور مذاکرات کی راہ ہموار کی جانے لگی۔ مجھے خبروں سے علم ہوتا رہتا کہ آج سردار قیوم فلاں جیل میں فلاں لیڈر سے ملے۔ آج فلاں سے مُلاقات ہُوئی۔ جلد ہی مجھ سے بھی ملنے آئے اور بتایا کہ مفتی صاحب آپ لوگوں کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مذاکرات ہوں یا نہ ہوں — حکومت کا کہنا ہے کہ مفتی صاحب ساتھیوں سے پُوچھ لیں، ہم انہیں اکٹھے نہیں کر سکتے۔ ایسا نہ ہو کہ سہالہ آنے کے بعد کوئی لیڈر راضی نہ ہو اور خواہ مخواہ دِقت کا سامنا کرنا پڑے۔ مفتی صاحب کی شرط ہے کہ جب تک میرے سارے ساتھی "ہاں" نہیں کرتے، مَیں مذاکرات نہیں کروں گا۔ مَیں نے دوسرے ساتھیوں کی رائے کے بارے میں استفسار کیا۔ سردار صاحب نے کہا، سب کا یہی کہنا ہے کہ اگر دوسرے ساتھی آمادہ اور تیار ہیں تو ضرور بات چیت ہونی چاہیے۔ صرف سانگوال جیل میں شیر باز مزاری رہ گئے ہیں۔ ان کے سامنے مجھے ہمت نہیں ہو رہی، مَیں ان کو راضی نہیں کر پاؤں گا۔ بی بی، اگر آپ ایک خط دیدیں ان کے لیے تو زیادہ مناسب رہے گا؛ چنانچہ مَیں نے شیر باز مزاری صاحب کے نام خط لکھا کہ سب ساتھی مذاکرات پر راضی ہو گئے ہیں۔ آپ راضی ہوں یا نہ ہوں، آپ بہرحال سردار قیوم صاحب سے بات کرلیں، آپ راضی نہیں ہوتے وہ الگ بات ہے۔ جب سردار قیوم ان سے ملے اور انہوں نے دوسرے ساتھیوں کی طرح مفتی محمود پر اپنے غیر متزلزل اعتماد اور مذاکرات کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا، تو تاریخی مذاکرات کے سلسلے میں مزید پیش رفت ہُوئی۔ یُوں دوسرے یا تیسرے دن مَیں ایک بار پھر سہالے میں اپنے ساتھیوں سے آن ملی۔

(iii)

کاش! معلوم ہوتا مفتی صاحب اتنی جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے، تو ان کی ہر بات کو ذہن میں محفوظ رکھتی۔ میرا تو خیال تھا کہ ابھی ہم نے بہت چلنا ہے۔ بہت سفر طے کرنا ہے۔

مذاکرات کی میز سے واپس آنے کے بعد جب دن بھر کی رُوداد سُناتے، تو باوجودیکہ انہیں زبان و بیان پر خاصی قدرت حاصل تھی، وہ اپنے چہرے کے تاثرات اور ہاتھوں کے اشارے سے خُوب خوب کام لیتے — ان کی گفتگو ہمیشہ بڑی ٹھہری ہُوئی، سلجھی ہُوئی اور مدلل ہوتی — جذباتیت سے کبھی کام نہ لیتے۔ ساتھی اگر کبھی ان کی باتوں اور دلائل سے قائل نہ بھی ہوتے، تو ان کے EXPRESSIONS دیکھ کر انہیں قائل ہو جانا پڑتا۔ ہمارے کچھ ساتھیوں، بلکہ خود میرا اپنا رویّہ بھی بسا اوقات خاصا تلخ اور غیر منطقی ہو جاتا، لیکن مفتی صاحب نے ہمیشہ خندہ پیشانی اور کشادہ دِلی سے ہماری باتیں سُنیں اور ہر معاملے میں حتی الوسع مطمئن اور قائل کرنے کی کوشش کی۔

(iii)

مفتی صاحب کی موت کی خبر مَیں نے کراچی میں سُنی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بیٹھی تھی کہ ہمشیرہ آئی۔ اس نے کہا، کوئی صاحب فون پر خان صاحب کا پُوچھ رہے ہیں۔ مَیں نے کہا، خان صاحب تو آرام کے لیے لیٹ گئے ہیں، ان صاحب کا کوئی پیغام ہو، تو دے دیں۔ ہمشیرہ چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ آئیں اور بولیں: بی بی، وہ تو بڑی عجیب سی بات کہہ رہے ہیں، کہتے ہیں مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ یقین جانیے، یہ خبر میرے اعصاب پر بجلی بن کر گری۔ یہ حقیقت ہے کہ مَیں زندگی میں ان کے گھر والوں سے کبھی نہیں ملی، نہ مَیں نے ان کے بڑے لڑکے فضل الرحمٰن کے علاوہ کسی اور کو کبھی دیکھا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ جلسے جلوسوں میں ان کا ساتھ ہو جاتا۔ اس کے باوجود کچھ ایسا صدمہ ہُوا جیسے کوئی اپنا نہایت قریبی عزیز چل بسا ہو۔

خان صاحب، مفتی صاحب کے انتقال کی خبر سُن کر ان کی قیام گاہ کی طرف چلنے لگے، تو مَیں نے کہا، اگر تھوڑی دیر رُک جائیں تو مَیں بھی ساتھ

www.tezpakistan.com

چلی چلوں گی۔ مجھے ان دنوں سانس کی تکلیف بھی تھی اور میں نے ڈاکٹر کے ہاں جانا تھا۔ خان صاحب نے کہا، مجھے دیر ہو جائے گی، آپ بعد میں آجایئے گا۔ مجھے ڈاکٹر کے ہاں دیر ہوگئی ـــ اور میں مفتی صاحب کا آخری دیدار کرنے سے محروم رہی ـــ اس کے علاوہ سچی بات ہے کہ میں اپنے اندر مفتی صاحب کی میت کو دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں پا رہی تھی۔ خاتون ہونے کے ناطے ویسے بھی رقیق القلب تھی، میں اس صدمے سے کئی دن تک بوکھلائی سی رہی۔ یقین نہ آتا تھا کہ وہ ہنستا، مسکراتا انسان جو خلوص، شفقت، مہربانی، مذہب اور سیاست ـــ نہ جانے کتنے اوصاف کا پیکر تھا ـــ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے۔

ارباب سکندر خان خلیل (سابق گورنر صوبہ سرحد)

فائلوں پر ریمارکس دیکھ کر انگریزی سے ناآشنا وزیرِ اعلیٰ کا قائل ہونا پڑا

مولانا مفتی محمود سے میری بڑی پرانی یاد اللہ تھی۔ ۱۹۷۰ء کا الیکشن آیا تو تعلقات میں وقتی طور پر گرہ پڑ گئی اور سرد مہری آگئی۔ اس عرصے میں ہم نے اپنے اپنے سیاسی پلیٹ فارم سے ایک دوسرے پر خوب خوب بمباری کی۔ نتیجہ نکلا تو ۴۰ کے ہاؤس میں ۱۲ سیٹیں نیپ کی تھیں، ۴ یا ۵ جمعیت کی۔ نتیجے کے دو مہینے بعد ایک دن کا ذکر ہے، میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا، مفتی صاحب، آپ کو جیب ہوٹل میں بلا رہے ہیں۔ پشاور سنٹرل جیل کا پل عبور کر کے شہر کی طرف جائیں تو ابتدائی میں سامنے ہی یہ ہوٹل واقع ہے۔ اس کے قریب آج کل جہاں پارک ہوٹل ہے، وہ جگہ ان دنوں خالی ہوا کرتی تھی۔ جیب ہوٹل خاصہ مہنگا اور مشہور ہوٹل تھا۔ میں تھوڑی دیر بعد اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ مفتی صاحب بے شمار مولویوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں نے ہوٹل کے پانچ، چھ بڑے بڑے کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہاں پر موجود کئی لوگوں کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

مولانا غلام غوث ہزاروی چمک کر بولے: ارباب صاحب! باہر تو آپ لوگ ہمیں گالیاں دیتے ہیں، اب یہاں کیا لینے آگئے ہیں؟

میں نے حقیقتِ حال بتانے سے گریز کیا۔ خیال تھا اس طرح مفتی صاحب کی پوزیشن خراب ہوگی، چنانچہ بات بناتے ہوئے بولا: یہاں قریب ہی میرا دفتر ہے۔ وہاں سے نکلا تو سوچا ذرا ادھر سے بھی ہوتا چلوں۔

باتوں باتوں میں موقع پا کر میں نے مفتی محمود سے کہا، بھئی معاملہ کیا ہے، مجھے کیوں بلوایا ہے؟ انہوں نے جواب دیا، بس اطمینان سے بیٹھے رہو۔ خیر خدا خدا کر کے مفتی صاحب مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گئے اور بتایا کہ خان قیوم اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھٹو بھی پیغام بھجوا رہا

www.tezpakistan.com

ہے لیکن ہم ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ مِل کر کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مَیں نے سوچا ہے کہ ہم تم مِل کر کیوں نہ حکومت بنالیں۔ مَیں نے کہا، ٹھیک ہے۔ ہم ہر طرح سے آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ مفتی محمود کہنے لگے، لکھ کر اپنی جماعت کی طرف سے یقین دہانی کرا سکتے ہو؟ مَیں نے جواب دیا: ضرور، ابھی لیجیے۔ مَیں نے وہاں سے کاغذ قلم لیا اور اس مضمون کی تحریر لکھ کر اسی وقت مفتی محمود کے حوالے کردی۔ ممکن ہے ان کے کاغذات میں یہ پرچہ آج بھی کہیں موجود ہو۔

اس بات چیت کے بعد ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ یہاں حبیب گُل، مولانا ہزاروی، گُل بادشاہ اور شیر افضل آف بداشی موجود تھے۔ اس اثنا میں خبر ملی کہ مجھے ڈھونڈتا ڈھونڈتا حیات محمد خاں شیر پاؤ، ہوٹل میں پہنچ چکا ہے اور دوسرے کمرے میں بیٹھا ہُوا ہے۔ وہ بھی اتحاد کے چکّر میں تھا۔ مفتی صاحب نے اپنے ساتھیوں کو اس تعاون اور اتحاد سے آگاہ کیا ـــــ مولانا ہزاروی نے اعتراض کیا کہ ان لوگوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ مفتی محمود نے کہا، انہوں نے تحریری طور پر تعاون کی یقین دہانی کرائی ہے۔ اگر یہ زبانی بھی کہہ دیتے، تو مَیں ان پر اعتبار کر لیتا۔

صوبہ سرحد چھوٹا، لیکن بڑا اہم اور حساس صُوبہ ہے۔ انگریزی دَور کی فائلوں میں یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ صوبہ سرحد مُلک کی خارجہ پالیسی وضع کرتا ہے۔ یہاں ستر لاکھ افراد پہاڑیوں پر پڑے ہیں۔ یہ لوگ یہاں کی حکومت کے کنٹرول میں تو آتے ہیں، لیکن اس کے ماتحت ہرگز نہیں ہیں۔ انہیں پُرامن اور خاموش رکھنا دردِ سر سے کم نہیں۔

✺

صوبہ سرحد میں نیپ اور جمعیت کی مشترکہ حکومت بنی، تو مفتی محمود وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہُوئے۔ مَیں نے گورنر کا عہدہ سنبھالا۔ مجھے سرکاری افسروں کی ہیرا پھیریوں اور شعبدہ بازیوں کا تھوڑا بہت علم تھا۔ سوچا مفتی صاحب بے چارے سیدھے سادے مُسلمان آدمی ہیں، کوئی عیار قسم کا افسر یا سیکرٹری انہیں چکر دے کر ان سے کسی کیس میں کوئی غلط فیصلہ نہ لے لے؛ چنانچہ مَیں نے چیف سیکرٹری سے کہا کہ مفتی صاحب جو فائلیں دیکھ لیا کریں، وہ بعد میں ایک نظر مجھے بھی دکھائی جایا کریں۔

چند دن بعد مفتی صاحب کو علم ہو گیا کہ مَیں بھی ان کی فائلیں دیکھتا ہُوں۔ انہوں نے ایک محفل میں مجھ سے اس کا ذکر کیا، تو مَیں نے کہا: احتیاط کے پیشِ نظر یہ طریقہ اختیار کیا ہے، ایسا نہ ہو کسی کاغذ پر آپ سے غلط دستخط کرا لیے جائیں اور کل کلاں آپ کے خلاف کوئی سکینڈل کھڑا ہو جائے۔ مفتی صاحب خاموش رہے۔ بعد میں فائلوں پر ان کے ریمارکس دیکھ کر مجھے ان کی خداداد صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑا۔ ہر کیس پر ایسی نپی تُلی رائے دیتے کہ پرانے سیکرٹری اور افسر بھی دنگ رہ جاتے۔ انہیں تمام امور پر کامل عبور حاصل ہو گیا۔ اس طرح جلد ہی ان کی فائلیں میرے پاس آنی بند ہو گئیں۔ وہ تمام کام اپنے طور پر نمٹانے لگے۔

✺

مفتی صاحب کے دورِ وزارت میں چیف منسٹر ہاؤس میں ہر وقت مُلاقاتیوں کا میلہ لگا رہتا۔ گھر کے سارے کمرے اور وسیع و عریض لان ان لوگوں سے بھرے رہتے۔ لوگ دُور دراز کے علاقوں سے چل کر مفتی صاحب کے پاس آتے اور ان سے سفارشیں کرواتے۔ اکثر اوقات ان کی شکایتیں اور مسائل بڑی معمولی اور عام نوعیت کی ہوتیں، لیکن مفتی صاحب نے کبھی بُرا نہیں منایا، کبھی کسی مُلاقاتی کو ڈانٹا یا جھڑکا۔ ہر ایک کی پُوری کتھا بڑے صبر اور تحمل سے سُنتے۔ ایک بار بڑی دِلچسپ صورتِ حال دیکھنے میں آئی۔ مَیں مفتی صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ ذیابیطس کے چونکہ مریض تھے اس لیے انہیں بار بار پیشاب کی حاجت محسوس ہوتی۔ ایک مرتبہ جو بیت الخلا جانے کے لیے اُٹھے، تو مُلاقاتیوں میں سے ایک آدمی تیزی سے آگے بڑھا اور بیت الخلا کے دروازے میں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اب مفتی صاحب کھڑے شور مچا رہے ہیں ہٹو راستے سے اللہ کے بندے مجھے پیشاب کرنے دو، اور وہ آدمی ہے کہ ٹس سے مَس نہیں ہوتا۔ بار بار ایک کاغذ ان کے چہرے کے سامنے لہراتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں پہلے اس کاغذ پر دستخط کیجیے، پھر آپ کو پیشاب کرنے دُوں گا۔ اسے شاید کسی کام کے سلسلے میں مفتی صاحب سے سفارش کرانی مقصود تھی اور اس نے اس کے لیے یہ سُنہری موقع ڈھونڈا تھا۔ مفتی صاحب یقین دلاتے ہیں، پیشاب سے فارغ ہو کر دستخط کر دُوں گا، لیکن اس کی ضد تھی کہ نہیں پہلے دستخط ہوں گے، پھر آپ پیشاب کریں گے۔ جب یہ تکرار کسی طرح ختم ہونے میں نہ آئی، تو مَیں آگے بڑھا اور اس آدمی کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف

www.tezpakistan.com

کرتے ہُوئے بولا، ہٹو پیچھے ـــــ مفتی صاحب کو پیشاب تو کر لینے دو ـــ لاؤ کاغذ، ان کی جگہ مَیں دستخط کیے دیتا ہُوں۔ تم راستہ چھوڑ دو۔

✺

مفتی صاحب نے وزارت کے دَور میں سرکاری خزانے سے وزیرِ اعلیٰ کی تنخواہ کبھی وصول نہیں کی۔ وہ قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے اور وہاں سے پندرہ سو روپے ماہانہ الاؤنس وصول کرتے تھے۔ ہم نے آرڈی ننس جاری کر رکھا تھا، اس کی رُو سے ایک آدمی کے لیے ایک وقت میں سرکار سے دو الاؤنس یا تنخواہ وصول کرنے کی ممانعت تھی۔

وزیرِ اعلیٰ ہاؤس میں مُلاقاتیوں اور بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھ کر ایک بار بُھٹو نے شکایت بھی کی کہ آپ لوگوں نے گورنر ہاؤس اور پرائم منسٹر ہاؤس کا بیڑا غرق کر دیا، لیکن نہ مفتی صاحب کے مُلاقاتیوں میں کوئی کمی ہُوئی نہ ان کے اپنے معمولات میں کوئی فرق آیا۔

✺

مفتی صاحب کو اپنے ساتھیوں پر ایک طرح سے اندھا اعتماد تھا۔ ان کے خلاف کسی کی شکایت سُننے کے روادار نہ ہوتے، لیکن بعد میں چند ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کا یہ اعتماد بُری طرح مجرُوح ہُوا اور ان کے کئی قریبی ساتھی ان کی صفوں سے ٹُوٹ کر حکومت سے جا ملے۔ پہلی بار جب انٹیلی جنس نے مجھے اطلاع دی کہ ..... جا رہا ہے، تو مَیں نے مفتی صاحب سے بات کی۔ انہیں یقین نہ آیا، بولے: ... بڑا پکا آدمی ہے، لالچ میں نہیں آئے گا، تم خواہ مخواہ ہمارے خلاف باتیں کرتے رہتے ہو۔ مَیں نے جواب دیا۔ مجھے اس طرح کی اطلاع ملی تھی، دوست سمجھ کر آپ تک پہنچا دی، اسے چیک کر لینے میں کیا حرج ہے!

چند دن بعد ہماری میٹنگ تھی۔ مفتی صاحب نے شکایتاً کہا: بُھٹو اسلامی قوانین نافذ کرنے کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے..... بھی میٹنگ میں موجود تھے، ان سے نہ رہا گیا، فوراً بول اُٹھے: کون روڑے اٹکاتا ہے؟ تم لوگ خواہ مخواہ اس کی مخالفت کر رہے ہو، وہ بیچارہ تو پُورے مُلک میں اسلامی نظام نافذ کر رہا ہے۔ مَیں حلفیہ کہتا ہُوں کہ وہ پکا مُسلمان ہے۔

مفتی صاحب سُن ہو کر رہ گئے، میری طرف دیکھا۔ مَیں نے نظریں نہیں ملائیں، دوسری طرف دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر کے لیے کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

ایک آدھ دن بعد ..... بھی پھسل گئے۔ ان کا داماد فیروز سنز پنڈی کے پریس میں تین سو روپے کی معمولی تنخواہ پر ملازم تھا، بُھٹو نے اُسے گورنمنٹ پرنٹنگ پریس میں تین ہزار روپے کے گراں قدر مشاہرے پر ملازم کرا دیا۔

..... خاصا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ تین چار لاکھ روپے اس کے لیے بڑی معمولی بات تھی۔ اس نے دیگر ذرائع سے بہت کچھ کما رکھا تھا اور میرا خیال تھا وہ بُھٹو کے ہاتھ نہیں بِکے گا، لیکن ایک دِن اس کے بھی بِک جانے کی خبر آ گئی۔

ـــــ ایک صاحب ہماری حکومت کے خلاف بڑے سرگرم تھے۔ نجی اور عام محفلوں میں کُھلم کُھلا ہمیں گالیاں دیتے اور کہتے کہ یہ لوگ ہیجڑے ہیں، کچھ کرتے نہیں۔ مَیں نے مفتی صاحب سے شکایت کی۔ وہ نہ مانے اور ثبوت کے طالب ہُوئے۔ مَیں نے ایک افسر کی ڈیوٹی لگا دی کہ جب مذکورہ صاحب اب کہیں تقریر کریں، تو اُسے ٹیپ کر لے۔ ایک آدھ دن بعد ان کی تقریر کا ٹیپ میرے پاس پہنچ گیا۔ مَیں نے یہ تقریر مفتی صاحب کو سُنوائی۔ انہوں نے کہا: مولانا کو بُلواؤ۔ مولانا آئے ـ مفتی صاحب نے استفسار کیا ـــــ میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولے: ارباب صاحب نے آپ سے میری شکایت کی ہوگی، یہ انہی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ میری کُرسی کے ساتھ نیچے فرش پر ٹیپ ریکارڈر پڑا تھا، مَیں نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا اور کمرے میں ان کی تقریر گونجنے لگی۔ اپنی آواز سُن کر بے چارے کھسیانے ہو کر رہ گئے اور ان سے کوئی بات نہ بن پڑی۔

✺

میری، گورنر کے عہدے سے برطرفی اور مفتی صاحب کی، وزارت سے علیحدگی کی داستان بڑی دِلچسپ ہے۔ گورنر کانفرنس میں عام طور پر جرنیل شریک نہیں ہوتے تھے، لیکن ایک بار جب ہم گورنر کانفرنس کے لیے اکٹھے ہُوئے تو تین جرنیل بھی وہاں موجود تھے۔ ان میں ایک جنرل ٹکا خان تھے، دوسرے کوئی جنرل مرزا تھے۔ تیسرے صاحب کا نام مَیں بھُول رہا ہُوں۔ ان حضرات کو دیکھ کر مَیں نے آہستہ سے پاس بیٹھے بزنجو سے کہا: آج حالات کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ ہم بیٹھے تو خان قیوم نے بُھٹو صاحب سے شکوہ کیا کہ اس وقت بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، مَیں اسے بحیثیت وزیرِ داخلہ برداشت نہیں

www.tezpakistan.com

کرسکتا۔ اس پر جنرل ٹکا خان بھی جلال میں آگئے اور بولے: ہمارا کام سرحدی دفاع ہی نہیں، اندرونی دفاع بھی ہے۔ مجھے اس طرزِ تخاطب پر غصہ آگیا۔ میں نے بھٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: جناب! یہ صاحب کون ہیں؟ بھٹو حیرت سے چونک کر بولے: ایں — آپ انہیں نہیں جانتے؟ میں انجان بن کر بولا: جی نہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا۔ بھٹو نے کہا، یہ جنرل ٹکا خان ہیں۔ بزنجو نے کہا: ٹکا صاحب، تشریف لے جائیے۔ جنرل ٹکا خان تیزی سے بولے: میں کیسے جاسکتا ہوں۔ بزنجو نے کہا: جناب، گورنرز کی کانفرنس ہے، اس میں فوجی افسروں کی موجودگی کا کوئی کام نہیں، اس لیے آپ چلے جائیے۔ خیر، بھٹو نے مداخلت کی اور اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئیں۔

کانفرنس رُوم سے باہر نکلے، تو میں نے بزنجو سے کہا: اگر یہی صورتِ حال رہی، تو ہم شام کی میٹنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ بزنجو نے میری بات کی تائید کی، چنانچہ ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوکر اپنے اپنے صوبے میں چلے گئے۔ کانفرنس رُوم میں جو واقعات پیش آئے تھے، ان کے پیشِ نظر مجھے اپنے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری گورنری کے دِن گنے جاچکے ہیں، اب میں گورنر کے عہدے پر زیادہ عرصے فائز نہیں رہوں گا، چنانچہ میں نے اپنا مختصر سا ساز و سامان تیار کرکے باندھ لیا۔ صبح سویرے نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ ملٹری سیکرٹری کا فون آیا۔ اس نے جھجکتے جھجکتے بتایا: آپ کے نام ایوانِ صدر سے ایک خط آیا ہے۔ میں نے کہا: لے آؤ۔ لفافے میں میری برطرفی کے احکام تھے۔ لکھا تھا، اگر میں چاہوں تو دس دن تک گورنر ہاؤس میں قیام کرسکتا ہوں۔ میں نے کاغذ پر دستخط کرکے اُسے واپس دے دیا۔ جب گورنری چھوڑ دی، تو پھر دس دنوں تک گورنر ہاؤس میں کیا رکنا۔ مفتی صاحب کی رہائش گاہ گورنر ہاؤس کے قریب ہی تھی، میں اپنا سامان اُٹھا کر وہاں چلا گیا۔ انہیں اپنی برطرفی کا کاغذ دکھایا۔ ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بلوچستان حکومت کی برطرفی کی خبر بھی آگئی۔ مفتی صاحب نے یہ خبر سُن کر بے ساختہ کہا: بہت بے غیرت ہوں گے اگر ہم نے استعفیٰ نہ دیا۔ آخر اس ملک میں جمہوریت کے لیے کچھ تو کرنا ہے۔ ان کے وزیرِ قانون امیر زادہ اور وزیرِ اطلاعات محمد افضل بھی وہیں موجود تھے، ان سے کہا: لکھو استعفیٰ۔ تین منٹ میں استعفیٰ لکھ کر دستخط کر دیے۔ ابھی سُورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ ہم لوگ وزارت اور گورنری پر تین حرف بھیج کر باہر آگئے۔

جاوید ہاشمی (سابق وزیرِ ثقافت)

ان کی طرف
جب بھی آنکھ اُٹھتی
وہ عزم کا پیکر نظر آتے

مولانا مفتی محمود صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۸ء میں ملتان میں اس وقت ہوئی جب مفتی صاحب گلگشت کالونی کی مسجد میں

www.tezpakistan.com

خطاب کرنے آئے۔ مَیں گورنمنٹ ایمرسن کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالبِ علم تھا۔ مَیں مفتی صاحب کو ایسے عام مولویوں کی طرح سمجھتا تھا جو ہر مسئلے پر ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں، لیکن ان کی تقریر سُننے کے بعد میرے خیالات میں تبدیلی آئی۔ مفتی صاحب نے اسلام کے معاشی نظام کو ایسے سادہ پیرائے میں بیان کیا کہ ہر بات دل نشین ہوئی، واضح ہوتا گیا کہ اسلام صرف آسمانی مذہب نہیں، بلکہ یہ عام انسانوں کی فلاح کا ضامن ہے۔

جلسے کے بعد مفتی صاحب کافی دیر تک وہاں رہے۔ مَیں نے مختلف سوالات کیے۔ ایّوب آمریّت سے لے کر اسلام کے معاشی نظام مذہبی منافرتوں اور لادینی نظریات کے بارے تک میں پوچھا۔ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے مفصّل جوابات دیے۔

اس کے بعد میرا قاسم العلوم آنا جانا رہا۔ مفتی صاحب ہمیشہ شفقت فرماتے، بلکہ ایک مرتبہ جب وہ گلگشت کالونی میں آئے، تو مجھے بھی وہاں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ مَیں نے ایّوبی آمریّت کے خلاف سخت نکتہ چینی کی۔ مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں میرے جذبات کو سراہا اور جلسۂ عام میں فرمایا کہ مجھے ان سے بہت سی توقّعات ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ہمّت دے۔

قومی اتحاد کے دنوں میں چونکہ مَیں بھی مرکزی کونسل کا ممبر تھا، اس لیے اکثر میٹنگوں میں مولانا کے تدبّر اور عالی حوصلگی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مفتی صاحب درویش صفت انسان تھے۔ دین اور دُنیا کے علوم سے مالا مال ہونے کے باوجود ان میں حد درجہ انکسار تھا۔ ہونٹوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو نوجوانوں کے اندر عزم و ہمّت پیدا کرتی تھی۔ مشکل سے مشکل مرحلہ درپیش ہوتا، کئی رہنماؤں کے چہرے متوحش ہو جاتے، لیکن مولانا مفتی محمود کی طرف آنکھ اُٹھتی، تو وہ عزم کا ایک پیکر نظر آتے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مَیں مرکز میں وفاقی وزیر تھا۔ مفتی صاحب کی طبیعت خاصی خراب ہو گئی۔ آپ سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل تھے۔ مَیں خیریت معلوم کرنے گیا، آپ لیٹے ہوئے تھے، چہرے پر زردی تھی اور کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ جونہی مجھے دیکھا، اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ مَیں نے عرض کیا آپ آرام فرمائیں، آپ کو خاصی تکلیف ہے۔ اس پر فرمانے لگے، ہاشمی صاحب، اب تو مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ بالکل عجیب سی بات تھی۔ ڈاکٹروں کے تمام اندازوں کے بالکل برعکس آپ ایک ہفتے میں شفایاب ہو کر ہسپتال سے گھر چلے گئے۔

مولانا مفتی محمود زاہدِ خشک نہیں تھے، بلکہ اپنے اندر مزاح کا ایک خاص انداز رکھتے تھے۔ جب تمام رہنماؤں کو مری کے ریسٹ ہاؤس میں حکومت نے حفاظتی نظر بندی میں رکھا ہوا تھا، ہم ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ ہمارے ساتھ آموں کے ٹوکرے بھی تھے۔ مفتی صاحب ہنس کر فرمانے لگے، مجھے ڈاکٹروں نے آم کھانے سے منع کیا ہُوا ہے، لیکن ایک دن میں صرف ایک آم کھانے کی اجازت ہے۔ پھر نوابزادہ نصر اللہ خاں صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ یہ مجھے بہت آم کھلاتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ مَیں اس طرح جلد کرسی اِن کے لیے خالی کر دوں گا، لیکن میرے خیال میں اس کے لیے ابھی انہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ تمام لوگ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے، کیونکہ مفتی محمود قومی اتحاد کے صدر تھے اور نوابزادہ صاحب نائب صدر۔

مولانا مفتی محمود صاحب کی وفات کے وقت مَیں مکّہ مکرّمہ میں تھا۔ ریڈیو سے مفتی صاحب کی وفات کی خبر بجلی بن کر گری۔ یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ آج صرف ایک عالم کی موت ہی نہیں ہوئی، بلکہ ایک عالم یتیم ہو گیا ہے۔ وطنِ عزیز ایک ایسے مجاہد سے محروم ہو گیا ہے جو ساری زندگی پاکستان کے نظریاتی تحفّظ کی جنگ لڑتا رہا جس کی للکار سے بلوچستان اور سرحد کے لادین عناصر خوفزدہ ہو جاتے تھے، جو آگے بڑھا، تو تمام سرداریاں، قبائلی رسوم اور جاہلیت کی روایات اس نے اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالیں۔ یہ وہ قلندر تھا جس کے ارادے جلیل تھے اور خواہشات قلیل۔ مَیں حرم پاک میں پہنچا۔ وہاں مفتی صاحب کی غائبانہ نمازِ جنازہ ہوئی۔ حزن و ملال کا امڈتا ہوا دریا تھا جو میرے سینے میں موجزن تھا۔ الٰہی، میرے وطن کی خبر، مفتی صاحب کی ضرورت جتنی آج پاکستان کو تھی شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی، لیکن ہمارے پاس سوائے صبر کے اور چارہ ہی کیا ہے۔

www.tezpakistan.com

شہرِ علم کا مینار

www.tezpakistan.com

ڈی سی ہاؤس
محمود
28.7.77

محترم و مکرم جناب مولانا محمد حسین صاحب دام مجدکم

السلام علیکم — مزاج گرامی —

گزارش ہے کہ جناب کا محبت نامہ موصول ہوا —

یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔

احقر ایک سیاہ کار۔ نابکار گنہگار شخص ہے۔ آپ حضرات کی دعاؤں کا محتاج ہوں — اور آپ لوگوں کی دعاؤں سے چل رہا ہوں —

آپ کی ذرہ نوازی کا ممنون ہوں —

میری طرف سے اپنی کونسل کے تمام ارکان کو سلام بہار پیش کر دیں۔

ان شاء اللہ اگست کے اوائل میں لاہور حاضر ہوں گا —

وہاں ضرور ملاقات سے نوازیں —

میں آپ حضرات کی اور پوری قوم کے تمام طبقات کی قربانیوں سے بے حد متاثر ہوں — خدا کرے۔ کہ یہ قربانیاں اللہ تعالیٰ کے حضور میں مقبول ہوں — ہم انشاء اللہ آجکل میں رہا ہونے والے ہیں —

اللہ تعالیٰ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی نظام کا مرکز بنائے —

و ما ذالک علی اللہ بعزیز —

بہت بہت عنایت
محمود
28.7.77

(مولانا محمد حسین ہزاروی کے نام ایک اور خط)

www.tezpakistan.com

حضرت مولانا خان محمد صاحب (خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف)

ان کے یہ تین کارنامے سرِفہرست ہیں....

مفتی صاحب میرے مخدوم و مکرم تھے۔ ان سے تعلق بھی پُرانا ہے اور رشتۂ محبت بھی قدیم۔ پہلی ملاقات ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ حضرت والد محترم اس وقت بقیدِ حیات تھے ـــــ مفتی صاحب کو انہوں نے کندیاں شریف بلایا تھا۔ ان کی آمد یہاں ایک فتوے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ ہمارے یہاں دو خاندانوں کا مسئلہ طلاق پر باہمی جھگڑا تھا۔ ایک عورت کو طلاق ہوئی، ایک فریق کہتا تھا طلاق ہو گئی ہے اور دوسرا اس سے مختلف مؤقف رکھتا تھا۔ علاقے کے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام اس مسئلے پر اپنی رائے پیش کر چکے تھے، لیکن جھگڑا ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ غالباً یہ لوگ حضرت کے پاس یہ پوچھنے کے لیے آئے کہ ان کی نظر میں جو مفتی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہو، اس کا نام پتا بتا دیں۔ حضرت نے مفتی محمود کا نام تجویز کیا، اور خود ہی ان کو کندیاں شریف اپنا مہمان بنا کر بُلایا۔

مفتی صاحب نے مقامی علما سے بات چیت کی، فریقین کا موقف معلوم کیا، پھر فریقین کی براہِ راست بات سُنی، ان کے موجودہ اور سابقہ موقف کا موازنہ کیا۔ پھر جب وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے، تو اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔ ان کا فیصلہ وہی تھا جو دوسرے علما پہلے ہی دے چکے تھے، لیکن طریقِ معلومات اور طرزِ استدلال انوکھا تھا۔ چونکہ وہ اس وقت نوجوان تھے، زیادہ پختہ عمر نہیں تھے، اس لیے مقامی علما میں ان کی ذات موضوعِ گفتگو بن گئی۔ اس بحث میں ان کے معاصرین ان کی علمی لیاقت پر اظہارِ حیرت کر رہے تھے۔ بعض حضرات نے ہمارے حضرت سے سوال کیا کہ آپ کی نظرِ انتخاب ان پر پڑنے کا کیا سبب ہے؟ حضرت نے اس وقت علما کو جو مختصر سا جواب دیا، وہ یہ تھا: "یہ گوہرِ قابل ہے۔ اس کی حفاظت کرو، اس پر نظر رکھو، اللہ تعالیٰ اس سے کوئی بڑا کام لے گا۔"

حضرت کی یہ بات سینہ در سینہ، زبان در زبان علما تک پہنچی اور علما نے مفتی صاحب کو حضرت کا انتخاب قرار دیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مفتی صاحب حضرت کا حسین انتخاب تھے۔ خود مفتی صاحب کو بھی اپنی خداداد صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ وہ اعلیٰ مدرّس، بلند پایہ شیخ الحدیث، منفرد مفسرِ قرآن اور صاحبِ اجتہاد فقیہہ تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ قومی کاموں میں صَرف ہوا، لیکن قومی امور اور ان سے متعلق ذمہ داریاں ان کے علمی مشاغل کو نہ روک سکیں۔

ویسے تو مفتی صاحب کی بے شمار قومی اور ملی خدمات جریدۂ عالم پر ثبت ہیں، لیکن ان کے تین کارنامے سرِفہرست ہیں:

www.tezpakistan.com

۱۹۵۳ء میں جب تحریکِ ختمِ نبوت چلی، تو دوسرے علما کے ساتھ جیل چلے گئے۔ جیل سے رہا ہوئے، تو ایک سال پہلے جس دینی جماعت کو تھوڑا بہت منظم کیا تھا، اب اس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب کو اس کا امیر بنا کر اس کے مُردہ جسم میں رُوح ڈالنے کی کوشش کی گئی، لیکن وہ اپنی معذوری کی وجہ سے جماعتی اور تنظیمی دورے نہیں کر سکتے تھے، اس لیے جماعت زندہ نہ ہو سکی۔ قائم مقام صدر مفتی محمد شفیع صاحب تھے، لیکن وہ بھی اپنے وسیع علمی کام کے باعث ملکی دورے نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک مفتی محمود صاحب نے جماعتی تنظیم کے لیے ملک گیر دورے کر کے اس کے تنِ مُردہ میں جان ڈال دی۔ پھر جب ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے ذریعے تمام جماعتیں کالعدم قرار پائیں، تو ان میں جمعیت بھی شامل تھی۔ میرے نزدیک مفتی صاحب کا سب سے پہلا کارنامہ جمعیت کی تنظیمِ نو تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کارنامہ تنہا ان کا نہیں تھا، دوسرے اکابر علما کی خدمات بھی اس میں شامل تھیں، لیکن مفتی صاحب کی خدمات مجموعی طور پر زیادہ تھیں۔

تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۷۴ء کی کامیابی ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ اس تحریک میں بھی بلاشبہ دوسرے تمام مکاتبِ فکر کے علما، طلبا اور کارکن شامل تھے۔ ان تمام مجاہدین نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کی قیادت میں بڑی بے جگری سے ختمِ نبوت کی جنگ لڑی، لیکن پارلیمانی محاذ پر دشمنانِ ختمِ نبوت کی شکست مفتی صاحب کی بے پناہ علمی، سیاسی اور فکری کوششوں کا نتیجہ تھی۔ صرف یہی نہیں کہ وہ قومی اسمبلی میں قادیانیوں سے آئینی جنگ اور قادیانی جماعت کے سربراہ سے علمی مباحثوں میں مصروف رہے، قومی محاذ پر بھی وہ تقریر و خطابت کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کے دلوں کو گرماتے اور جذبوں کو بیدار کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں ہونے والے تمام بڑے اجلاسوں میں وہ بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔

تیسرا بڑا کارنامہ تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کی کامیاب قیادت ہے۔ یہ تحریک اول سے آخر تک ان کی قیادت میں چلی۔ اس اعتبار سے یہ سب سے مشکل کام تھا کہ ان کی قیادت میں کام کرنے والی تنظیم میں مختلف الخیال جماعتیں شامل تھیں۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ حق و باطل اور ظلم و انصاف کا سب سے بڑا معرکہ تھا۔ اس جنگ میں بھی انہیں کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی۔

قومی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے والے لوگوں کو قدم قدم پر مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ وہ سر بکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں، انہیں اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ یہ دراصل قدرت کی طرف سے ان کے لیے ایک آزمائش ہوتی ہے۔ اہلِ حق ہی اس آزمائش سے سُرخرو ہو کر نکلتے ہیں۔ مطلب پرست، لالچی اور اغراض کے بندے اس سفر میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ حق کے اس راستے میں پُرانے اہلِ حق کی طرح مفتی صاحب بھی کئی بار آزمائشوں سے دوچار ہوئے۔ کئی بار ان کی نجی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی، لیکن حرفِ شکایت کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا، بلکہ وہ انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ اس راستے پر چلتے رہے جسے حق سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ ایک بار جب انہوں نے قومی اسمبلی سے واک آؤٹ کیا، تو مولانا غلام غوث ہزاروی نے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا: "مفتی صاحب! واک آؤٹ کا اسلام میں کوئی ثبوت ہے؟" مفتی صاحب سوال سُن کر پلٹ آئے اور برجستہ کہا: "ہاں! اس کا ثبوت قرآن میں موجود ہے۔" پھر یہ آیت پڑھی: فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین۔ (یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھ) مولانا ہزاروی یہ سُن کر خاموش ہو گئے اور اس کے بعد واک آؤٹ کے موقع پر انہوں نے مفتی صاحب پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے دوران ایک بار مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب بے حد مالی مشکلات سے دوچار ہیں۔ میں ان سے سہالہ میں ملنے کے لیے اکثر جاتا رہتا تھا، لیکن انہوں نے مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ ان کا ہاتھ تنگ ہے۔ جب مجھے حالات کا علم ہوا، تو میں جاتے وقت کچھ پیسے بھی ساتھ لے گیا۔ میں نے مفتی صاحب کو یہ بتائے بغیر رقم دینے کی کوشش کی کہ مجھے ان کے حالات کا علم ہے، لیکن انہوں نے کچھ لینے سے یکسر انکار کر دیا۔ وہ میرے اصرار پر یہی کہتے رہے کہ "اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔"

میں نے اپنی سی بہتیری کوشش کی کہ انہیں وہ رقم دینے میں کامیاب ہو جاؤں، لیکن انہوں نے میری ایک بھی نہ چلنے دی۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، آخرِ کار مجبور ہو کر وہ رقم میں ان کے تکیہ کے نیچے چھوڑ آیا۔

www.tezpakistan.com

مولانا عبدالحق صاحب (اکوڑہ خٹک)

انہوں نے علما کی بے آبروئی کا بدلہ چکا دیا

مفتی محمود، پاکستان میں برصغیر کے انگریز دشمن علماء و مشائخ کے نظریات کے محافظ و امین تھے، انگریز نے اپنے دشمن علماء کو اپنے دور میں ہر طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنایا، پھر رسوائی کی ہر اصطلاح ان کے نام سے منسوب کر کے یہ بات مشہورِ عام بنا دی کہ علماء ذہنی طور پر پسماندہ، جسمانی اعتبار سے کمزور اور علمی لحاظ سے پست ہوتے ہیں، چونکہ اس پراپیگنڈہ کے پیچھے حکومت کے عناصر و اعضاء کام کر رہے تھے، اس لیے تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا اور آزادی کے بعد بھی علماء کی تذلیل و تضحیک کا سلسلہ جاری رہا یار کھا گیا۔ ان کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا کہ ملکی معاملات کے بارے میں انہیں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ ان کا کام مسجد اور مدرسہ تک محدود ہے، یہ دو رکعت کے امام ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

مفتی محمود نے پاکستان میں انگریز کے اس طلسم کو توڑنے کے لیے اپنی جدّوجہد کا آغاز کیا۔ وہ تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کرنے کے لیے انگریزی سوٹ زیب تن کر کے میدان میں آنے کے بجائے، علماء کا عام سادہ اور قدیم حلیہ لے کر قوم سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے اپنی قومی زبان میں بڑے بڑے انگریزی خوانوں کو خود للکارا اور اپنے کارکنوں کو ترغیب دی کہ وہ اُن کے سامنے ہمیشہ سر اُٹھا کے چلیں۔ اس طرح انہوں نے پاکستان میں علماء کی عزت اور وقار کو بلند کر کے انگریز کے جانشینوں سے علماء کی بے آبروئی کا بدلہ چکا دیا۔ یہ مفتی محمود ہی کی جدّوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج علماء پورے وقار سے سر اُٹھا کر چل رہے ہیں۔ ان کو گالی دینے کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ ان پر پھبتی کسنے کی رسم ٹوٹ رہی ہے۔ اس کے برعکس اب لوگ علماء کی طرف توجہ دینے لگے ہیں۔ ان کی باتیں غور سے سُنی جانے لگی ہیں۔ ملکی معاملات میں ان کی رائے کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے، قومی مسائل پر یہ کھُل کر گفتگو کر رہے ہیں اور ان کی گفتگو دوسروں سے بہتر ہوتی ہے۔

علماء پہلے بھی اعلائے کلمۃ اللہ کا فریضہ انجام دیتے تھے، برصغیر کی آزادی میں بھی ان کے کلمۂ حق کی بازگشت موجود ہے، لیکن ان کی آواز محراب و منبر ہی میں سُنائی دیتی تھی، مفتی محمود نے پاکستان کے جبار و متکبر اربابِ اقتدار کے سامنے بار بار کلمۂ حق بلند کر کے علماء کو سمجھا دیا کہ جہالت و تکبر کی بنیادیں بہت کمزور ہوتی ہیں اور جب کوئی مردِ خدا ان باطل کے علمبرداروں کو للکارتا ہے تو یہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔

انگریز نے حریت پسند علماء کی اس قدر تذلیل کر دی تھی کہ کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بوریا نشیں، حکومت کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں، یا ایوان ہائے بالا تک کسی طرح پہنچ سکتے ہیں، مگر مفتی صاحب کی بے باک شخصیت اور بے لوث قیادت نے اس تصور کو

www.tezpakistan.com

بالکل باطل کر دیا۔ ایوان ہائے بالا میں رہنے والے لوگ ان کے پاس چل کر آتے، ان کے سامنے بچوں کی طرح جھکے رہتے اور مفتی صاحب شیروں کی طرح ان پر گرجتے اور برستے۔ انہوں نے انگریز کے دو صد سالہ اس گمراہ کن پروپیگنڈے کو صرف نو ماہ میں زائل کر دیا کہ علماء حکومت نہیں چلا سکتے۔
ان کا دورِ حکومت ایک درویش، بوریہ نشین، مردِ قلندر اور انگریز دشمن انسان کا مثالی دورِ حکومت تھا۔ اس پورے دورِ حکومت میں صوبے میں امن و امان قائم رہا۔ شراب و کباب کی محفلیں ویران ہو گئیں، مے کدوں کی رونقیں اُجڑ گئیں، عیش و نشاط کے دروازے بند ہو گئے۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ مسجد کا درجہ اختیار کر گئی اور اس مردِ حق آگاہ کے دفتر کے ملازم اس کے ساتھ کھاتے پیتے، اُٹھتے بیٹھتے، نمازیں پڑھتے اور بے تکلفانہ طور پر باتیں کرتے دیکھے گئے۔

سیاسی طور پر ان کے دورِ حکومت کو یہ برتری حاصل رہی کہ صوبے میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہُوا نہ انہوں نے صوبے کو پولیس اسٹیٹ بننے دیا۔ کوئی سیاسی قتل ہُوا نہ کسی پر لاٹھی اور گولی چلی۔ اشیائے ضرورت غائب ہُوئیں نہ لوگوں کو اشیاء کی خریداری کے لیے سڑکوں پر لائن لگا کر کھڑا ہونے پر مجبور کیا گیا۔ مفتی محمود کا دورِ حکومت ہمیں فخر کے ساتھ یہ کہنے کا حق دے گیا ہے کہ مولوی، حکومت چلا سکتا ہے اور اسلامی حکومت کا نمونہ بھی پیش کر سکتا ہے۔

مفتی محمود نے حکومت کے منصب کو ایک لمحے کے لیے بھی ذاتی منفعت، کنبہ پروری، اقربا نوازی اور شخصی پروپیگنڈے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود نہ کبھی تنخواہ لی نہ اپنا ذاتی مکان بنوایا اور اپنے اس طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ علماء حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد خلفائے راشدین کے نقشِ قدم پر چل سکتے ہیں۔ آج پاکستان میں علماء کو جو بہتر مقام حاصل ہے وہ مفتی صاحب کے اخلاق و کردار اور فکر و تدبر کی بدولت ہے۔ اب علماء کے اس وقار کو انگریز یا اس کے جانشین کسی طرح بھی نہیں چھین سکتے۔ علماء اپنے اس مقام سے فائدہ اُٹھا کر مفتی محمود کے اسلامی نظام کے نفاذ کے مشن کو آگے بڑھائیں گے اور قوم کو وہ دن دیکھنا ضرور نصیب ہو گا جب اس ملک میں ان کی پسندیدہ اسلامی حکومت ہو گی۔

مولانا ایوب جان بنوری

ایک لمحہ تھا کہ
اس اجنبی کا آنا ناگوار رہوا،
ایک دن آیا کہ
ہزاروں آنکھیں اس کی منتظر رہتی تھیں

نبوت وہبی ہے۔ اس کے سوا ہر شئے کسبی۔ مفتی محمود کی قیادت بھی کسبی تھی۔ انہوں نے طویل عرصہ اس نیت کے بغیر محنت اور ریاضت کی کہ

www.tezpakistan.com

انہیں قیادت ملے گی۔ خدا نے انہیں جو علمی مرتبہ و مقام دیا، وہ بے لوث محنت اور بے ریا عمل کا انعام تھا اور اس انعام کے بارے میں انہوں نے یا ان کے رفقائے کار نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ظاہری طور پر جو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مفتی محمود اچانک ہی میدانِ عمل میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب پر چھا گئے، مگر یہ فیصلہ وہی لوگ دے سکتے ہیں جنہوں نے مفتی محمود کو جلسوں میں دیکھا یا جلوسوں میں پایا۔ یہ تو وہ دَور تھا جب وہ مسلّمہ لیڈر بن چکے تھے، لیکن مَیں نے ان کے اس دَور کو دیکھا ہے جب وہ ایک عام سیاسی کارکن تھے۔ مَیں اس کارکن محمود اور عہدِ حاضر کے مفتی محمود کو دیکھ کر پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص ان کی طرح محنت کرے گا وہ یقیناً بلند رُتبے کو پالے گا، بشرطیکہ وہ علم بھی اتنا حاصل کرے جتنا مفتی محمود نے حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی محمود نے اپنی جماعت کے کسی شخص کو مخصوص طریقوں سے آگے بڑھا کر منصبِ قیادت تک نہیں پہنچایا، بلکہ ہر ساتھی کو علم کے حصول اور عمل کی محنت کا سبق دیا تاکہ ہر شخص فطری طریقے کے مطابق اپنا مقام آپ بنائے۔

دن یا مہینہ تو مجھے یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے، مَیں نمازِ ظہر کے بعد کچھ دیر آرام کی نیت سے لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر ایک غیر مانوس سی دستک ہوئی۔ ان دنوں میرے مدرسے میں داخل ہونے والے طالب علموں کے قافلے آتے رہتے تھے۔ مَیں نے سوچا دارالعلوم میں کسی داخلے کے متمنّی نے دستک دی ہوگی۔ بادلِ نخواستہ اُٹھ کر دروازہ کھولا، تو سامنے ایک اجنبی مولوی صاحب کھڑے تھے۔ ان کی عمر طالب علمی کی عام عمر سے کچھ زیادہ تھی۔ چہرے پر ذہانت اور متانت کے آثار تھے۔ مَیں نے رسمی سی گفتگو کے بعد اُن کی بے وقت آمد پر اپنے غُصّے کو چھپاتے ہوئے کہا: "فرمائیے"۔ مجھے یاد ہے میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا "مجھے مولانا محمد ایوب جان بنوری سے ملنا ہے"۔

ان کی اس بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتے، لیکن الفاظ کی ادائیگی، لہجے کی شگفتگی، چہرے پر کھیلنے والی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمودار ہونے والی چمک سے معلوم ہوتا تھا کہ اجنبی مولوی صاحب زبان سے حال سے کہہ رہے ہیں:

"تم ہی ایوب جان بنوری ہو، مَیں تم ہی سے ملنا چاہتا ہوں، بتاؤ ملنے سے انکار کروگے، تم میں انکار کی جرأت ہے"؟

سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے ان کی آمد بالکل اچھی نہیں لگی تھی، لیکن جب ان کی دلفریب شخصیت دیکھی، تو طبیعت کا تکدّر دُور ہوگیا اور اپنے ابتدائی اندازِ سوال کے تاثرات و اثرات کو زائل کرنے کے لیے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے بغل گیر ہوا، پھر اپنے سابقہ ردِّ عمل کو اُن کے ذہن سے محو کرنے کے لیے چہرے پر تبسّم بکھیر کر ان کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ ہم پٹھان لوگ بہت کم کسی سے متاثر ہوتے ہیں، خاص طور پر میری طبیعت میں کچھ زیادہ ہی استغنا ہے، لیکن اس وقت اس اجنبی کی دلچسپ اور حکیمانہ باتیں سُنیں، تو نیند نے مجھے اپنی آغوش سے نکال دیا۔ اب نیند کی لذّت کی جگہ مولوی صاحب کی ظریفانہ اور علمی باتوں کا کیف و سرور تھا۔

یہ ان کی گفتگو کا اثر تھا یا میری بے وقت کی خود فراموشی کہ مَیں نے اب تک ان کا نام نہیں پُوچھا تھا۔ مَیں ان کا نام پُوچھنے ہی لگا تھا کہ دفعتاً میرا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ مَیں نے اسے چائے لانے کو کہا۔ مہمان بولا: "پہلے کھانا، بعد میں چائے"۔

لڑکے نے پہلے تو ان کے قریب پڑا ہُوا ان کا بیگ اٹھایا اور پھر ٹیک لگانے کے لیے ایک بڑا سا گاؤ تکیہ لاکر ان کے پیچھے رکھ دیا۔ مہمان تو گویا اسی انتظار میں تھا، فوراً کُہنی ٹکا کر نیم دراز ہوگیا۔ اُس نے جس انداز میں اپنا جسم ڈھیلا کیا، اُس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دُور سے آیا ہے اور بہت تھکا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا آگیا۔ کھانے کے دوران مَیں نے اس کا تعارف حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی، تو وہ بولا:

"میرا نام محمود ہے۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں مدرّس ہوں، افتاء کا کام بھی میرے ذمہ ہے۔ آج کل بزرگوں نے جمعیت کی تنظیمِ نو کے سلسلے میں مجھے احباب سے ملاقات پر مامور کیا ہے تاکہ انہیں دینی اور قومی کاموں کی انجام دہی کے لیے آمادہ کروں۔ پشاور میں سب سے پہلے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اس کے بعد چارسدہ جاؤں گا۔ بعدازاں دوسرے مدارس کا رُخ کروں گا۔ آج نمازِ عشا کے بعد آپ کے مدرسے کے طلبا سے خطاب کا ارادہ ہے۔ کل دوسرے مقامات کے پروگرام ترتیب دوں گا، اِن تمام کاموں میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے"۔

یہ تھی میری اور مفتی محمود کی پہلی ملاقات۔ جب وہ صرف محمود تھے، مفتی نہ تھے، تھے تو ایک عام سے مفتی، عام سے مولوی، معمولی مدرّس، ایسے اُستاد جنہیں دیکھ کر کوئی شخص پیشگوئی نہیں کرسکتا تھا کہ مستقبل میں علما کی قیادت کا تاج انہی کے سر پر سجے گا اور یہی عالم سیاست میں غیر معمولی کردار ادا کرکے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوالے گا۔

www.tezpakistan.com

میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ساتھ دہلی گیا۔ مفتی محمود صاحب اس وقت جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں نصاب کی آخری کتابیں پڑھتے تھے اور ان کی فراغت میں صرف دو سال باقی تھے۔ ہماری علیک سلیک دہلی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے مقررین میں برصغیر کے بلند پایہ خطیب مدعو تھے، لیکن سرفہرست امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری کا نام تھا۔ جب جواہر لال نہرو پنڈال میں آئے، تو شاہ صاحب کی تلاوت جاری تھی۔ وہ چپ چاپ آکر سٹیج پر بیٹھ گئے۔ جب تلاوت ختم ہوئی، تو اٹھ کر جانے لگے۔ انہیں تقریر کے لیے کہا گیا، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا قرآن سننے آیا تھا، تقریر کرنے نہیں"۔

شاہ صاحب کو قدرت نے بڑی خوبصورت آواز دی تھی۔ وہ جب پڑھتے تھے، تو نزول کا سماں ہوتا تھا۔ مسلم و غیر مسلم دونوں ہی قرآن کی لذت و حلاوت سے یکساں متاثر ہوتے تھے اور بیشتر سامعین پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ جلسوں کے حوالے سے شاہ صاحب کے بعد جس شخص کی تلاوت کی سب سے زیادہ شہرت ہوئی، وہ مفتی محمود تھے۔ یہ روایتِ حفص ہی کے نہیں، بلکہ سبعہ اور عشرہ کے بھی مستند قاری تھے اور جب حجازی لہجے میں تلاوت کرتے تھے، تو مجمع ساکت و جامد ہو جاتا تھا۔ میرے اور ان کے تعلقات میں اضافے کا سبب ان کی تلاوت تھی۔ بعد ازاں جمعیت کی جو میٹنگیں اور اجلاس ہوتے، ان کا آغاز مفتی صاحب کی تلاوت سے ہوتا تھا۔ ہر جلسے اور میٹنگ سے پہلے ہمیشہ ان کی تلاوت ہوتی۔ ابتداءً تو وہ جماعتی میٹنگوں میں سامع یا مبصر کی حیثیت میں شامل ہوتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ ان کا شوق بڑھا، تو انہوں نے جماعتی امور میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا۔

یہ اس دور کی بات ہے جب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی وفات کے باعث جمعیت کی اہمیت ختم ہو چکی تھی اور اکثر میٹنگوں میں اس کے تنِ مُردہ میں جان ڈالنے کے لیے مختلف تجاویز زیرِ بحث آتی رہتی تھیں۔ ملک بھر کے علما کی نظریں حضرت لاہوری کی طرف اٹھتی تھیں، کیونکہ وہی ایک بزرگ اتنے قد آور اور علم و تقویٰ میں نمونہ تھے کہ ان کی آواز پر تمام علما کو اکٹھا کیا جا سکتا تھا، لیکن ان کا حلقہ، ذکر و فکر، درس و وعظ، اہلِ حلقہ کی اصلاحِ قلبی اور "خدام الدین" کی ترتیب و اشاعت ایسے کام تھے جن کی موجودگی میں ان کے لیے ملک کے مسلسل جماعتی دورے کرنا ممکن نہیں تھا اور مسلسل دوروں کے بغیر جمعیت کو زندہ کرنے کا سوال ہی خارج از بحث تھا۔ جہاں تک عملی سیاست میں حصہ لینے کا تعلق ہے، تو حضرت پہلے ہی اس میں مصروف تھے، لیکن عملی سیاست میں حصہ لینا اور کسی جماعت کو منظم کرنا، اس کی قیادت سنبھالنا بالکل الگ چیزیں ہیں؛ چنانچہ حضرت نے اس سلسلے میں متحرک لوگوں کو جن میں مفتی صاحب اور مولانا غلام غوث ہزاروی بھی شامل تھے، فرمایا: "آپ نوجوان لوگ کام کریں۔ میں آپ کے لیے تعاون اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔"

مفتی محمود صاحب اس بات پر مُصر تھے کہ حضرت لاہوری جماعت کی قیادت سنبھالیں، ہم سے کام لیں۔ انہوں نے کہا: "حضرت، ہم لوگ کیا کام کر سکتے ہیں اور کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ملک میں ہمارا جاننے والا ہی کوئی نہیں۔ جب تک ہم لوگوں سے متعارف نہ ہو جائیں، کوئی ہماری بات سننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ آپ ایک بار پورے ملک میں ہمارا تعارف کرا دیں، اس کے بعد ہم جانیں اور جماعت۔ ہم انشاء اللہ اس کام کو سنبھال لیں گے، لیکن شرط یہی ہے کہ آپ ہماری سرپرستی قبول کر کے ہمارا تعارف کرائیں۔ حضرت لاہوری نے جب ان کا عزم دیکھا، تو آمادہ ہو کر کہا: "اچھا، اگر آپ جمعیت کو سنبھالنے کا عزم کر ہی چکے ہیں، تو میں ضرور تعاون کروں گا۔" مولانا غلام غوث ہزاروی نے تجویز کیا کہ حضرت لاہوری جماعت کے امیر کی ذمہ داریاں قبول کریں۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ امیر کو ہر وقت متحرک رہنا چاہیے۔ میرے دوسرے اشغال کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ تمام جماعتی کام انجام دے سکوں؛ البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ ناظمِ اعلیٰ کے طور پر کام کریں، تو میں بطورِ امیر کام کر سکوں گا، لیکن اس صورت میں آپ کو دن رات میری ہدایات کے مطابق کام کرنا ہوگا۔" یہ ایک طویل بات ہے کہ جمعیت کے انتخابات کیسے ہوئے، کون کونسے حضرات عہدے دار بنے، لیکن جمعیت کی تنظیمِ نو کا آغاز یہیں سے ہوا اور حضرت لاہوری جیسے آدمی کو جمعیت کی امارت قبول کرنے پر مفتی محمود صاحب ہی نے آمادہ کیا۔ اس طرح تنظیم کا یہ سہرا بھی انہیں کے سر پر بجتا ہے، کیونکہ اگر وہ کوشش کر کے حضرت کو آمادہ نہ کرتے، تو جمعیت کی تنظیمِ نو ہوتی اور نہ جمعیت کا کام آگے بڑھتا۔

تنظیمِ نو کے کام کو مفتی صاحب نے آگے بڑھانے اور کارکنوں کی نفری میں اضافہ کرنے کے لیے شب و روز ایک کر دیے۔ ملک کے اکثر

www.tezpakistan.com

بڑے شہروں میں جلسے ہونے لگے؛ یہاں تک کہ سب سے آخر میں لاہور میں ایک ملک گیر کانفرنس کا اہتمام کر لیا گیا۔ اس سال حضرت پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ جاتے وقت انہوں نے مفتی محمود صاحب کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ مفتی صاحب کی قائم مقام امیر کے طور پر تقرری گویا ان کی کارکردگی کی سند اور خدمات کا اعتراف تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت بہت بڑے صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ وہ آدمی کے ظاہر کو کم ہی دیکھتے تھے، ان کی توجہ کا اصل مرکز باطن تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کس انسان میں کتنی صلاحیت ہے اور وہ مستقبل میں کتنا بہتر طور پر کام کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مفتی صاحب کا علمی مقام بھی اس بات کا متقاضی تھا کہ انہیں اتنی بڑی ذمہ داری کا اہل قرار دیا جاتا۔ بہرحال جب حضرت جانے لگے تو مفتی صاحب نے انہیں بتایا کہ کانفرنس کے انعقاد میں صرف پندرہ روز باقی رہ گئے ہیں اور اگر آپ فریضۂ حج کی ادائیگی کے فوراً بعد واپس تشریف لے آئیں تو کانفرنس ہو سکے گی؛ ورنہ اس کانفرنس کو سنبھالنا ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ حضرت نے فرمایا میں تو آجاؤں گا، لیکن کانفرنس کا انعقاد مشکل نظر آتا ہے؛ چنانچہ حضرت ابھی حرمِ پاک ہی میں تھے کہ انہیں ملک میں مارشل لا کے نفاذ کی خبر مل گئی۔ اب انہیں یقین تھا کہ کانفرنس نہیں ہو سکے گی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے وعدے کے مطابق پاکستان واپس پہنچ گئے۔ ان کے اس ایفائے وعدہ پر سب حیران تھے کہ اس یقین کے باوجود بھی انہوں نے حسبِ وعدہ آنا ضروری سمجھا کہ کانفرنس نہیں ہو سکے گی۔ ایوب حکومت کو یقین تھا کہ ملک بھر میں علما کا ایک متحرک طبقہ موجود ہے اور اس متحرک طبقے پر گرفت کرنا ضروری ہے، اس لیے مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی مولانا غلام غوث ہزاروی کو چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا، اور جب یہی احکامات حضرت لاہوری کے پاس پہنچے، تو انہوں نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ اس طرح نئی انتظامیہ ملک کے تمام علما کو نظر بند کرنے میں کامیاب ہو جائے گی، کیونکہ میرا نظر بندی کے احکامات قبول کرنا دوسرے علما کو نظر بندی قبول کرنے کی دعوت دینے کے مترادف ہوگا، اس لیے میں ان احکامات پر عمل درآمد سے انکار کرتا ہوں۔

مفتی صاحب چونکہ حضرت کے قائم مقام مقرر ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے بھی نظر بندی کے احکامات کو قبول کرنا حضرت لاہوری کی اہانت تصور کیا اور ان احکامات کی تعمیل نہ کی؛ تاہم حکومت نے بھی جنگ کے بجائے صلح کا راستہ اختیار کرتے ہوئے ان پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ یہی وہ تاریخ ساز لمحہ تھا جب مفتی صاحب نے حضرت لاہوری کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جرأت و استقامت کا مظاہرہ کر کے پورے ملک کے علما میں اپنے لیے ایک باوقار اور اہمیت کا حامل مقام حاصل کر لیا۔

مفتی صاحب ایک عالمِ باعمل، عارف باللہ اور ہمارے بزرگوں کی اعلیٰ مجاہدانہ روایات کے محافظ و امین تھے۔ قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ تحمل و بردباری میں اپنی مثال آپ تھے۔ جس قدر ان کا ظاہر خوبصورت تھا، اسی قدر ان کا باطن بھی خوبصورت تھا۔ اس سال ہم رائے ونڈ کے اجتماع میں اکٹھے گئے۔ مفتی صاحب تمام راستے میں موت اور آخرت کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے انہیں اجتماع میں جانے سے پہلے ان کی علالت کے باعث روکا، تو کہنے لگے: "اس سال تو جانا ہی پڑے گا۔ وہاں مولانا انعام الحق اور دوسرے بزرگ تشریف لائیں گے۔ خدا جانے اس کے بعد پھر ملاقات ہو نہ ہو۔" حضرت مفتی صاحب اپنے موجودہ بزرگوں میں سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت شیخ الحدیث ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن کو بیعت کر لیں، لیکن ادب کا یہ عالم تھا کہ یہی بات وہ خود حضرت سے نہ کہہ سکے؛ چنانچہ مجھے حکم دیا کہ میں حضرت کے ہاتھ میں ان کے بیٹے کا ہاتھ دے دوں۔ بہرحال رائے ونڈ کے اجتماع کے موقع پر علما کا ایک خصوصی اجتماع ہوتا ہے۔ اس سال مفتی صاحب نے اس میں بطورِ خاص شرکت کی اور مراقبہ بھی کیا۔ ان کے ساتھ وہاں پر موجود دوسرے علما بھی شریکِ مراقبہ ہوئے۔ بعد ازاں مفتی صاحب سب علما سے اس طرح ملے جیسے انہیں یقین ہو کہ یہ ان کی ان علما سے آخری ملاقات ہے۔

اجتماع کے بعد بھی مفتی صاحب میرے ساتھ موت اور آخرت کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا: ایسی بات نہ کیجیے! ملک اور قوم کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے۔ کہنے لگے: نہیں! اب میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے اپنا یہ خواب بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرتؐ کا روضۂ اطہر میرے سامنے کھلا اور اس طرح کہ آنحضرتؐ موجود ہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان کوئی حجاب نہیں اور آپؐ مجھے بلا رہے ہیں۔ اس کی تعبیر انہوں نے یہ نکالی کہ آپؐ کا بلانا، اس دنیا سے واپس ہونے کا اشارہ ہے اور آپؐ کے اور اپنے درمیان

www.tezpakistan.com

حجاب کا نہ ہونا بھی دوسری دنیا کا نقشہ ہے جہاں آپؐ کے غلام آپؐ سے کسی حجاب کے بغیر ملتے ہیں۔ مفتی صاحب کو اس سال اپنی موت کا یقین تھا، لیکن ان کا خیال تھا کہ فریضۂ حج کا قدرت انہیں ضرور موقع دے گی، کیونکہ ان کی زبردست تمنا ہے کہ ایک بار پھر خدا کے گھر کا طواف کریں اور اپنی اخروی زندگی کی بہتری کے لیے اس کے اس گھر میں جاکر دعا مانگیں جہاں ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ میں نے سفرِ حج سے پہلے انہیں مشورہ دیا کہ آپ اب سفر وغیرہ کم کردیں۔ فرمانے لگے حج کے بعد بالکل ختم کردوں گا، مگر اپنی موت کے بارے میں ان کی پیش گوئی حج سے پہلے ہی پوری ہوگئی۔ ان کا کام ختم ہوچکا تھا۔ انہیں خدا نے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس بلالیا۔ بندہ بھی جانے کے لیے بے قرار تھا اور آخر کار ع

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب کے یہ تاثرات ایک اور قلم کار شعیب الرحمٰن نے مفتی صاحب کی وفات کے چند روز بعد حاصل کیے تھے۔ انہیں بھی نذرِ قارئین کیا جارہا ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

خدا معلوم کس کا شعر ہے اور کس کے لیے کہا گیا ہے، لیکن آج مفتی صاحب کے سانحۂ ارتحال پر یہ شعر بار بار ذہن سے ٹکراتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک محفل اُجڑ گئی، ایک بزم ویران ہوگئی، ایک عہد ختم ہوگیا، ایک روایت نے دم توڑ دیا۔ زندگی کو حرکت و عمل کا نام دینے والا خود ہی اس دنیا میں جا بسا جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا اور جو دارالعمل نہیں دارالجزا کی تمہید ہے۔

ربع صدی کا طویل عرصہ مرحوم کے ساتھ چلنے کا اتفاق ہوا۔ رزم و بزم اور جلوت و خلوت کی کتنی ہی یادیں ہیں جو جگمگا رہی ہیں۔ ہم سفری اور ہم فکری کے کتنے چراغ ہیں جن کی روشنی میں مرحوم کی عظمت اور بلندیٔ کردار صاف نظر آرہی ہے۔

عام حضرات یہ جانتے ہیں کہ مرحوم نے مدرسہ قاسمیہ مرادآباد (یو۔پی) سے تکمیلِ علوم کے بعد اپنے گھر پر عبدالخیل اور بعد میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اس مدرسے کا سنگِ بنیاد ۱۹۴۶ء میں رکھا تھا اور مفتی صاحب نے ۱۹۵۱ء میں یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۶۲ء تک بالالتزام اور ۱۹۷۵ء تک کسی قدر وقفے کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ہر علم و فن کی ہر کتاب انہوں نے پڑھائی اور پڑھانے کا انداز یُوں تھا کہ طلبا جی جان سے نثار ہوتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد تدریس کا سلسلہ بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۷۷ء شروع ہونے کے بعد تو شاید ہی انہیں کبھی درس دینے کا موقع ملا ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشغلۂ تدریس کے ترک کا انہیں شدید احساس تھا۔ یہ ترک اختیاری نہیں اضطراری تھا، کیونکہ وہ ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کے مشکل ترین کام میں مشغول ہوگئے تھے۔

ہمارے حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری علومِ اسلامیہ کے فارغ علما اور منتہی طلبا کو رمضان شریف سے ذوالحجہ تک قرآن کریم کا دورہ پڑھاتے تھے۔ تقسیمِ ملک سے قبل دارالعلوم دیوبند سمیت تمام بڑے بڑے مدارس کے ہونہار طلبہ اس درس میں شریک ہوتے تھے۔ الحمدللہ یہ سلسلہ اب تک قائم ہے، لیکن وقت میں بوجوہ تبدیلی کردی گئی ہے۔ چند سال پہلے ہم نے مفتی صاحب مرحوم سے اس جماعت کو پڑھانے کے لیے کہا۔ بھٹو صاحب کا دورِ اقتدار تھا اور حالات سخت دگرگوں، لیکن انہوں نے کمالِ شفقت سے اس کو منظور کرلیا۔ اس مقصد کی خاطر جب وہ لاہور تشریف لائے تو مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ لاہور کی عمارت میں قیام فرمایا۔ مدرسے کی عظیم الشان لائبریری کھلوائی اور قرآن کریم کی جتنی قدیم تفاسیر اس میں تھیں، وہ نکلوائیں۔ اس کے علاوہ جامعہ مدنیہ کے کتب خانے سے بعض تفاسیر منگوائیں، کچھ دوستوں اور عزیزوں سے ذاتی کتابیں حاصل کیں۔ یہاں تک کہ ان کی چارپائی کے نزدیک جو بڑی میز تھی، وہ تفاسیر سے بھر گئی۔ ان میں عربی اور اردو کے علاوہ ایسی لوگوں کی تفاسیر بھی تھیں جو عام طور پر دینی اور علمی حلقوں میں پسندیدہ نہیں سمجھی جاتیں۔ قریباً چھ گھنٹے روزانہ اس طرح پڑھاتے کہ نصف وقت کے بعد چند لمحوں کے لیے وقفہ کرتے اور اس وقفے میں چائے کی ایک پیالی نوشِ جاں فرماتے (رمضان کی آمد کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا) اس جماعت میں الگ الگ ڈیڑھ صد طلبا شریک ہوتے۔ چونکہ آپ کے زیرِ درس زیادہ تر حدیث اور فقہ کے اسباق رہے تھے، اس لیے حیرانی ہوئی کہ پہلی بار تفسیری اسباق کس شان سے پڑھائے جا رہے ہیں۔ اسلاف کی متعین راہوں پر چل کر قرآنی نکات کا بیان اور جدید افکار پر ٹھوس اور متین تنقید انہی کا کام تھا۔ سبق سے فراغت پر ظہر ہوجاتی۔

www.tezpakistan.com

نماز کے بعد روزانہ کی ڈاک کا جواب اور بعض آنے والوں سے ملاقات فرماتے۔ چند لمحات کے آرام کے بعد نمازِ عصر پڑھی جاتی، پھر مغرب تک علمی مجلس جمتی، علم و آگہی کے چراغ جلتے۔ اس کے بعد رات گئے تک تفاسیر کا مطالعہ اور مختصر قیام۔ آپ حیران ہوں گے اس عرصے میں وہ کئی مرتبہ اسلام آباد تشریف لے گئے، کیونکہ وہاں قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا، تو آنے جانے کا پروگرام اس طرح ترتیب دیتے کہ کم سے کم وقت اسلام آباد میں قیام ہو اور اگر پھر بھی کبھی سبق ناغہ ہوتا، تو جمعہ کے دن یا رات کے اوقات میں اس کی تلافی فرما دیتے۔

یہ واقعہ تفصیل سے اس لیے بیان کیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ سیاست جسے وہ بہرحال دین کا اہم ترین جزو سمجھتے تھے، کی شدید مصروفیتوں کے درمیان بھی وہ علمی ماحول کے لیے کس طرح وقت نکالتے، اور پھر جس دلجمعی اور استقامت سے تدریسی اور علمی ذمہ داریاں پوری کرتے، وہ ہمارے نوجوان علما کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا واقعات کا لامتناہی اور غیر مختتم سلسلہ سامنے آ رہا ہے، لیکن وقت اور حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ نمونے کے طور پر ایک واقعہ سامنے آ گیا جس میں بڑے ہی سبق ہیں ——— اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی شبانہ روز محنت کو قبول فرما کر ملت کو نیک مقاصد میں کامیاب کرے۔

مولانا صدر الشہید (بنوں)

ان کے فتووں میں
نہ مبالغہ ہوتا، نہ افراط نہ تفریط
وہ اس عہد کے مفتی نہیں تھے!

مفتی صاحب متواضع اور خلیق انسان تھے، ان کا علم وسیع تھا اور حلم وسیع تر۔ میرا اور ان کا تعلق جس قدر قدیم ہے اس لحاظ سے ان کی یادوں اور باتوں کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا، کیونکہ ع یہ پون صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

بات مختصر کرنے کے لیے میں ان کی زندگی کے فقہی پہلو کو لیتا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک ان کا فقہی مقام سب سے زیادہ بلند تھا۔ بحیثیت فقیہ وہ اس دور کے آدمی نہیں تھے۔ گزشتہ دور کے انسان تھے، یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان کی لیاقت و ذہانت کو میں طالب علمی کے زمانے سے دیکھتا آیا ہوں۔ فقہ سے انہیں شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ جس طالب علم کو وقایہ اور ہدایہ کے اسباق سمجھ نہیں آتے تھے یا جو سمجھ کر بھول جاتے تھے، وہ اس وقت بھی بھولے بسرے "مسائل" انہی سے پوچھتے تھے، درسی کتب تو انہوں نے سبقاً پڑھی تھیں، ان کے علاوہ بہت سی غیر درسی فقہی کتابیں بھی انہیں ازبر تھیں۔ فراغت کے بعد انہوں نے فقہی کتب شوق سے پڑھائیں اور خوش قسمتی سے انہیں طالب علم بھی لائق میسر آئے جو ان کی شہرت کا

www.tezpakistan.com

سبب ہے۔ قاسم العلوم ملتان میں ان کی آمد بھی دراصل ان کے شاگردوں کی پیدا کردہ شہرت کا نتیجہ تھی' ورنہ بڑے مدارس میں چھوٹے شہروں اور مدرسوں میں پڑھانے والے اساتذہ کو جگہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب کے پاس جو طالب علم ابتدائی فقہی کتب پڑھتے تھے وہ بڑے مدارس میں اگر فقہ کے آخری درجے کی کتب میں بھی بارسوخ ثابت ہوتے تھے' ایسے طالبعلموں کو ہر استاد مطمئن نہیں کر سکتا۔

مفتی محمود کی شہرت عام ہوئی تو قاسم العلوم کی انتظامیہ انہیں اپنے مدرسے میں بلانے پر مجبور ہو گئی۔ جب مفتی صاحب قاسم العلوم میں آگئے تو منتظمین کو معلوم ہوا کہ یہ صرف فقہ کے ماہر ہی نہیں' علم حدیث پر بھی پوری دسترس رکھتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ بحیثیت استاد تو مفتی صاحب علم حدیث پڑھائیں اور بحیثیت مفتی دارالافتاء کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اب مفتی محمود ایک ہی وقت میں شیخ الحدیث بھی تھے اور قاسم العلوم کے مفتی بھی۔

قاسم العلوم میں ان کے ابتدائی دور میں لوگ ہزاروں مسائل لے کر آئے اور انہوں نے ہزاروں فتوے جاری کیے۔ ان میں بیشتر مسائل مشکل اور اُلجھے ہوتے تھے' لیکن مفتی صاحب کے دست گرہ کشا کے سامنے یہ اُلجھاؤ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے' چونکہ اس مدرسے میں مفتی صاحب اس شرط پر آئے تھے کہ انتظامیہ ان کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں لگائے گی' اس لیے جب مفتی صاحب کی سیاسی مصروفیات بڑھ گئیں تو افتاء کا کام کم ہو گیا۔ اب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو مفتی صاحب اس پر فتویٰ دیتے' عام مسائل پر نائب مفتی ہی جواب لکھ دیتے تھے۔ میری معلومات کے مطابق ایسا بہت کم ہوا ہے کہ مفتی صاحب کو کسی مسئلے پر پریشانی ہوئی ہو اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ان کے قلم سے کوئی غلط فتویٰ نکلا ہو اور بعد ازاں اس پر انہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فتویٰ صادر کرنے سے پہلے متعلقہ مسئلے کی تمام کلیات و جزئیات کو سمجھتے تھے' اس کے بعد اس موضوع پر جملہ کتب کو سامنے رکھتے تھے' تب جا کر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ کس مسئلے پر کیا فتویٰ دینا درست ہوگا؟

ایک بار ایک مسئلے پر انہیں اُلجھاؤ ہوا تو انہوں نے اپنے استاد کی طرف رجوع کیا۔ اس وقت مجھے وہ مسئلہ یاد نہیں رہا کیا تھا' اتنا یاد ہے کہ مفتی صاحب نے اس مسئلہ پر تحقیق کی' لیکن وہ اس کی تعبیر سے قاصر تھے' ملتان میں ایک بزرگ ہمارے مشترکہ استاد تھے' مفتی صاحب نے وہ مسئلہ ان کے پاس بھیج دیا۔ بعد ازاں مجھے استادِ محترم نے بتایا کہ مفتی محمود نے ایک مسئلہ ان کے پاس بھیجا ہے اور ساتھ ہی اپنی تحقیق ارسال کی ہے۔ میں نے اُن سے مسئلے کی بابت استفسار کیا تو فرمانے لگے' مسئلہ وہی ٹھیک ہے جو مفتی صاحب نے سمجھا ہے' انہیں دلائل اور حوالہ جات مل چکے تھے۔ دلائل میں تطبیق کرنے میں ان سے سہو ہو گیا' اس لیے اس کی تعبیر ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انہوں نے یہ کیس میرے سپرد کر دیا۔ میں نے انہیں یاد دلایا ہے کہ ان سے کس مقام پر مسئلے کا کون سا پہلو نظر انداز ہوا ہے جس کے باعث انہیں پریشانی ہوئی ہے' میری نشاندہی سے وہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

میں نے بہت سے مسائل پر اُن سے خود بھی بات کی ہے' وہ بے پناہ حافظے اور قوتِ استدلال کے مالک تھے' فتویٰ زبانی ہو یا تحریری دونوں میں احتیاط ملحوظ رکھتے تھے' ان کی تقاریر سننے والے جانتے ہیں کہ وہ کس احتیاط سے ایک ایک جملہ کہتے اور ایک ایک بات سمجھاتے تھے' تقریر کی نسبت تحریر میں زیادہ محتاط تھے' تقریر میں کوئی لفظ آگے پیچھے استعمال کرنے سے بات کا مفہوم بدل جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔ اگر مقرر کو یاد نہ رہا تو بعد میں سوال کرنے پر وہ اس کی تشریح کر دیتا ہے' لیکن تحریری بات میں سہو کا امکان کم ہوتا ہے۔ تحریر کی غلطی صاحب تحریر کی غلطی سمجھی جاتی ہے' یہ تو عام تحریر کا اصول ہے' فتوے کی بات تو انتہائی سخت اور نازک ہوتی ہے۔ مفتی محمود اس بارے میں بے حد محتاط واقع ہوئے تھے' فتویٰ لکھتے وقت بھول کا احتمال موجود ہوتا ہے' بسا اوقات نظر ثانی کرتے وقت بھول کا احساس ہو جاتا ہے اور بسا اوقات فتویٰ دینے کے بعد بھی مفتی کو کسی غلطی کا احساس یا اس بارے میں کسی نئی بات کا علم ہو سکتا ہے۔ مفتی صاحب مرحوم پہلے ہی فتویٰ کامل احتیاط سے لکھتے تھے اور آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے تحریر کردہ فتوے پر کسی مفتی یا عالم نے اعتراض کیا ہو یا انہوں نے اپنے کسی فتوے سے رجوع کیا ہو۔

اگر بات فتوے دینے تک ہی ختم ہو جاتی تو اس بارے میں مفتی محمود کی کوئی انفرادیت نہیں تھی' لیکن ان کے ہاں ایک انفرادیت پائی جاتی تھی اور وہ تھی فتویٰ دینے میں اعتدال کی راہ۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ کسی مسئلے کا ایک رُخ کیسا ہی واضح اور کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو وہ مسئلے کے دوسرے پہلو کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے' جب تک مسئلے کے دوسرے پہلو پر پوری تحقیق نہیں کر لیتے تھے' فتویٰ ہرگز نہیں دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اس بات کا وہ خیال رکھتے تھے کہ کسی مسئلے کے اثبات یا نفی میں دلائل لکھتے وقت مبالغہ اور افراط و تفریط سے کام نہ لیا جائے' جس بات کا جس درجے میں اثبات

www.tezpakistan.com

ہو اس کا اسی قدر اثبات کیا جائے اور جس چیز کی جس قدر نفی ہو اس کی اتنی ہی اور اسی قدر نفی کی جائے۔ افراط و تفریط سے بہت سی استحبابی چیزیں وجوب کا درجہ پا جاتی ہیں اور بہت سی وجوب کا درجہ رکھنے والی چیزیں استحباب کی جگہ آجاتی ہیں' اس لیے ان کے نزدیک نفی اور اثبات میں تشدد کا راستہ اختیار کرنا جائز نہیں تھا۔ مفتی صاحب چونکہ بحیثیت مفتی انتہائی اعتدال پسند تھے' اس لیے یہ اعتدال ان کی شخصیت کا لازمہ بن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قومی زندگی میں بھی ہمیشہ اعتدال نظر آتا تھا۔

مولانا محمد اجمل خان

ڈاکٹر دوالیبی ان سے لپٹ کر کہنے لگے:
"میں نے اس مسئلے پر ایسے دلائل
آج تک نہیں سُنے۔"

مجھے طویل عرصے تک مفتی صاحب کے ساتھ سفر و حضر میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ طویل دورے بھی کیے۔ مشرقی پاکستان بارہا ان کے ہمراہ گیا۔ حرمین شریفین میں بھی ان کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ گزشتہ بائیس سالہ دور میں انہیں بہت قریب سے دیکھا۔ قرب کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیت میں وہ کشش نہیں رہتی جو دُور سے دیکھنے والے کو متاثر کرتی ہے' لیکن مفتی صاحب کے میں جس قدر قریب ہوا' ان کی شخصیت اسی قدر حسین' جاذبِ نظر اور پُرکشش محسوس ہوئی۔ وہ عہدِ حاضر کے ان علما اور محققین کے سرخیل تھے جن کے علمی اور سیاسی وجود پر نہ صرف برِصغیر' بلکہ تمام عالمِ اسلام فخر کر سکتا ہے۔ وہ ایک ہمہ صفات انسان اور عجیب و غریب خوبیوں کے مالک تھے۔ قدرت نے انہیں اتنی اعلیٰ اور منفرد خصوصیات سے نوازا تھا کہ علم و دانش کے اس بحرِ بے کراں کا علمی استحضار بڑے بڑے علما کے لیے قابلِ رشک تھا۔ ان کی فاضلانہ بصیرت مسلّم تھی۔ وہ بیک وقت مفسرِ قرآن' محدثِ زمان' فقیہِ دوران اور عربی کے قادر الکلام مقرر تھے۔ عربی زبان اس فصاحت سے بولتے تھے کہ ان پر اہلِ زبان کو بھی اہلِ زبان ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ انہوں نے مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں منصبِ افتا پر فائز ہو کر تقریباً ۲۲ ہزار فتوے صادر کیے اور کسی ایک فتوے پر بھی کوئی عالم یا مفتی انگشت نمائی نہیں کر سکا۔ ترمذی شریف کی عربی شرح ان کا علمی شاہکار ہے۔

مفتی صاحب کی علمی اور سیاسی صلاحیتوں کا کوئی شمار نہیں اور ایک ایسے شخص کی خوبیوں کو گنا بھی نہیں جا سکتا جو اپنی ذات میں ایک انجمن' ایک تحریک' ایک دعوت' ایک دور اور ایک ادارہ ہو۔ تاہم میں ان کے ایک رفیقِ سفر کی حیثیت سے اپنے چند ایسے مشاہدات پیش کرتا ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب عالمِ اسلام کے چند بڑے علما میں سے ایک تھے:

ایک بار ڈاکٹر معروف الدوالیبی' مفتی صاحب سے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں ملنے کے لیے تشریف لائے' تو فرمانے لگے:

www.tezpakistan.com

"مفتی صاحب! ویسے تو آپ کو وقت نہیں ملتا، میں نے سوچا چلیے ہسپتال ہی میں آپ سے ایک علمی مسئلے پر بات ہو جائے!" مفتی صاحب نے فرمایا کیسے!" ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: "میں آپ سے "مسئلہ رجم" پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس بارے میں دشمنانِ اسلام عجیب وغریب اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک وحشیانہ سزا ہے، لیکن چونکہ شریعت نے شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے "رجم" ہی کی سزا مقرر کی ہے، اس بارے میں اسلام دشمنوں کی باتوں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ جہاں تک سزا کے نفاذ کا تعلق ہے، یہ تو بہر حال ضروری ہے، لیکن سزا کے طریقے پر نظرِ ثانی کر لینے میں کچھ حرج نہیں۔ اس سزا کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے فاسق آدمی کا وجود برداشت نہیں کرتا جو گناہ کا بیج بو کر سوسائٹی کو ناپاک کرتا ہے۔ اسلام نے اس کے وجود سے سوسائٹی کو پاک کرنے کے لیے اس کے لیے سزائے موت تجویز کی ہے، اس لیے حکم ہے کہ ثبوتِ جرم کے بعد اس پر حد جاری کر دی جائے۔ اس سزا کی انتہا اس کی جان کا اتلاف ہے۔ اب اگر جان کا اتلاف ہی مقصود ہے تاکہ زنا جیسے بھیانک جرم کے ارتکاب کا دروازہ بند ہو اور سوسائٹی اس آلودگی سے بچی رہے، تو جدید دور میں اگر کسی دوسرے معروف طریقے کو اختیار کر لیا جائے جس سے مجرم کی جان کنی کا مرحلہ آسان ہو جائے، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مثال کے طور پر ثبوتِ جرم کے بعد مجرم کو گولی مار دی جائے، بجلی کا کرنٹ لگا کر ہلاک کر دیا جائے یا پھانسی دے دی جائے۔ یہ عمل اس صورت سے بہتر ہے کہ ایک آدمی کو سرِ عام کھڑا کر کے تمام لوگوں کو حکم دیا جائے کہ اس پر سنگ باری کریں تاکہ وہ ہلاک ہو جائے جبکہ اس کی ہلاکت کی دوسری صورتیں موجود ہیں۔ ان سے مقصد پورا ہوتا ہے اور دشمنانِ اسلام کی زبانیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اجتماعی طور پر اس مسئلے میں اجتہاد کر کے اس سزا کی صورت متعین کرنی چاہیے۔ میں نے اب تک عالمِ اسلام کے جن اکابر علما کے سامنے اپنی رائے پیش کی ہے، بیشتر نے میرے خیال سے اتفاق کیا ہے؛ البتہ چند علما ایسے بھی تھے جو "رجم" ہی کے حق میں ہیں، لیکن رجم کیوں ضروری ہے؟ اس کے ضروری ہونے کے لیے کوئی وزنی دلیل موجود نہیں۔"

مفتی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: "آپ کی بات ختم ہو گئی یا اس سلسلے میں آپ مزید کچھ فرمانا چاہتے ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا: "نہیں"۔ اس پر مفتی صاحب نے فرمایا: "دراصل آپ نے "رجم" کی مقصدیت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس سزا کے اجرا سے شریعت کا مقصد مجرم کی جان کا اتلاف ہے، درحقیقت معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر مجرم کو ہلاک کرنا ہی مقصود ہوتا، تو آنحضرتؐ کے دور میں بھی ہلاکت کے دوسرے طریقے موجود تھے۔ کسی زانی یا زانیہ کو تلوار کے ایک ہی وار سے ختم کیا جا سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رجم کا مقصد کم از کم وہ نہیں جو آپ نے سمجھا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ اس حد پر گفتگو کا جواز ہی نہیں۔ اگر یہ رسول اللہؐ کا صرف قولی حکم ہوتا، تو اس کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اس پر کسی حد تک گفتگو کا جواز تھا؛ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ رسولِ کریمؐ کا صرف قولی حکم نہیں، اس پر آپ کا عمل بھی موجود ہے اور آپ نے شادی شدہ زانی اور زانیہ پر خود حد جاری فرمائی ہے۔ یہ حد "رجم" کی صورت میں تھی، قتلِ محض کی صورت میں نہیں تھی؛ لہٰذا یہ مفروضہ باطل ہو گیا کہ اس سزا سے مقصد مجرم کی جان کا اتلاف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سزا کا مقصد کیا ہے؟ جب مقصد سمجھ میں آجاتا ہے، تو اس سزا پر اعتراض یا سزا کے نفاذ کے طریقے میں تبدیلی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں آنحضرتؐ کے دور کے دو واقعات موجود ہیں اور ان دونوں واقعات میں اس سزا کی حکمت مضمر ہے۔

پہلا واقعہ حضرت ماعزؓ بن مالک کا ہے۔ وہ خود ہی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعترافِ جرم کر کے آپ سے اپنے اوپر حد جاری کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "جاؤ چلے جاؤ، سوچ سمجھ کر آنا، تم نے واقعی یہ جرم کیا ہے؟" وہ دوبارہ حاضرِ خدمت ہوئے، تو آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے فرمایا اس شخص کو شاید جنون ہو گیا ہے! صحابہؓ نے عرض کیا یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک اور صحیح الدماغ آدمی ہے۔ اس موقع پر بھی رسولِ خداؐ نے انہیں واپس بھیج دیا۔ پھر وہ تیسری بار حاضرِ خدمت ہوئے اور آپؐ سے حد جاری کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ آپؐ نے صحابہؓ سے پوچھا اس شخص نے کچھ پی تو نہیں لیا۔ شاید بہک گیا ہے۔ صحابہؓ میں سے بعض نے اسے سونگھ کر دیکھا اور عرض کیا اس کے منہ سے بو نہیں آتی، اس نے کوئی نشہ آور چیز ہرگز نہیں استعمال کی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

دوسرا واقعہ "غامدیہ" نامی ایک خاتون کا ہے۔ وہ بھی خود ہی حاضرِ خدمت ہوئی اور آنحضرتؐ سے اپنے اوپر حد جاری کرنے کا مطالبہ کیا آنحضرتؐ نے اسے بھی یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ وہ سوچ سمجھ کر آئے کیا واقعی اس نے یہ گناہ کیا ہے۔ وہ دوبارہ اس وقت حاضرِ خدمت ہوئی

www.tezpakistan.com

جب اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس نے اپنے گناہ پر اس بچے کو بطور ثبوت پیش کر کے وہی مطالبہ دہرایا کہ اسے گناہ سے پاک کرنے کے لیے اس پر حد جاری کی جائے۔ آپؐ نے فرمایا: "جاؤ چلی جاؤ۔ جب یہ بچہ دودھ چھوڑ دے، اس کے بعد آنا۔" تیسری بار وہ عورت آئی، تو اس کے بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ وہ کہنے لگی: "اللہ کے رسولؐ! اب تو یہ بچہ کھانے پینے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے اس تیسرے اقرار کے بعد رسولِ کریمؐ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اسی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ "رجم" کے وقت جب لوگ اسے پتھر مار رہے تھے، تو ایک پتھر لگنے سے اس کے جسم سے خون فوارے کی طرح نکلا اور حضرت خالد بن ولیدؓ کے کپڑوں پر چھینٹے پڑے۔ اس پر انہوں نے کوئی سخت جملہ کہا۔ آنحضرتؐ نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: "خالد! ایسا مت کہو۔ یہ تو اب اتنی پاک ہو چکی ہے کہ اس کی توبہ اگر مدینہ کی پوری بستی پر تقسیم کی جائے تو تمام اہلِ مدینہ کی بخشش کے لیے کافی ہے۔"

ان دو واقعات سے آنحضرتؐ کا اپنا عمل سامنے آتا ہے۔ اب غور کریں، تو زنا کی حد جاری کرنے کی دو ہی عقلی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ مجرم خود اعترافِ جرم کر لے، جیسا کہ ان واقعات میں نظر آتا ہے۔ دوسرا یہ کہ مجرم کے جرم پر قانونِ شہادت سے ثبوت مل جائے۔ اب دونوں صورتوں میں آپ کا عقلی استدلال یہ ہے کہ مجرم کو رجم کرنے کے بجائے گولی مار دی جائے یا بجلی کے جھٹکے سے اسے ختم کر دیا جائے، کیونکہ آپ کے نزدیک اس سے مقصود اس کی جان کا اتلاف ہے، لیکن صحیح صورت یہ ہے کہ خدا آپ سے اور ہم سے زیادہ حکیم ہے۔ اس کا رسولؐ اس حکمت کو تمام انسانوں سے زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اسلام خود ہی ایک دینِ حکمت ہے۔ دراصل دنیا جس سزا کو وحشت سے تعبیر کرتی ہے، وہی جان بچانے کا سبب ہے۔ آپ نے یہ سمجھا ہے کہ اس سزا سے مقصود اتلافِ جان ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سزا سے مقصود حفاظتِ جان ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر آپ کا طے کردہ طریقِ سزا مان لیا جائے، تو شہادت ملنے یا اقرارِ جرم کرنے کے بعد مجرم کو ایک منٹ ہی میں ختم کر دیا جائے گا، جبکہ رجم میں اس کی بچت کی یہ صورت موجود ہے کہ اِدھر سنگ زنی شروع ہوئی اور اُدھر کوئی ایک گواہ چیخ اٹھا: ہائے میں مر گیا، غضب ہو گیا، میں نے فلاں شخص کے اُکسانے پر یا فلاں دشمنی کے باعث گواہی دی ہے، درحقیقت یہ آدمی مجرم نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ دو چار پتھروں سے آدمی مر تو نہیں سکتا، لیکن گواہ نے اگر جھوٹی گواہی دی ہے، تو وہ اس منظر سے اتنا متاثر ہو گا کہ آخر وقت پر بھی سچ کہہ کر اس کی سزا موقوف کرا دے گا۔ اسی طرح اگر مجرم نے خود اقرار کیا اور اس پر حد جاری کی گئی، جب اس پر پتھر برسنے شروع ہوئے، تو وہ چیخ اٹھا کہ میں نے مرنے کا ایک بہانہ سوچا تھا۔ اب میں مرنا نہیں چاہتا۔ اس قسم کی کوئی اور بات وہ کہہ دے، تو اس کی سزا فوراً موقوف ہو جائے گی۔"

مفتی صاحب کی گفتگو جاری تھی کہ ڈاکٹر دوالیبی ایک دم کھڑے ہو کر مفتی صاحب سے لپٹ گئے اور کہنے لگے: "بس مفتی صاحب! میں نے آج تک اتنے زوردار عقلی دلائل نہیں سنے!"

مفتی صاحب کے متبحر عالمِ دین اور منفرد مفتی ہونے کا ایک اور واقعہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے ساتھ مشینی ذبیحہ کے مسئلے پر اختلاف کی صورت میں سامنے آیا۔ مفتی شفیع صاحب مرحوم کا فرمان تھا کہ اگر کسی مسلمان شخص نے "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر مشین کا بٹن آن کر دیا، تو مشین کے چلنے سے جتنے جانور ذبح ہوں گے، وہ سارے حلال ہوں گے، کیونکہ مشین چلانے والا مسلمان ہے اور اس نے بوقتِ ذبح اللہ کا نام لیا ہے۔ مشین چونکہ تکبیر کی شرط پوری نہیں کر سکتی، وہ شرط اس مسلمان نے بٹن آن کرتے وقت پوری کر دی، تو یہ ذبیحہ حلال ہو گا، کیونکہ تکبیر اور "ذبح" دونوں کا ظہور ہوا ہے۔ مفتی محمود صاحب کا استدلال تھا کہ جانور پر تکبیر پڑھنے والے مسلمان شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود "ذابح" ہو، ذبح کا سبب نہ ہو۔ مشین چلانے والے عمل میں مسلمان "ذابح" نہیں بنتا، بلکہ صرف ذبح کا سبب بنتا ہے۔ ذابح وہ مشین ہوتی ہے جو بٹن آن کرنے سے چلتی ہے، اس لیے اس صورت میں ذبح کی شرط "مکبر ذابح" کی ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ ذبیحہ حرام ہو گا، حلال نہیں ہو گا۔ اس سلسلے میں مفتی محمود صاحب نے مفتی محمد شفیع صاحب کے سامنے یہ مثال پیش کی کہ فرض کریں، ایک مجوسی شخص جانور ذبح کرنا چاہتا ہے اور ایک دوسرا شخص اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ذبح کے عمل سے روک دیتا ہے۔ اچانک ایک مسلمان وہاں پہنچ کر اس دوسرے روکنے والے آدمی کو پکڑ لیتا ہے اور مجوسی سے کہتا ہے کہ اپنا کام کر، جب مجوسی جانور کی گردن پر چھری چلاتا ہے، تو مسلمان بسم اللہ اللہ اکبر کہتا ہے۔ کیا ایسا ذبیحہ حلال ہو گا جس پر ایک مسلمان نے تکبیر کہی اور ایک مجوسی نے اسے ذبح کیا؟ مفتی محمود صاحب نے کہا کہ یہ ذبیحہ حرام ہو گا، حلال نہیں ہو گا، کیونکہ مسلمان یہاں ذبح کا سبب بنا ہے، اس نے تیسرے آدمی کو پکڑ کر صرف رکاوٹ کو دور کیا ہے۔ رکاوٹ

www.tezpakistan.com

دُور کرکے اس نے تکبیر کہہ دی، لیکن چونکہ وہ مکبّر خود "ذابح" نہیں، اس لیے ذبیحہ حرام ہے۔ ذابح مجوسی ہے، ذبح میں جس کے ہاتھ استعمال ہوئے ہیں۔ جس طرح مجوسی کا ہاتھ پکڑنے والا شخص مجوسی کے ذبح میں رکاوٹ تھا، اسی طرح مشین کے چلنے میں وہ بٹن رکاوٹ ہے۔ جس طرح مجوسی کو روکنے والے شخص کو ایک مسلمان آدمی پکڑ کر رکاوٹ دُور کرتا ہے، اسی طرح مشین کا بٹن آن کرکے ایک مسلمان اس رکاوٹ کو دُور کرتا ہے اور مجوسی کے ہاتھ کی طرح مشین چل پڑتی ہے۔ اگر مجوسی کا ذبیحہ حلال نہیں، تو اس مشین کا ذبیحہ بھی حلال نہیں، کیونکہ یہ دونوں ذابح ہیں، مکبّر نہیں ہیں۔ یہ جو مسلمان ان دونوں کو متحرک کرنے کے لیے متحرک ہوا ہے، اس نے سبب بن کر رکاوٹ کو دُور کیا ہے، جبکہ ذبح کے لیے اس کا ذابح ہونا ضروری تھا اور ان دونوں حالتوں میں یہ ذابح بن ہی نہیں سکتا؛ لہٰذا جس طرح اس مجوسی کا ذبیحہ حرام ہے، اسی طرح اس مشین کا ذبیحہ بھی حرام ہے۔

مفتی صاحب کی علمی و سیاسی خدمات سے پاکستان کے تمام لوگ باخبر ہیں، ان کی ناقابلِ فراموش خدمات ان کے سامنے ہیں، لیکن ان کی ایسی خدمات بھی موجود ہیں جن سے اہلِ پاکستان لاعلم ہیں۔ وہ خدمات یہ ہیں کہ مفتی صاحب جب بھی بیرونِ ملک سفر پر جاتے، وہ اپنے آپ کو پاکستان اور اہلِ پاکستان کا سفیر تصور کرتے اور بیرونی ممالک میں وہ پاکستان کے حق میں فضا ہموار کرتے، اس کے مسائل اور مشکلات سے اپنے ہمدردوں کو آگاہ کرتے۔ اس سلسلے میں ان کی بہت سی تقاریر میں سے میں صرف ایک تقریر سے اقتباس پیش کرتا ہوں جو انہوں نے چند سال قبل موتمر "مجمع البحوث الاسلامیہ" قاہرہ میں کی:

"..... اب میں محبوب کشمیر کا معاملہ پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے باشندوں میں مسلمانوں کی تعداد اسّی فیصد ہے۔ ہندوستانی حکومت نے اس خطے کو غصب کرکے اس کے باشندوں کی آزادی سلب کر لی ہے۔ مسلمان وہاں دن رات سختیوں، مصیبتوں اور خونریزی کا شکار ہیں۔ وہ ہر طرح کی مصیبتوں کو برداشت کر رہے ہیں اور ان مشرک ہندوؤں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یقیناً تم پاؤ گے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ سخت عداوت رکھنے والا ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے ہیں، یہودیوں کو اور ان لوگوں کو جو مشرک ہیں اور میں پھر کہتا ہوں جیسا کہ میں نے گزشتہ سال اسی جگہ اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہود اور ہنود وزن اور معنی دونوں کے اعتبار سے ایک ہی جیسے ہیں۔ پس جس طرح یہود کے معاملے میں مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ ان کے مقابلے میں آہنی دیوار بن جائیں، اسی طرح یہود کے معاملے میں بھی، یہ بھی مشرک ہیں، مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ان کے مقابلے میں ایک قالب بن کر کھڑے ہو جائیں۔ اور اگر آپ نے اے امتِ عربیہ! ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا اور قضیۂ کشمیر کے حل کرنے میں ہم سے الگ ہی رہے تب بھی ہم پاکستانی عوام اس کے باوجود آپ کے ساتھ تعاون کریں گے اور آپ جہاں اور جس حال میں ہوں گے، ہم صرف رضائے الٰہی کے لیے آپ کا ساتھ دیں گے۔ وہ اللہ ہی ہمارے لیے کافی ہے اور سب سے بہتر کارساز ہے۔

www.tezpakistan.com

مولانا سمیع الحق (مدیر "الحق" اکوڑہ خٹک)

وہ عالم سے بڑھ کر عارف تھے۔! رات کو تہجد اور نوافل سے انہیں کبھی غافل نہ پایا

مفتی صاحب ایک روشن دماغ رہنما، روشن ضمیر سیاست دان، بالغ نظر عالم، تجربہ کار فقیہہ، صاحبِ اجتہاد بزرگ، استقامت کے کوہِ گراں، شجاعت کے سدِ آہنی، عابد شب زندہ دار اور عارف باللہ انسان تھے۔ ان کا وجود ایک ایسا خضرِ راہ تھا جو ہر نازک دور میں قوم کو رہنمائی کا پیغام دیتا تھا، ان کی ذات ایک ایسی روشن قندیل تھی جو تاریک تر لمحات میں روشنی کا مینار ثابت ہوتی تھی۔ دینی طاقتوں کے لیے ان کی شخصیت مرکزِ ثقل کی حیثیت رکھتی تھی جہاں تمام ملکی قوتیں کھنچی ہوئی چلی آتی تھیں۔ ان کی دلآویز شخصیت دین و سیاست کا ایک حسین امتزاج تھی جسے پاکستان کے تمام علاقوں میں قومی اتحاد و یکجہتی کی علامت سمجھا جاتا تھا، ان کی ذات میں قدرت نے ایسی بے بہا صفات جمع کر دی تھیں جنہوں نے ان کو عہدِ حاضر کی تاریخ ساز شخصیت بنا دیا تھا، اس لیے اس بذرِ بہا پر چھوٹوں کے لیے کچھ کہنا بڑا مشکل ہے، مجھے ان کے ساتھ سفر و حضر میں رہنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ان کی زندگی کے نشیب و فراز، اُتار چڑھاؤ اور مزاج کے اولتے بدلتے انداز دیکھے ہیں، ان کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کے بعد چند نمایاں خصوصیات سامنے آتی تھیں۔

میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بے انتہا بہادر انسان تھے، انتخابی معرکوں میں کم نظر و کم سواد مخالفین ہر قسم کے حملے کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ میں نے انتہائی نازک مواقع پر بھی انہیں غصے سے بے قابو ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ تحمل و بردباری اور صبر و شکر کی ایک اعلیٰ روایت کے امین تھے، اپنے بڑے سے بڑے سیاسی مخالف کا نام بھی ہمیشہ احترام سے لیتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ انتخابی جلسوں میں گڑبڑ کرنے کی اطلاعات ملیں۔ بعض لوگوں نے یہ اطلاع بھی فراہم کی کہ فلاں جلسے میں مفتی صاحب پر قاتلانہ حملہ ہونے والا ہے، ان میں مصدقہ اطلاعات بھی ہوتی تھیں لیکن مفتی صاحب ایسے جلسوں میں خصوصیت کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی اطلاعات سے گھبرانا خدا کی ذات پر عدمِ اعتماد کی دلیل ہے۔ اگر اس نے اسی حالت میں موت وارد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم اس کی منشاء کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے نہ کرنا درست ہے، کیونکہ راہِ حق میں آنے والی موت سے بہتر کوئی موت نہیں۔ مفتی صاحب پر سیاسی زندگی میں کم و بیش چار مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے۔ ایک بار قصور میں حملہ آور موقع پر پکڑا گیا۔ مفتی صاحب نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی معافی کا اعلان کر دیا۔

مفتی صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ عالم باعمل تھے۔ ان کے کردار میں پختگی پر ان کے مخالف بھی یقین رکھتے تھے۔ میں نے سفر میں انہیں کبھی نماز قضا کرتے نہیں دیکھا، بلکہ ہری پور جیل میں جب ہم اکٹھے تھے تو ان دنوں مفتی صاحب کو دیکھا کہ رات کو تہجد کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

www.tezpakistan.com

ان کی عبادات کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ دن کو دوستوں سے محوِ گفتگو اور رات کو خدا سے رازونیاز۔ وہ عالم ضرور تھے مگر عالم سے بڑھ کر عامل و عارف انسان تھے۔

ایک اور بات جو صرف مفتی صاحب ہی کی ذات میں نظر آئی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں پر بہت مہربان تھے۔ بڑوں سے تو بہرحال ان کے مرتبے کے مطابق معاملہ کرتے تھے، ہم نے چھوٹوں سے ملتے ہوئے بھی انہیں بڑا متواضع پایا چھوٹے سے چھوٹے کارکن پر بھی وہ اس قدر شفقت فرماتے تھے کہ اس شفقت میں احترام کی جھلک نمایاں ہو جاتی تھی۔ اس محبوب شخصیت کی سفر و حضر کی رفاقتوں اور کفش برداریوں کا مجھے طویل موقع ملا، ان کی شفقتوں اور ہماری شوخیوں کا یہ عالم تھا کہ کئی بار میں پکار اُٹھا کہ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ — لیکن ان کی طرف سے حرفِ شکایت کبھی بھی زبان پر نہیں آیا۔ ہم موجود نہیں اور مفتی صاحب تشریف لے آئے۔ اب رات گئے واپسی پر ہمیں مفتی صاحب کی آمد کا علم ہوا تو صبح کا انتظار کیے بغیر اسی وقت جا دھمکے، پھر تمام رات باتوں میں کٹ گئی، اگر کبھی خود ہی ہمیں ان کے آرام کا خیال آ گیا تو انہوں نے اپنے آرام پر ہماری دلجوئی کو ترجیح دی۔

مسلسل ان کی خدمت میں رہنے کی وجہ سے میں ان کا مزاج شناس ہو گیا تھا اس لیے مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً دیر نہیں لگی کہ مفتی صاحب اپنے ملنے والوں سے یہ بھی نہیں کہتے کہ اب وہ انہیں آرام کرنے دیں، اور پھر ملنے والے بھی ہجوم در ہجوم آتے۔ مفتی صاحب کی اجازت نہیں تھی کہ کسی کو روکا جائے۔ بعض ملنے والے تو انتہائی غیر اہم ہوتے۔ کئی صرف انہیں کو دیکھنے کے لیے آ جاتے۔ بے وقت آنے پر جب اُن سے آنے کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا، "کام تو کچھ نہیں، صرف حضرت کی زیارت کے لیے آئے ہیں"۔

اب ان صاحب کی زیارت کا شوق تو پورا ہو گیا، مگر حضرت صاحب کی جان پر بن گئی۔ دن بھر لوگوں سے ملنا، مختلف پروگراموں میں شرکت کرنا، جماعتی کارکنوں کو ہدایات دینا، اُمرائے جماعت سے تبادلۂ خیال کرنا اور اسی طرح دن گزار دینا۔ رات آتی تو ملنے والوں کا سیلاب بدستور موجود رہتا۔ ہم چاہتے کہ مفتی صاحب آرام کریں، لیکن مفتی صاحب کی ہدایت موجود تھی کہ ملنے کے لیے آنے والے کسی آدمی کی دل شکنی نہ ہو، خدا جانے بے چارہ کس مصیبت کے بعد پہنچا ہے اُسے کیا کام ہے، اُس کا دل توڑنا خدا کو ناراض کرنا ہے۔

لیکن مفتی صاحب کی اس نرم روی کے باوجود کبھی کبھی ان ہنگاموں سے ان کی طبیعت بڑی مکدر ہوتی تھی، وہ اپنے اُوپر ایک بوجھ سا محسوس کرتے تھے۔ ان کا مزاج شناس ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں ان کا معالج بن گیا۔ ایسے مواقع پر میں نے ان کی طبیعت کا تکدر دُور کرنے کے لیے علاج دریافت کر لیا۔ ہم ملک و ملت کے گمبھیر مسائل اور ملنے والوں کی عجیب و غریب باتوں کی طرف سے ان کی توجہ ہٹانے کے لیے "محفلِ زعفران" کا اہتمام کرتے۔ اس محفل میں قرونِ اولیٰ سے لے کر عہدِ حاضر تک کے بڑے بڑے ظریفوں کے حالات ہوتے، لطائف ہوتے، ظریفانہ اور علمی باتیں ہوتیں، طفیلیوں کے قصے ہوتے، درباریوں کے واقعات ہوتے، بہادروں کی داستانیں ہوتیں، بزدلوں کے چٹکلے ہوتے، ظریفوں کی تاریخی ستم ظریفیاں ہوتیں، بات سے بات نکلتی، لطیفے سے لطیفہ پیدا ہوتا، چٹکلے سے چٹکلہ نکلتا — ہنسی مذاق کی اس لہر سے ان کی سوچ کا دھارا بدل جاتا اور ہم ان کی چور چور طبیعت کے لیے اپنی باتوں سے ایک محفلِ سرور پیدا کر دیتے۔ کبھی کبھی مفتی صاحب بھی کوئی علمی لطیفہ سنا دیتے، جس میں کوئی اہم نکتہ ہوتا، کوئی خوبصورت تلمیح ہوتی، پھر یہ ظریفانہ موضوع زیرِ بحث آتا۔ اس موضوع پر گفتگو ہوتی۔ تجویز کیا جاتا کہ باقاعدہ طور پر ایک ظریفانہ پارٹی تشکیل دی جائے، پارٹی کے منشور اور دستور پر بحث ہوتی، عہدہ داروں اور کارکنوں کی نامزدگیاں ہوتیں۔ اس طرح ہم ان کے لیے دل لگی کا سامان کرتے۔ یہ بات تو درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی۔ مفتی صاحب ہمارے دور میں عہدِ رفتہ کے انسان تھے، وہ چودھویں صدی میں اس قافلۂ حریت کے آخری جرنیل تھے جسے شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہیدؒ نے ترتیب دیا جس کو حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے مضبوط و مستحکم کیا، جس کے سالاروں میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شامل تھے۔

اس جماعتِ حقہ کے تیار کردہ قافلۂ تسلیم و رضا کے علم و عمل، ایثار و استقامت، اخلاص و قربانی اور جہاد و عزیمت کی امانتیں ان کے آخری جرنیل مفتی محمود نے چودھویں صدی کے اختتام پر پندرھویں صدی کی دہلیز تک پہنچا دیں تاکہ نئی صدی میں اپنے قابلِ فخر اسلاف کے مشن پر چلنے والوں کے لیے یہ چیزیں متاعِ عمل اور سرمایۂ نجات بنی رہیں۔

www.tezpakistan.com

مولانا مفتی احمد الرحمٰن (کراچی)

سرحد کے وزیرِ اعلیٰ نے کہا:
پہلے فتویٰ دو،
پھر سفارش کروں گا!

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ کی زندگی آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ ایک ایک گوشہ ایسا تھا جو کہ سب کو متاثر کر دیتا تھا، ہم نے اپنی زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں سُنا تھا کہ آپ جامع شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف سیاسی میدان کے شہسوار، دوسری طرف تدریس کے لیے مایۂ ناز اور تیسری طرف طریقت کے بے مثل شیخ۔ یہی جامعیت ہم نے مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ میں دیکھی۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کے زمانے میں تو سیاست اتنی گندی اور جھوٹی نہ تھی جتنی کہ موجودہ دَور میں ہو گئی ہے۔ اب عام طور پر یہ تاثر ہے کہ کوئی شخص سیاست میں رہ کر شریف سچّا اور دیانت دار نہیں رہ سکتا، مگر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے ایک ایسا نمونہ چھوڑ دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی امداد شاملِ حال ہو اور انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا مددگار بنا لے تو اس راستے پر بھی وہ اپنا دامن بچا کر چل سکتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے اس گندے ماحول میں اپنے آپ کو دین پر نہ صرف قائم رکھا، بلکہ کسی بھی لمحہ تقویٰ اور پرہیز گاری کو نہیں چھوڑا۔ اس کی وضاحت ایک واقعے سے ہو جائے گی۔ حضرت مفتی صاحب صوبۂ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ ان دنوں سرحد بنک میں ایک بڑی ملازمت کی جگہ خالی ہوئی جس کے لیے غالباً اخبار میں اشتہار چھپا۔ مَیں کراچی میں تھا، ایک دوست میرے پاس آیا اور اس نے مجھے کہا کہ اس بنک کی ملازمت کے لیے آپ مفتی محمود صاحب کے پاس سفارش کے لیے چلیے۔ مَیں نے اس سے کہا کہ بجائے جانے کے مَیں پہلے مفتی صاحب سے ٹیلی فون پر بات کروں گا۔ اگر انہوں نے کہا کہ آجاؤ، تو چلا جاؤں گا، ورنہ میرا ٹیلیفون کافی ہو گا۔ بہر حال مَیں نے حضرت مفتی صاحب سے فون پر بات کی۔ انہوں نے فرمایا کہ بنکنگ کا شعبہ تو میرے پاس نہیں ہے، یہ تو غلام فاروق صاحب کے پاس ہے، مَیں اس میں زیادہ سے زیادہ سفارش کر سکتا ہوں، مگر ایک بات پہلے تم سے پوچھتا ہوں، اگر تم نے بحیثیت مفتی اثبات میں جواب دیا، تو پھر سفارش کروں گا، ورنہ نہیں۔ پھر سوال کیا کہ شرعی حکم کے مطابق کیا بنک کی نوکری جائز ہے؟ مَیں نے جواب دیا کہ آپ خود مفتی ہیں، آپ بہتر فتویٰ دے سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے کہا کہ نہیں تم فتویٰ دو۔ اگر تم نے جواز کا فتویٰ دے دیا، تو مَیں اپنے فتوے کو چھوڑ کر تمہارے فتوے پر عمل کروں گا۔ مَیں نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ اپنا فتویٰ

www.tezpakistan.com

بتائیں۔ مفتی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ میں بنک کی نوکری کو ناجائز سمجھتا ہوں اور جو چیز ناجائز ہو اس کی سفارش کو بھی جائز نہیں سمجھتا، بہر حال میں نے اس شخص کو پوری بات بتا دی۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ اس نے اس نوکری کا ارادہ ترک کر دیا۔ دیکھیے اس مرحلے پر بھی آپ نے شریعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، حالانکہ یہ ایسا مسئلہ تھا جس میں تاویل اور ہیر پھیر کی گنجائش نکل سکتی تھی، مگر آپ نے اس موقعے پر بھی تقویٰ پر عمل فرمایا۔

میں نے بارہا حضرت مفتی صاحب کی مجلسوں میں شرکت کی۔ آپ کے ساتھ سفر کی معیت بھی حاصل رہی، مگر میں نے آپ کو زندگی میں کبھی خلافِ سنت کام کرتے نہیں دیکھا۔ آپ ہمیشہ دین کا لحاظ فرماتے۔ باوجود شدید بیماری کے جماعت کی نماز ترک نہیں فرماتے تھے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ خود جماعت قائم فرماتے تھے۔ کوشش ہوتی کہ دینی معاملات میں رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کیا جائے۔ حضرت مفتی صاحب شدید بیمار تھے، ڈاکٹر عبدالصمد اور سرجن رحمٰن صاحب آپ کے معالج تھے۔ ان دونوں نے جب زیادہ بے آرامی دیکھی تو آپ کو کارڈیو ویسکولر کے شعبے میں سی سی یو میں داخل کر دیا اور آپ کے جسم پر وہ آلہ منسلک کر دیا جس سے کہ چوبیس گھنٹے آپ کے دل کی رفتار کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اس طرح حضرت مفتی صاحب کو بالکل بے قابو کر دیا۔ اب آپ نہ ہل سکتے تھے اور نہ اٹھ سکتے تھے۔ غالباً عصر یا مغرب کی نماز کا وقت ہوا، حضرت مفتی صاحب نے اپنے خدام حسن اور حسین (یہ دو طلبہ ہماری جامعہ کے طالب علم ہیں اور فرانس کی نو آبادی "ری یونین" کے رہنے والے ہیں۔ یہ کراچی میں مفتی صاحب کی خدمت میں رہتے تھے) کو کہا کہ مجھے اٹھا کر اوپر کرو۔ انہوں نے اوپر کیا، تو آپ نے اپنے ہاتھوں سے ان چیزوں کو نکال دیا اور خود وضو کرنے تشریف لے گئے۔ وضو کے بعد جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ نرسیں پریشانی میں بھاگ کر آئیں، کیونکہ ٹیلی وژن پر دھڑکنوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹروں کو مطلع کیا۔ ڈاکٹر حضرات تشریف لائے، تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے تیمم اور اشاروں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جاتی، زیادہ سے زیادہ مر ہی جاؤں گا، مگر نماز کے لیے آپ کو اپنی یہ پابندی ختم کرنا پڑے گی۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی حد سے زیادہ سادہ تھی۔ چونکہ کراچی میں آپ کا قیام ہمارے یہاں ہوا کرتا تھا، ہم نے کبھی ان کی آمد پر غیر معمولی انتظام نہ کیا، مگر کیا مجال جو آپ نے کبھی شکایت فرمائی ہو۔ جو مل گیا کھا لیا کرتے تھے۔ حالانکہ بہت لوگ پیشکش کرتے کہ ہم کھانا لے آئیں گے، مگر آپ فرماتے تھے کہ میرے میزبانوں سے پوچھو۔ ان کی سادگی اور رسومات سے پاک زندگی کے تو اتنے واقعات ہیں کہ ان کا احاطہ بھی ناممکن ہے۔ عبادات وغیرہ میں تو ریاکاری کے حد سے زیادہ مخالف تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ان چیزوں نے ہماری عبادات کو تباہ کر دیا، اس لیے زندگی بھر یہی کوشش رہی کہ حج کے لیے اپنے خرچ پر تشریف لے جائیں۔ ایک بار آپ کو زبردستی حج وفد کا ممبر بنایا گیا۔ آپ زندگی میں بارہا حج کے لیے تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے جب سعودی عرب پہنچے، تو وہاں پاکستانی حکام بھی آئے، سعودی حکام بھی اور مصر، کویت اور لیبیا کے حکام بھی کہ ان کی میزبانی قبول کر لیں۔ حضرت مفتی صاحب نے سب کو یہ جواب دیا میں حج کرنے آیا ہوں، اس لیے اپنی جگہ پر رہوں گا اور آپ نے ایک معمولی سے کرایے پر کمرہ لے لیا اور وہاں قیام فرمایا۔

آخری حج کے لیے آپ کو رابطہ کی طرف سے بھی دعوت تھی، مگر آپ نے ٹکٹ اپنے خرچ پر خریدا تھا کہ چودھویں صدی کا آخری حج فرمالیں۔ اس بارے میں فرمایا طبیعت اور ہمت اتنی نہیں کہ حج کے ارکان ادا کر سکوں، مگر اس لیے جا رہا ہوں کہ چودھویں صدی کا آخری حج ہے، شاید اسی کی برکت سے چودھویں صدی کے ہمارے تمام گناہ معاف ہو جائیں۔ حضرت مفتی صاحب کی کن کن باتوں کو یاد کریں، وہ تو سرخرو ہو کر چلے گئے، ہمیں یتیم چھوڑ گئے۔ خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو فقہ میں خاص مقام عطا فرمایا تھا۔ حضرت مولانا بنوری صاحب رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت پاکستان میں ان سے بڑا کوئی مفتی نہیں۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا تھا کہ میری نظروں سے آج تک کوئی عالم ایسا نہیں گزرا جس نے فقہ کی کتاب شامی (جو کہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد میں سات سو صفحات ہیں) کا بالاستیعاب ایک دفعہ بھی مطالعہ کیا ہو۔ مسائل کے مطابق اسی کو دیکھتے ہیں، مگر مفتی صاحب نے اس کتاب کو بالاستیعاب تین دفعہ اول سے آخر تک پڑھا ہے اور ان کو اس کتاب

www.tezpakistan.com

پر مکمل عبور حاصل ہے۔ کسی مسئلے پر آپ کے فتوے کے بعد کسی اور فتوے کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔
حضرت مفتی صاحب گھر میں ہوں یا باہر، آپ مجلس میں ہوں یا تنہا، دوست احباب میں ہوں یا دشمن کے سامنے، آپ منافقت اور غلط بیانی کے بہت زیادہ مخالف تھے۔ آپ کو جھوٹ سے شدید نفرت تھی۔ اسی وجہ سے آپ کی نجی اور پبلک زندگی دونوں یکسانیت کا نمونہ تھیں۔
گھریلو زندگی بہت سادہ تھی اور خوشگوار بھی، کیونکہ اکثر مفتی صاحب یہاں سے ٹیلی فون پر گھر بات کیا کرتے تھے۔ بچوں سے، گھر والوں سے بات کرتے، ان کی ضروریاتِ زندگی کے متعلق پوچھتے، ان کی تکالیف دریافت فرماتے، در پھر ان کی ضروریات پوری کرتے؛ بہرحال آپ نے اپنے گھر والوں کو قناعت پسندی کا سبق دیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی گھریلو زندگی بہت خوش گوار تھی۔
اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

مولانا محمد ذکریا

مخالف کی دلیل زوردار ہوتی، تو فوراً اُسے مان لیتے....

حضرت مولانا مفتی محمود سے میری سب سے پہلی ملاقات مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں ۱۹۶۱ء میں ہوئی۔ میں اس وقت مدرسہ کا ناظم دارالاقامہ بھی تھا اور کراچی کی حد تک جمعیت کا کرتا دھرتا بھی۔ اس زمانے میں اکابرین جمعیت یعنی حضرت مفتی اور حضرت مولانا عبداللہ درخواستی جب بھی کراچی تشریف لاتے، تو ان کا قیام مدرسہ مظہر الاسلام کھڈہ میں ہوتا تھا۔ ان بزرگوں کو بارہا دیکھا کہ دن بھر کی میٹنگوں اور جلسوں میں مصروف ہونے کے باوجود شب بیداری، ریاضت اور مجاہدے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے جو کہ آجکل کے سیاستدانوں میں ناپید ہے۔
وہ علم کے پہاڑ تھے اور علم ان کو مستحضر تھا۔ سیاست میں آنے کے بعد اپنا سابقہ طور طریقہ نہیں چھوڑا۔ حکمرانوں کے اشاروں اور چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اتباعِ شریعت، سیاسی بصیرت انتھک محنت سوچی سمجھی پالیسی پر استقلال اور استقامت اور بات کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا اور پھر تقریر میں ایک موضوع پر قائم رہنا اُن کی خوبیاں تھیں۔
میرے ساتھ شفقت اور مجھ پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ ایک بار پاکستان قومی اتحاد کا ایک اجلاس کراچی میں ہونا تھا، اس وقت

www.tezpakistan.com

مفتی صاحب بلوچستان کے دورے پر تھے۔ پروفیسر عبدالغفور صاحب نے فون پر مفتی صاحب سے پوچھا کہ آپ تو تشریف نہیں لا رہے آپ کی نمایندگی کون کرے گا۔ انہوں نے میرا نام لیا۔ سو مجھے ان کی نمایندگی کا شرف حاصل ہوا۔

اپنے مقصد سے ان کی لگن کا یہ عالم تھا کہ تحریک نظامِ مصطفےٰ کے دوران شدید علیل تھے۔ ڈاکٹروں نے جلسوں جلوسوں اور دورے سے بالکل منع کر دیا تھا، لیکن مفتی صاحب تھے کہ رُکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ فرماتے: موت کا دن مقرر ہے چارپائی پر مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے موت آئے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے جذبے نے انہیں قریہ، قریہ، بستی بستی گھمایا۔ لاہور میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے خود فرمایا: "جب تک اس جان میں زندگی کے آثار ہیں، اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

مفتی صاحب عوام کے دلوں پر حکومت کرتے تھے، وزیرِ اعلیٰ بھی رہے، لیکن ان کی اپنی بود و باش کا یہ عالم تھا کہ جب میں سابق مرکزی وزیر مسٹر محمد زمان خان اچکزئی کے ہمراہ ان کے گھر پنیالہ پہنچا، تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ بالکل ٹوٹا پھوٹا گھر ہے۔ مہمانوں کے کمرے میں ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی، اس پر حضرت مفتی صاحب خود بھی تشریف فرما تھے اور ہم لوگ بھی بیٹھے۔ اتنے بڑے شخص کے گھر کا جو نقشہ میں دیکھ کر آیا، اگر میں حلفیہ بیان کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کروں تو شاید پھر بھی بعض لوگ نہیں مانیں گے۔ ہاں، جو شخص خود جا کر دیکھ آئے اس کی الگ بات ہے۔

مولانا عبدالرحیم اشرف (مدیر "المنبر" فیصل آباد)

پُروقار شخصیت،
پُراعتماد گفتگو،
سُلجھا ہُوا لہجہ،
دوٹوک اور کھری باتیں ——
وہ قرونِ اُولیٰ کے مُسلمان تھے

وقت کا تو صحیح طور پر کوئی اندازہ نہیں، لیکن قیامِ پاکستان سے کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس سال بعد مفتی صاحب سے پہلی ملاقات مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں ہوئی۔ میں خود ہی ان سے ملنے گیا تھا۔ بعد از گفتگو ان کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وہ غیر معمولی انسان ہیں اور ان کی شخصیت ہمارے معروف علما سے بالکل مختلف ہے۔ پُروقار شخصیت، پُراعتماد گفتگو، علمی اور عقلی باتیں، سلجھا ہوا انداز، دوٹوک اور کھری باتیں، ٹھہر ٹھہر کر بولنے کی عادت، ہنس مکھ چہرہ اور باغ و بہار طبیعت، تمام ایسے اوصاف تھے جو دیکھنے والے کو بہر حال متاثر کرتے تھے اور مفتی صاحب کے بارے میں میرا پہلا تاثر ہی بہت خوبصورت تھا۔ ان سے مل کر، ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے گفتگو کر کے میں نے پہلی ملاقات کے دوران تین باتیں محسوس کیں:

www.tezpakistan.com

- مفتی صاحب، ذہین بالطبع ہیں اور ان کے علم میں توسّع ہے۔
- مفتی صاحب، وسیع المطالعہ اور استدلال میں زکی ہیں۔
- مخاطب کے استدلال کو سنتے، سمجھتے ہیں اور قبول کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔

اس کی وضاحت میں اس طرح کروں گا کہ کتابی اور اکتسابی علم تمام علما کے پاس ہوتا ہے، لیکن یہ علم نہ ہر وجود پر کھلتا ہے اور نہ ہر وجود میں بولتا ہے۔ مفتی صاحب کے وجود پر یہ علم کھلتا بھی تھا اور ان کی شخصیت میں علم بولتا بھی تھا۔ ان کا تعارف نام و نسب سے نہیں، بلکہ علم و کسب سے ہوتا تھا۔ اسی طرح مطالعہ اور استدلال بھی سب علما کرتے ہیں، لیکن ہر عالم کی شخصیت اس کے کثیر المطالعہ ہونے کی آئینہ دار نہیں ہوتی۔ استدلال بھی تمام اہلِ علم کرتے ہیں، مگر ان کے استدلال میں زکاوت نہیں ہوتی۔ مفتی صاحب کی شخصیت و گفتگو ان کے وسیع النظر، بالغ نظر اور کثیر المطالعہ ہونے کی آئینہ دار تھی۔ علاوہ ازیں ان کے استدلال میں زکاوت موجود تھی جس سے سامع پر علم اور صاحبِ علم دونوں کا خاطر خواہ اثر پڑتا تھا۔

ہمارے اکثر علما میں ایک قدرِ مشترک ہے کہ وہ بولتے ہیں، تو بولتے ہی چلے جاتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ سامع بھی کچھ کہنا، سننا اور سنانا چاہتا ہے۔ ان کی دلیل کے جواب میں کوئی دلیل دے، تو سننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔ اگر غیر شعوری طور پر سُن لیں اور وہ دلیل وزن دار بھی ہو، تو برافروختہ ہو جاتے ہیں، دوسرے کے استدلال کو تسلیم کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں، مگر علمائے راسخین کے یہاں معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے ہاں علمائے راسخین کا طریق تھا۔ وہ صاحبِ علم اور صاحبِ دلیل آدمی سے باتیں کر کے خوش ہوتے تھے۔ اپنی دلیل دیتے ضرور تھے، لیکن منوانے پر اصرار ہرگز نہیں کرتے تھے اور دوسرے کی دلیل وزن دار ہوتی، تو بلا تامل مان لیتے تھے — یہ تھا ان کی شخصیت کے بارے میں میرا پہلا تاثر۔

اس کے بعد ہماری کتنی باتیں اور ملاقاتیں ہوئیں، کوئی حساب ہے نہ شمار۔ کئی مختصر اور طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ میرے اسی مکان کے اس کمرے میں دو دو، تین تین اور بسا اوقات چھ چھ گھنٹے مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ ایک بات عجیب ہے ان مباحث میں اکثر ایسے مسائل آتے جن میں ہمیشہ دو بالکل مختلف نقطہ ہائے نظر ہوتے تھے، ہماری آرا میں ہمیشہ اختلاف رہا، لیکن اکثر یوں ہوا کہ ایک طویل بحث کے بعد ہم کسی ایک ہی نتیجے پر پہنچ گئے۔ مثال کے طور پر میں صرف دو واقعات پیش کرتا ہوں:

- ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بعض اسلام دوست حلقوں کو اپنی کامیابی کا یقین تھا اور اس یقین کی بنیاد پر وہ ہر قسم کی پیشگوئی کرنے کے لیے تیار تھے۔ بعض جماعتیں اپنی مکمل کامیابی کا دعویٰ تو نہیں کرتی تھیں، لیکن یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھیں کہ ان انتخابات کے نتیجے میں انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا بھی امکان ہے۔ مفتی صاحب اس دوسرے خیال کے حامل تھے۔ وہ پنجاب اور سندھ کے بارے میں تو زیادہ پُرامید نہیں تھے، لیکن دوسرے دو صوبوں میں انہیں اپنی کامیابی کے واضح امکانات نظر آتے تھے۔ مستقبل کے نقشے پر انہیں اپنی جو پوزیشن نظر آتی تھی، اس کے بارے میں میرا ابھی یہی گمان تھا، لیکن مجموعی طور پر پورے ملک میں انتخابات کے نتیجے میں جو نقشہ بنتا تھا، مجھے اس نقشے سے خوف آتا تھا۔ مجھے یقین تھا ان انتخابات کے نتیجے میں لادین عناصر اور بے خدا مخلوق کے پروردہ لوگ آگے آجائیں گے، اس لیے میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اسلام دوست جماعتیں ان انتخابات میں حصہ نہ لیں۔ اگر انتخابات میں حصہ لینا ضروری ہے، تو محض علامتی طور پر لیا جائے۔ اس سلسلے میں میری تجویز یہ تھی کہ تین مضبوط حلقوں میں تین تیسرے درجے کے سیاستدانوں کو الیکشن میں کھڑا کیا جائے اور انہیں ہر قیمت پر کامیاب کرایا جائے۔ ملک کے دیگر حلقوں میں کسی مقام پر کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں میری دوسری رائے یہ تھی کہ پہلے درجے کے قائدین میں سے کسی کو الیکشن میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔ مفتی صاحب اصولی طور پر اس رائے سے متفق تھے، لیکن سیاسی اعتبار سے ان کے نزدیک انتخابات میں حصہ لینا ہی بہتر تھا۔ وہ کہتے تھے: میں سیاسی فرار پر سیاسی موت کو ترجیح دیتا ہوں"۔ ان کی اس سوچ کا تقاضا تھا کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے۔

جب میں نے محسوس کیا کہ مفتی صاحب اپنی رائے ترک نہیں کریں گے اور انتخابات میں ضرور بالضرور حصہ لیں گے، تو اس کے بعد میری کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح دینی قوتوں کو اکٹھا کیا جائے۔ میں نے مفتی صاحب کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا، تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ ان خطوط پر میں نے ان کے ایما پر کچھ کام کیا، لیکن انتخابات کی گہما گہمی میں بہت کم لوگوں نے ہماری بات پر توجہ دی اور جنہوں نے توجہ دی، وہ عملی طور پر کچھ نہ کر سکے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں جو خطرناک ذہن ابھر کر سامنے آیا، اس سے کوئی صاحب نظر بے خبر نہیں۔

www.tezpakistan.com

دوسری مثال ۱۹۷۷ء کے انتخابات کی ہے۔ میری قطعی رائے یہ تھی کہ ان انتخابات میں سرکاری پارٹی ہر قیمت پر جیت جائے گی۔ اس مسئلے پر میری اور مفتی صاحب کی طویل گفتگو ہوئی۔ میرا کہنا تھا کہ انتخابات کے انعقاد سے قبل حکومت سے آئینی تحفظات حاصل کیے جائیں اور اسے بعض شرائط کا پابند بنایا جائے تاکہ وہ انتخابات میں من مانی نہ کر سکے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو انتخابات کے نام پر بہت بڑی دھاندلی ہوگی اور دینی قوتوں کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہوگا۔ مفتی صاحب کا کہنا تھا: "اصولی طور پر آپ کی رائے صائب ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس قسم کے آئینی و اخلاقی تحفظات کا رواج نہیں۔ ہم الیکشن سے پہلے اس بات پر زور دیں، تو ہمارے اس مطالبے کو ہمارے فرار سے تعبیر کیا جائے گا۔ اگر حکومت نے انتخابات میں بدعنوانی کا ارتکاب کیا جیسا کہ اس کے عزائم سے ظاہر ہو رہا ہے، تو ہم اسے پاکستان کی رائے عامہ کا فیصلہ قبول کرنے پر مجبور کر دیں گے۔"

جب انتخابات کے بعد میرے خدشات عملی صورت میں سامنے آ گئے، تو مفتی صاحب نے اپنے قول کے مطابق حکومت کو رائے عامہ کے فیصلے کے سامنے جھکنے کی ترغیب دی، لیکن حکومت نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس نے رائے عامہ کا احترام نہیں کرنا؛ چنانچہ ادھر مطالبات نے زور پکڑا اور ادھر تشدد نے پوری قوت سے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی، پھر دو قوتوں کا ٹکراؤ ہوا، طاقت اور صداقت میں ٹھن گئی۔ جب حکومت نے مذاکرات کی بساط بچھائی، تو مفتی صاحب نے دوبارہ انتخابات کے انعقاد کے لیے وہی شرائط پیش کیں جن کا میں پہلے ہی مشورہ دے چکا تھا۔ اگر یہ شرائط دھاندلی زدہ انتخابات سے پہلے پیش کی جاتیں اور حکومت مان بھی لیتی (جس کا امکان بہت کم تھا) تو شاید انتخابات کے بعد صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔ لیکن قدرت کے بھید قدرت ہی جانتی ہے۔ کوئی اخلاقی دباؤ حکومت کو راہِ راست پر نہ لا سکا۔ آخر قدرت کی وہی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی جو تاریخ کے ایسے ہی مراحل میں متحرک ہو کر حق و باطل میں ایک خطِ امتیاز کھینچ دیتی ہے اور حق و باطل اپنی جداگانہ حیثیت میں پہچانے جاتے ہیں۔ اس واضح تقسیم کے بعد بھی جو لوگ حق کو حق سمجھتے ہوئے حق سے گریزاں رہتے اور باطل کے مددگار بنتے ہیں، قدرت انہیں ضرور سزا دیتی ہے۔ اس سزا کے وقت میں تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن قدرت کا فیصلہ نہیں بدلتا اور نہ ظالم قدرت کے انتقام سے بچ سکتے ہیں۔

مفتی صاحب سے پہلی ملاقات سے لے کر آخر دم تک میں ہمیشہ ہی ان کے قریب رہا، سوائے اس دور کے جب وہ صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ بنے۔ یہ میری عادت ہے کہ جب کوئی دوست اقتدار میں شامل ہو جاتا ہے، تو میں اس سے میل جول رکھنے میں ایک بار سا محسوس کرتا ہوں۔ سردار عبدالقیوم صاحب میرے دیرینہ دوست ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل وہ اکثر میرے پاس تشریف لاتے تھے اور میں بھی ان سے ملنے کا خواہش مند رہتا تھا، لیکن جونہی وہ آزاد کشمیر کے صدر بنے، میری ان سے ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ یہی معاملہ مفتی صاحب کے ساتھ پیش آیا۔ ان کے وزارت کے دور میں میرا ان سے ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا، اس لیے ان کے دورِ وزارت کے بارے میں میرے لیے کسی رائے کا اظہار ممکن نہیں، کیونکہ میں قریبی شاہد نہیں؛ البتہ ثقہ لوگوں سے سننے میں یہی آیا ہے کہ ان کا دورِ وزارت ایک مثالی اور زرّیں دور تھا۔

زمانۂ وزارت میں ایک بار ہمارے شہر میں ایک دوست نے انہیں چائے پر مدعو کیا، تو مجھے بھی آنے کو کہا۔ اب میرے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میں بلاوجہ جانے سے انکار کر دوں؛ چنانچہ میں اس تقریب میں گیا اور جا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ جب تقریب ختم ہوئی، تو حاضرین مفتی صاحب سے ملنے لگے۔ میں نے کوشش کی کہ اٹھ کر چلا جاؤں، لیکن یہ بات بھی مروّت کے خلاف تھی؛ چنانچہ میں بھی مصافحہ کرنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ جب مفتی صاحب کے قریب پہنچا، تو ایک دوست نے مفتی صاحب سے میرا تعارف کرانے کی کوشش کی جس پر مفتی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا: "ہاں بھئی! ہم تو ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہیں۔" پھر مجھ سے ہنس کر کہنے لگے: "حکیم صاحب! آپ اپنے اصولوں میں خاصے متشدد ہیں۔" ان کا اشارہ میری طبیعت کے اسی پہلو کی طرف تھا۔ ان کے زمانۂ وزارت میں میری اور ان کی چند لمحوں کی یہی ایک ملاقات تھی۔

بھٹو حکومت کے خاتمے اور موجودہ حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد "کالعدم قومی اتحاد" کے ارکان کی وزارتوں میں شمولیت سے پہلے مفتی صاحب سے ایک بار پھر طویل ملاقاتوں کا دور شروع ہوا۔ مفتی صاحب مجھ سے کہا کرتے تھے: "مولانا! اس بار ہم آپ کے مشورے پر ضرور عمل کریں گے۔" اس موقع پر بھی میں نے انہیں اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ میری رائے یہ تھی کہ قومی اتحاد کے رہنما حکومت میں شامل ہو کر ملک کی تباہ حال معیشت کو سہارا دیں۔ میرے خیال میں ایسے نازک وقت میں قومی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ان کی ذمہ داری تھی، لیکن مفتی صاحب کو اس رائے کے قبول کرنے میں تامل

www.tezpakistan.com

تھا۔ وہ اس اقدام کے لیے نیک نیتی، خلوص اور ملکی محبت کے تقاضوں کو تو تسلیم کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس اقدام کے لیے کوئی سیاسی اور آئینی جواز ہونا چاہیے؛ تاہم انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی کہ دوسرے فریق کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کروں اور یہ معلوم کروں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اسے ہماری خدمات کی کس حد تک اور کتنی دیر کے لیے ضرورت ہے؟ یہ ایک بڑی اہم اور نازک ذمہ داری تھی۔ اس سلسلے میں وہ مصطفیٰ صادق صاحب کی صلاحیتوں پر بھی اعتماد کرتے تھے؛ تاہم اس وقت یہ ذمہ داری انہوں نے رازداری کے ساتھ میرے سپرد کر دی۔ اسلام آباد میں ان کا اجلاس جاری تھا اور مجھے اپنی معلومات کی روشنی میں اسی اجلاس میں انہیں اپنی رائے سے آگاہ کرنا تھا۔

مَیں نے اپنے طور پر دوسرے نہاں خانے میں جھانکا، تو اپنی پہلی رائے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ اب میرا خیال یہ تھا کہ مفتی صاحب اور دوسرے اوّل درجے کے زعما حکومت میں شامل نہ ہوں، لیکن دوسرے درجے کے رہنماؤں کی وزارتوں میں شمولیت مفید نہیں، تو مضر بھی نہیں۔ جب مَیں مفتی صاحب کو دوسرے روز اپنی معلومات اور رائے سے آگاہ کرنے گیا، تو وہ فرمانے لگے: "مَیں بھی رات بھر غور و فکر کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ دوسرے رفقا بھی اس پر راضی ہو جائیں۔" یہ بات مَیں نے اس ضمن میں سنائی ہے کہ بہت سے مسائل میں اختلافِ رائے کے باوجود ہم ایک ہی نتیجے پر پہنچتے تھے۔

اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ مفتی صاحب کو مَیں نے ہر حال اور ہر رنگ میں دیکھا اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مَیں نے انہیں ہر موقع اور ہر مقام پر اسلام کا سچا نمائندہ، مخلص جاں نثار اور نڈر سپاہی پایا ہے۔ ان کی زندگی اسلام کے لیے وقف تھی اور وہ قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کی اعلیٰ روایات کے حامل اور امین تھے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر

انہوں نے سیاست کو ہمیشہ علم کے تحت رکھا اور مسجد سے دُور نہیں ہونے دیا

مفتی صاحب بلاشبہہ اپنے دَور کے بلند پایہ عالمِ دین، باثر سیاست دان، ہر دلعزیز رہنما اور قابلِ احترام بزرگ تھے۔ ان سے میری پہلی مُلاقات ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے ہنگامہ آرا دَور میں ہُوئی۔ مَیں تعلیم سے فراغت کے بعد تازہ تازہ قومی سیاست کے میدان میں آیا تھا اور کسی جماعت سے منسلک نہ تھا لیکن تقریر کے لیے اکثر قومی سٹیج پر مختلف جماعتوں اور تنظیموں کی طرف سے مجھے بھی اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی تھی۔ کالعدم جماعتِ اسلامی کے کئی اہم جلسوں میں مَیں نے تقاریر کیں۔ اکثر جلسوں میں مَیں اور آغا شورش کاشمیری مرحوم اکٹھے شریک ہوتے تھے، اس میدان کے پُرانے اور بڑے کھلاڑیوں میں سے وہی میرے ذاتی دوست تھے۔

www.tezpakistan.com

وہ میری بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مجھے اپنی تقریر کے بارے میں کبھی کوئی زعم یا گھمنڈ نہیں رہا، لیکن دوست کہتے تھے کہ ان جلسوں میں میرے سننے والوں کی بھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ بہرحال ان ہنگامہ آرا تقاریر کے حوالے سے کئی لوگوں نے مجھے جماعتِ اسلامی کا نمائندہ سمجھ لیا۔ انہی میں مفتی صاحب کی جماعت کے بھی کچھ افراد شامل تھے۔ ان کے اور آغا صاحب مرحوم کے درمیان ان دنوں ایک کھچاؤ پیدا ہو چکا تھا اور میں ہر وقت آغا صاحب کے ہمراہ قومی جلسوں میں شریک ہوتا تھا، لہٰذا مفتی صاحب کی جماعت کے ہفتہ وار آرگن نے مجھے جماعتِ اسلامی کے تنخواہ یافتہ کھاتے میں ڈال دیا۔ خود آغا صاحب کے بارے میں اس قسم کی افواہیں اڑائی گئیں۔ اگر یہ بات زبانی پروپیگنڈے کی حد تک رہتی تو میں اس کا کوئی نوٹس نہ لیتا، لیکن جب بات ان کے سیاسی ترجمان میں چھپی تو جواباً میں نے بھی "الاعتصام" میں ان کی بے خبری کے بارے میں اپنے محسوسات پیش کیے۔ مفتی صاحب کی جماعت کے اس جریدے کے مدیر ڈاکٹر احمد حسین کمال اور سرپرست مولانا غلام غوث ہزاروی تھے۔ اسی پرچے میں یہ الزام عاید کیا گیا کہ احسان الٰہی ظہیر جماعتِ اسلامی کا پروردہ ہے اور جماعت کے ناظمِ مالیات سے اپنی خدمات کے عوض باقاعدہ تنخواہ وصول کرتا ہے۔

میرا نہ تو جماعتِ اسلامی سے ایسا تعلق تھا اور نہ ناظمِ مالیات کو جانتا تھا۔ میں تو اس کی شکل اور نام سے بھی ناآشنا تھا۔ میں نے "الاعتصام" میں چیلنج کیا کہ اس الزام کے سلسلے میں شاہی مسجد میں آکر میں مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں، الزام لگانے والے صاحبان بھی مباہلہ کے لیے آجائیں۔ — نہ تو کوئی مباہلہ کے لیے آیا، نہ چیلنج قبول کیا اور نہ اس کا کوئی جواب دیا گیا۔ انہی دنوں مولانا عبداللہ درخواستی، مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی تینوں حضرات لاہور آئے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں ان سے براہِ راست بات کرنے کے لیے سیدھا ان کے دفتر جا پہنچا۔ میں نے دفتر کے باہر ٹھہر کر انہیں اپنی آمد سے مطلع کیا۔ مولانا محمد اکرم صاحب مرحوم باہر آئے اور مجھے ساتھ لے کر اندر چلے گئے۔ میرا وہاں جانا وہاں موجود لوگوں کے لیے ایک دھماکہ تھا۔ ان میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ میں نے جا کر مفتی محمود اور مولانا عبداللہ درخواستی سے دو مسئلوں پر گفتگو کی۔ ایک یہ کہ ان کے پرچے میں میرے خلاف جو بے بنیاد الزام عاید کیے گئے ہیں ان کا کوئی ثبوت نہیں اور بغیر کسی ثبوت کے میرے بارے میں ایسی باتوں کی اشاعت ان کے جریدے یا خود ان کی ذات کے لیے کسی عزت کا سبب نہیں بن سکتی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اخوان المسلمین کے بارے میں ان کے جریدے میں جو کچھ چھپتا ہے وہ حالات وواقعات سے بے خبری کے نتیجے میں چھپ رہا ہے، اصل حالات اس کے بالکل برعکس ہیں۔

پہلی بات سن کر مفتی صاحب نے اظہارِ افسوس کیا۔ انہوں نے ایڈیٹر کو تنبیہہ کی کہ وہ اس قسم کی باتیں چھاپنے سے احتراز کریں۔ مولانا درخواستی نے بھی دکھ کا اظہار کیا۔ مولانا ہزاروی نے کہا کہ یہ سب کچھ ان کی عدم موجودگی میں ہوا ہے، البتہ دوسری کسی بات کو انہوں نے تسلیم نہ کیا۔ وہ کہتے تھے، اخوان کے بارے میں ہماری معلومات درست ہیں۔ بہرحال نہ میں انہیں قائل کر سکا، نہ وہ مجھے۔

یہ مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی اور واقعہ یہ ہے کہ میں اس پہلی ملاقات ہی میں ان کے بارے میں ایک اچھا تاثر وہاں سے لے کر آیا اور یہ ان کے وصال تک قائم رہا۔ ان کی جو عظمت پہلے روز محسوس ہوئی آخر دم تک اس میں کمی نہیں آئی۔ اس دوران اختلافات بھی ہوئے، لیکن سیاسی اور دوسرے تمام فروعی اختلافات کے باوجود ان کی علمی برتری اور عظمت میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔

وہ فی الواقع علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس پر "علماء" کا لفظ بجا اور صادق آتا تھا۔ آج جبکہ "علماء" بڑھ گئے ہیں، علم گھٹ گیا ہے، لیکن مفتی صاحب سے تعلق رکھنے والا، ان کی صحبت میں بیٹھنے والا اور ان سے ملنے جلنے والا ہر شخص ان سے اختلاف رکھنے کے باوجود یہ نہیں کہہ سکتا کہ علم دین میں کسی دوسرے سے ہیٹے اور کمتر تھے، بلکہ بعض باتوں میں انہیں اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل تھی اور ان کے "رسوخ العلم" ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گزرا، سیاست میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود انہوں نے علم کے کوچے سے مکمل طور پر قطع تعلق نہیں کیا، بلکہ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ گاہے بگاہے علم کی بادہ پیمائی کے لیے نکل ہی پڑتے۔ میرے دل میں مفتی صاحب کے احترام کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں نے اپنی تمام تر کوتاہیوں، خامیوں، بے بضاعتیوں، سیاست وخطابت کی مصروفیتوں اور مشغولیتوں کے باوجود طالب علمی کے دور سے اپنا رشتہ نہیں توڑا اور بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا لکھنے پڑھنے کا سامان کیے رکھا۔ اپنی ان علمی مصروفیتوں اور مطالعہ کی روشنی میں بہت کم لوگ تھے جو دل کو بھائے، مفتی صاحب ان لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں علم ومطالعہ کے جس پہلو سے بھی دیکھا، جانچا، پرکھا، کامل و مکمل پایا۔

ان سے قلبی تعلق کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پاکستان کے ان معدودے چند اہلِ علم میں سے تھے جنہیں عربی زبان وبیان پر مکمل عبور تھا اور وہ اس زبان

www.tezpakistan.com

سے نہ صرف مکمل طور پر آشنا تھے، بلکہ انہیں اس کے نشیب و فراز، طرزِ اسلوب اور اس کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ اس کے لوچ سے بھی مکمل آگاہی تھی۔ عام مجالس میں جب کبھی مفتی صاحب مجھے دیکھتے تو ضرور انگریزی دانوں اور انگریزی خوانوں کو حیران کرتے ہوئے میری طرف عربی کے دو چار فقرے لڑھکا دیتے، یا ایک آدھ شعر سنا کر خود محظوظ ہوتے اور مجھے بھی محظوظ کرتے۔ اکثر یوں ہوتا کہ مجلس کے اختتام پر اگر ان کی طبیعت شگفتہ ہوتی تو اس کے اظہار کے لیے عربی کو وسیلہ بناتے اور اہلِ مجلس کی لطف آور اور نکتہ رس باتوں پر رواں دواں عربی میں تبصرہ کرتے اور مجھ سے عربی میں جواب سن کر خوش ہوتے اور خوشی کے اظہار کے لیے کہہ دیتے خدا کا شکر ہے کبھی کبھی تو کسی کے ساتھ عربی میں گفتگو ہو ہی جاتی ہے۔ عربی کے حوالے سے بات آگے بڑھتی تو کئی دینی اور فقہی مسائل زیرِ بحث آجاتے اور بسا اوقات وہ مجھ سے زیرِ بحث مسئلے کے فقہی پہلو پر گفتگو کرتے کرتے مسلک اہلِ حدیث کی رائے معلوم کرتے یا مسلک اہلِ حدیث کی جو رائے ان کے پیشِ نظر ہوتی اس کی توثیق کے لیے مجھ سے سوالات کرتے۔ میں نے ان امور پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں ہمیشہ وسیع المطالعہ، عمیق البصیرت اور صاحب الرائے پایا۔

مفتی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے سیاست میں ایک انتہائی بلند مقام پانے کے باوجود سیاست کو ہمیشہ علم کا ماتحت رکھا اور جانا اور علم کو سیاست سے کبھی بھی مغلوب نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی وہ ملکی سیاست اور بے راہ رویوں پر گفتگو کرتے ہوئے رنجیدہ ہو جاتے اور ایسے مواقع پر کہتے کہ اگر میں سیاست کو دین کا حصہ نہ سمجھے ہوئے ہوتا تو کبھی کا اس کوچے سے نکل کر مدرسہ میں جا بیٹھتا۔ ایک بار ملکی معاملات کی کروٹ اور سیاستدانوں کے ہاتھ سے معاملہ نکل جانے پر اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ مجھ سے ملتے ہی کہنے لگے، ہم نے بیکار اپنا وقت ضائع کیا، اس سے تو بہتر تھا کہ قال اللہ اور قال الرسول میں وقت گزارتے، لوگوں کو قرآن و حدیث پڑھاتے اور جو توانائیاں یہاں صرف ہوئی ہیں وہ ساری کی ساری وہاں صرف ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا!

اس ملک میں ایک اور منفرد اعزاز بھی مفتی صاحب کو حاصل ہے اور وہ ان کی دین اور علمِ دین سے محبت کا آئینہ دار ہے۔ وہ اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے سیاست کو مسجد سے دور نہیں ہونے دیا، بلکہ قریب لانے کا سبب بنے۔ ان کی اکثر و بیشتر میٹنگیں مساجد میں ہوتی تھیں، حتیٰ کہ بیشتر شہروں میں ان کا قیام بھی مسجد کے کسی حجرے ہی میں ہوتا تھا، اور انہی حجروں میں وہ اجلاس بلاتے، ان کی صدارت کرتے اور قوم کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے جس کے نتیجے میں رہبری و رہنمائی کے لیے قوم کی نظریں ان کی طرف اٹھتی تھیں۔

انہوں نے ایک دور میں ملک کے وسیع تر مفاد میں یہ فیصلہ کیا کہ طبقہ اہلِ سنت کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں، انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک سیاسی جماعت کی حلیف مذہبی جماعت سے دائمی اتحاد کی تجاویز اس سیاسی جماعت کے رہنما کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ انہیں اتحاد کے لیے آمادہ کریں، اور جب اس جماعت کے سربراہ نے اپنی حلیف مذہبی جماعت کے سربراہ سے بات کی تو وہ کہنے لگے، خان صاحب! آپ ان باتوں میں نہ پڑیں ان لوگوں سے ہمارا اختلاف اصولی ہے، فروعی نہیں ہے، ہم ان سے کسی صورت میں نہیں مل سکتے۔ ان کا یہ جواب سن کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی اور انہوں نے مفتی صاحب کی موجودگی میں اس بات کا مجھ سے تذکرہ کیا۔ یہ مفتی صاحب کے وسیع النظر اور وسیع الظرف ہونے کی دلیل تھی۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے ایسے مذہبی اتحاد کے لیے ایک دو بار ایسے اقدامات بھی کیے جو سیاسی طور پر ہی نہیں، جماعتی طور پر بھی ان کے لیے نقصان دہ تھے، لیکن انہوں نے وسیع تر اتحاد کے لیے اپنی جماعتی اور سیاسی پوزیشن کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی کوششوں کے جواب میں دوسری طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، بلکہ بسا اوقات ان کاوشوں کا مضحکہ اڑایا گیا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے عقائد میں پختہ نہیں تھے، وہ اپنے عقائد میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے، البتہ وہ تنگ دل یا تنگ نظر نہیں تھے، کیونکہ تنگ نظری جہالت کی پیداوار ہوتی ہے۔ ان کی غیر اہلِ سنت کے بارے میں طبع کتب پر خاصی وسیع نظر تھی، اہلِ حدیث علماء کے ساتھ وہ ہمیشہ محبت کا اظہار کرتے تھے اور بعض شخصیتوں مثلاً ——— مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد اسمٰعیل سلفی وغیرہم اکابر کا جب بھی نام لیتے تو بڑے احترام کے ساتھ ان کی علمی، دینی اور ملی خدمات کا ذکر کرتے۔

انتخابات کے مسئلے پر جب بعض حضرات نے علمائے اہلِ حدیث کے ترجمان بن کر انتخابات کو خلافِ اسلام قرار دیا تو اس موقع پر بھی حضرت مفتی صاحب نے اپنی گفتگو ان حضرات تک ہی محدود رکھی، اور کہا کہ یہ عجیب بات ہے کہ اس مسلک کے حامل افراد ایسی بے سروپا اور بے معنی بات کی حمایت کر رہے ہیں جو ان کے اکابر کی روایات کے بالکل برعکس ہے ان کی تغلیط کے طور پر جہاں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی علیہ رحمۃ اور دوسرے اکابرین اہلِ حدیث کے انتخابات میں حصہ لینے اور اس کی حمایت کرنے کے سلسلے میں ان کا ذکر کیا، وہاں اس ناچیز کا ذکر بھی کیا کہ وہ بھی اس مسئلے پر ہمارا

www.tezpakistan.com

ہمنوا اور حلیف ہے۔

مفتی صاحب کے اور میرے روابط شروع دن ہی سے اچھے چلے آئے، کبھی کسی بات پر ایسا اختلاف نہیں ہوا جو دوری یا محبت میں کمی کا سبب ہو۔ میں نے جب اپنے مکان کا افتتاح کیا تو تشریف لائے اور فرمانے لگے: علامہ صاحب! میں آپ سے بہت خوش ہوا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے تمام علماء اسی طرح کا روبار کریں اور خوشحال رہیں، یہ دنیاداروں سے پیچھے رہتے ہوئے اچھے نہیں لگتے، اس کے بعد بھی کئی بار ان کی تشریف آوری ہوئی، البتہ آخری دنوں میں وہ یہ خبر پڑھ کر مجھ سے ناراض بھی ہوئے کہ میں نے علماء بورڈ میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ اس مسئلے پر میں نے ان سے تفصیلی گفتگو کر کے انہیں مطمئن کیا۔ میں نے انہیں بتایا: اولاً تو یہ بات غلط ہے کہ میں علماء بورڈ میں شامل ہوا ہوں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ علماء کنونشن میں ہم سے مسئلہ پوچھنے کے لیے ہمیں مدعو کیا گیا تھا، جہاں سے واپسی پر میرا نام بھی بورڈ میں شامل کر لیا گیا۔ میں اس لیے خاموش رہا کہ مسئلہ بتانا ہمارا فرض ہے، جب مسئلہ بتانے کے بعد ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے بتائے ہوئے مسئلے پر عمل نہیں ہوا تو اختلاف کا مرحلہ اس کے بعد شروع ہوگا۔ فی الحال مسئلہ بتانے کی بات ہے۔ مفتی صاحب میری بات سے مطمئن تو ہو گئے، لیکن ان کا کہنا تھا کہ مسئلہ بتانے کی نیت سے بھی ان کے ساتھ شمولیت درست نہیں، آج اگر مفتی صاحب زندہ ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ میں نے اپنا کہا پورا کر دیا اور اتمام حجت کے بعد میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنا نام استعمال کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دی۔

اس سلسلے میں سب سے آخری بات یہ کہ مفتی صاحب نے گزشتہ دورِ حکومت میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جس عظیم الشان تحریک کی قیادت کی اور جس طرح انہوں نے ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کو ایک دوسرے سے ملائے رکھا، جس طرح سب کو مطمئن کیا، جس طرح مختلف لیڈروں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو اپنے تدبر اور حکمتِ عملی سے دور کیا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ اس تحریک کے حوالے سے تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کرے گی، کوئی مؤرخ انہیں نظر انداز نہیں کرے گا۔

مستقبل میں جب کبھی حریتِ فکر کی بات ہوگی، جب کبھی اعلائے کلمۃ اللہ کا سبق دہرایا جائے گا، جب کبھی حق و باطل میں معرکہ آرائی ہوگی، جب کبھی خیر و شر کی کشمکش ہوگی، جب کبھی روشنی و تاریکی کی جنگ ہوگی، جب کبھی سرفروش سروں کی فصل لے کر اٹھیں گے، جب کبھی شہیدوں کا تذکرہ ہوگا، جب کبھی اسیروں کی کہانی سنائی جائے گی، جب کبھی زخمیوں، معذوروں، اپاہجوں اور حق کے نام پر جسم کی قربانی دینے والوں کا ذکر ہوگا، مفتی محمود ضرور یاد آئیں گے، کیونکہ وہ ان شہیدوں، غازیوں، مجاہدوں اور سرفروشوں کے قافلہ سالار تھے، ان کی عظمت و دانائی اور ان کے علم و حلم کا تذکرہ قیامت تک زندہ رہے گا۔

www.tezpakistan.com

علامہ علی غضنفر کراروی

وہ کھڑے ہو کر ملے، اور فرمایا: مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے....

مفتی محمود صاحب سے تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران آغاز ہوا۔ "تعلقات" کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ان کے ساتھ رسمی لگاؤ نہیں تھا، دلی قُرب تھا۔ ان کے ساتھ میری قربت کا سبب ان کی وسعتِ نظری اور وسعتِ قلبی تھی۔ وہ عقائد کے اختلافات کو عقائد کی حد تک رکھتے تھے، ان اختلافات کو سیاسیات میں لانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا دل بہت بڑا تھا اور اس دل میں اختلاف کے ساتھ رواداری بھی موجود تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کے اختلافات کم ہوں اور ان کے درمیان زیادہ سے زیادہ محبت و رواداری کی فضا پیدا ہو۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران ملتان کنونشن میں ہوئی۔ اس کنونشن میں مَیں شیعہ رہنما سید مظفر علی شمسی کے ساتھ گیا تھا۔ چونکہ وہ بڑے اور پرانے لیڈر تھے، اس لیے علما کے اس کنونشن میں وہی توجہ کے مستحق تھے۔ میری طرف کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی اور نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ مفتی صاحب نے اس اجلاس میں مسلمانوں کی مختلف تنظیموں کے نمائندوں کو کئی مسائل پر اظہارِ خیال کی دعوت دے رکھی تھی۔ مختلف آرا کی روشنی میں وہ غور و فکر کے بعد ایک نتیجے پر پہنچتے اور اس کے بعد اعلان کر دیتے کہ اس مسئلے پر ہمارا متفقہ موقف یہ ہے: لہٰذا مَیں اسی موقف کو اسمبلی میں پیش کروں گا۔

اسی کنونشن میں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا کہ جس فرقے کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے تحریک چل رہی ہے وہ کافر ہے یا مرتد؟ کیونکہ کفار اور مرتدین کے لیے اسلام کے احکامات الگ الگ ہیں۔ مفتی صاحب ان احکامات کو سمجھتے اور جانتے تھے، لیکن وہ چاہتے تھے کہ سب لوگوں کی رائے لی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کسی کی رائے مختلف تو نہیں۔ ان کے خیال میں یہ بھی ممکن تھا کہ اس سوال و جواب کی صورت میں ان کے موقف کے حق میں یا خلاف کوئی اہم بات معلوم ہو جائے، لیکن طویل سوال و جواب کے بعد بھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان جوابات سے مطمئن نہیں ہیں۔ جوابات کا لبِ لباب یہ تھا کہ مرتد کو اسلام واجب القتل قرار دیتا ہے، لیکن کافر کو اسلامی ریاست میں ذمّی کے طور پر عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی اجازت ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ جو لوگ اسلام ترک کر کے ایک دوسرے نئے مذہب کے پیرو کار بنے، ایک سچے نبی کی نبوت کو چھوڑ کر ایک جھوٹے نبی کی جھوٹی نبوت کو قبول کر لیا، وہ تو یقیناً مرتد ہیں، لیکن ان مرتدین کے ہاں جو اولاد پیدا ہوئی، اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آیا مرتدین کے گھر پیدا ہونے والے بچے بھی مرتد ہوں گے یا کافر؟ زیادہ تر جوابات یہی تھے کہ وہ کافر ہیں۔ انہیں اسلامی ریاست میں ذمّیوں کے سے حقوق حاصل

www.tezpakistan.com

ہوں گے [illegible] صاحب
نے علما سے کہا کہ میں آج ہی آپ کی رائے لینا چاہتا تھا، لیکن آپ کو قبل از وقت ایجنڈے کا علم نہیں تھا، اس لیے آپ اس مسئلے پر کسی دوسری میٹنگ میں فیصلہ کن رائے دینے کے لیے فقہی کتب کا مطالعہ کر کے آئیں۔ میٹنگ ختم ہونے سے پہلے مفتی صاحب نے سید مظفر علی شمسی صاحب کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا: ارے ہاں شمسی صاحب! آپ نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ آپ بھی اس مسئلے پر فقہ جعفریہ کی روشنی میں اظہار خیال کیجیے۔ شمسی صاحب نے کہا: یہ تمام علما میرے قائدین ہیں۔ دین کے بارے میں ان کی رائے مجھ سے زیادہ بہتر ہے۔ میں علما کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور ان بڑے بڑے علما کی موجودگی میں اپنی کوئی الگ رائے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ ویسے جہاں تک مرتدین کے لیے فقہی احکامات کا تعلق ہے، فقہ حنفی اور فقہ جعفری کے احکامات تقریباً ایک سے ہیں۔ ان احکامات میں کوئی خاص اختلاف نہیں: تاہم اس بارے میں مولانا گردیزی جو میرے ہمراہ ہیں، کچھ کہہ سکیں گے۔ اگر اجازت ہو، تو میں ان سے کہوں کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کریں!

مفتی صاحب نے فرمایا: ہاں، ہاں، کیوں نہیں! میں نے ان کی اجازت کے بعد عرض کیا: "سوال یہ نہیں ہے کہ زیر بحث فرقہ کافر ہے یا مرتد؟ اصل سوال یہ ہے کہ اس کے لیے اسلامی شریعت میں احکامات کیا ہیں۔ وہ جو کچھ ہے اپنے عمل کی روشنی میں نظر آ رہا ہے۔ اگر اس کے کفر و ارتداد میں شک ہوتا، تو ملتِ اسلامیہ اس کے خلاف تحریک کیوں چلاتی؟ اس مسئلے کو طے کرنے کے لیے ہم اگر اقسامِ کفر اور اقسامِ ارتداد کو سامنے رکھیں تو کام آسان ہو جاتا ہے۔ اگر سوال ان کے کفر سے متعلق ہے تو کافر کی دو قسمیں ہیں۔ مرتدِ ملی اور مرتدِ فطری۔ ان کے لیے بھی احکامات جدا جدا ہیں۔ اگر مرتد ملی یا فطری حربی بھی ہو، تو اس کے لیے احکامات بالکل الگ ہوں گے" ——— میں ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ مفتی صاحب کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا: جو میں چاہتا تھا وہ انہوں نے کہہ دیا ہے۔ میرا اپنا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زیر بحث لوگ اسی آخری قسم کے مرتد ہیں۔ جو لوگ براہِ راست گمراہی کا شکار ہوئے، وہ مرتدِ ملی ہیں اور جو ان مرتدین کی اولاد ہونے کے باعث اس ارتداد کو اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ مرتدِ فطری ہیں اور چونکہ یہ دونوں جہاد کے منکر ہونے کے باوجود عملاً حربی بھی ہیں، اس لیے ان کے لیے احکامات سخت ہیں۔ ان لوگوں کو مرتد اور ان کی اولاد کو کافر سمجھنا خود ان کا نقطۂ نظر ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ انہیں اسلامی ریاستوں میں ذمیوں کے حقوق مل سکیں۔ درحقیقت وہ ان حقوق کے مستحق نہیں، بلکہ اپنے عقائد و اعمال کی رُو سے اس سزا کے مستحق ہیں جو مرتد کے لیے اسلام نے تجویز کی ہے۔ مرتد خواہ براہِ راست مرتد بنا ہو، یا مرتد کے رشتے کے حوالے سے، وہ ہر صورت میں مرتد ہے اور اس کی سزا وہی ہے جو اسلام نے مقرر کی ہے ——— مفتی صاحب نے بات ختم کر کے انتہائی شفقت کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور مجلس کے اختتام تک اپنے پاس بٹھائے رکھا۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ شروع ہو چکی تھی اور ہم نے ابھی تک اس میں اجتماعی طور پر شمولیت کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ جب دوسرے دوستوں کو میں نے اس پر آمادہ کر کے تحریک میں شامل ہونے کا باقاعدہ فیصلہ کر لیا، تو میں کراچی جا کر مفتی صاحب سے ملا۔ مفتی صاحب کھڑے ہو کر ملے، فرمانے لگے: میں اب تک انتظار کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔ میں نے کہا: میں بھی اب تک آپ کی آواز کا منتظر رہا اور مجھے یقین تھا آپ ہمیں ضرور پکاریں گے۔ آپ نے یاد فرمایا اور میں آ گیا۔ مفتی صاحب نے پوچھا کیا آپ اکیلے آئے ہیں؟ میں نے کہا نہیں! میرے ساتھ مفتی جعفر حسین اور آغا پویا بھی ہیں، میں اپنے بڑوں کو بھی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ مفتی صاحب بہت خوش ہوئے اور میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔

www.tezpakistan.com

مولانا عبیداللہ (جامعہ اشرفیہ لاہور)

اہلِ حق
حالات کا انتظار نہیں کرتے
انہیں اپنی خواہش
کے مطابق ڈھالتے ہیں

۱۹۶۱ء سے قبل مولانا مفتی محمودؒ صاحب سے دینی محافل و تقاریب اور دعوتوں میں بارہا مُلاقات ہُوئی لیکن یہ مُلاقات علیک سلیک اور مختصر رسمی گفتگو سے آگے نہیں بڑھی۔ ۱۹۶۱ء میں میرے والدِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ مَیں اور میرے دوسرے بھائی اس صدمے سے دوچار تھے۔ ہمارے ہاں تعزیت کرنے کے لیے احباب آجا رہے تھے' اس موقع پر مفتی محمود صاحب بھی جامعہ اشرفیہ میں مجھ سے تعزیت کرنے کے لیے تشریف لائے۔ اس موقع پر اُن سے تفصیلی مُلاقات ہُوئی۔ ان کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا' وہ مفتی حسن صاحب کی وفات پر بہت مغموم اور دِل آزردہ تھے' انہوں نے مجھے صبر کی تلقین کرتے ہُوئے کہا کہ ہم جن اعتدال پسند اور حق پرست علماء کے تذکرے کتابوں میں پڑھتے تھے' زندہ لوگوں میں حضرت مفتی صاحب ہی ان کی نظیر تھے۔ آپ کو صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے کیونکہ آپ نے نہ صرف ان کی جگہ سنبھالنی ہے بلکہ ان کے عظیم مشن کو بھی آگے بڑھانا ہے۔ مفتی صاحب نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختمِ نبوت کے دوران مختلف نظریات کی حامل جماعتوں کو قریب لانے میں بہت عظیم کردار ادا کیا تھا۔ اسی طرح ۲۲ نکات مرتب کرنے کے لیے علماء کو یکجا کرنا بھی ان کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کے نقیب و علمبردار تھے' ان کے بعد ایسا کوئی بزرگ موجود نہیں جس کی آواز اتنی موثر ہو کہ تمام فرقے اکٹھے ہو کر کسی مسئلے پر اجتماعی موقف اختیار کر سکیں۔ آپ کو چاہیے کہ اُن کے مشن کو زندہ رکھنے کے لیے جدوجہد کریں۔"

مفتی صاحب نے اس پہلی مُلاقات میں مجھ سے ایسی ہی بہت سی باتیں کیں جن سے میرے دل کو تسلی ہُوئی۔ مجھے اس بالشافہ گفتگو سے اندازہ ہوگیا کہ مفتی صاحب اپنے دِل میں اتحاد المسلمین کے لیے بڑی تڑپ رکھتے ہیں اور فرقہ واریت سے انہیں طبعی نفرت ہے' چونکہ اس وقت وہ نوجوان تھے' اس لیے ایک نوجوان عالم کی زبانی اتنی سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو میرے لیے خوشی کا باعث بنی۔ نوجوان عموماً جذباتی ہوتے ہیں' ان کی سوچ بھی جذباتی ہوتی ہے' ان کے فیصلے بھی جذباتی ہوتے ہیں' مجھے اطمینان ہُوا کہ ہمارے ہم عمر علماء میں وہ ایک پختہ فکر' صائب الرائے اور زیرک انسان ہیں۔ ان کی یہی صفت میرے دِل کو زیادہ بھائی۔ اس کے بعد ہماری مُلاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان مُلاقاتوں میں علمی' سیاسی اور ملی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی مسائل بھی زیرِ بحث آتے رہے اور ان کی فقہی رائے کو مَیں نے ہمیشہ قوی پایا۔ بعض مسائل میں وہ اپنی انفرادی رائے بھی رکھتے تھے' ایسی رائے کے حق میں ان کے پاس قوی دلائل ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر فقہی مسائل پر عمل کے سلسلے میں ان کی رائے یہ تھی کہ مخصوص حالات میں ایک حنفی کے لیے جائز ہوگا کہ وہ کسی خاص مسئلے میں ائمہ اربعہ میں سے

www.tezpakistan.com

کسی کی پیروی کرلے۔ ایسا آدمی ان کے نزدیک حنفیت سے خارج نہیں ہوتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ امام محمدؒ اور امام یوسفؒ نے متعدد مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیا ہے، ان کی اپنی ترجیحات ہیں، لیکن اُن پر حنفیت سے خروج کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ اپنے اختلافات اور ترجیحات کے باوجود حنفی تھے، اسی طرح اگر کسی مسئلے میں امام صاحبؒ کا قول موجود نہ ہو، یا قول تو موجود ہو مگر سمجھ نہ آئے، یا سمجھ بھی آئے، لیکن حالات کی خاص نوعیت کے تحت اس پر عمل ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے امام کی پیروی درست ہوگی، اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ایسی مشکل صورت پیش آجائے تو صاحبین کے قول پر عمل کیا جائے۔ اگر صاحبین کے اقوال میں بھی یہی صورت پیش آئے تو امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد درپیش مسئلے میں ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے اقرب قول پر عمل کرلیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی خاص مسئلے میں خاص حالات میں خروج عن الحنفیت تو جائز ہے، لیکن مذاہب اربعہ سے خروج جائز نہیں۔ اس نقطۂ نظر میں مفتی صاحب منفرد تھے، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ایسا کرنا اُن علماء کا کام ہے، جن کی مذاہبِ اربعہ پر وسیع نظر ہے، جو کسی مسئلے کے ترجیحی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ عام آدمی کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ سُنی سُنائی باتوں پر عمل کرے، کیونکہ ایسی اجازت دینے سے اس کے عقیدے میں خلل آسکتا ہے۔ لوگ اپنی مرضی کے مطابق اِدھر اُدھر بھٹکنے کے عادی بن سکتے ہیں، جبکہ ایسی صورت صرف اسی وقت پیش آسکتی ہے جب مُلکی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں علماء کسی مشکل سے دوچار ہوجائیں، تو اس رعایت سے فائدہ اُٹھا سکیں، کیونکہ اصل چیز کسی امام کا قول نہیں، اصل چیز وہ نص ہے جس کی روشنی میں یہ قول متشکل ہُوا، یعنی منصوص چیزیں، جو ائمہ کرام کی علمی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوئیں، ائمہ اربعہ نے بے پناہ تحقیق و جستجو کے بعد قرآن و حدیث سے مسائل مستنبط کیے ہیں، اس لیے باور کیا جاسکتا ہے کہ کسی مسئلے پر اگر احناف کے ہاں کوئی دلیل یا سند نہیں مل سکتی تو دوسرے مذاہب سے اسے لینا درست ہوگا، بشرطیکہ وہ وہاں بہتر صورت میں موجود ہو۔

مفتی صاحب کے علم کے اپنے، بیگانے، دوست، دشمن بھی معترف تھے، ان کے وسیع علم سے اکثر اہلِ علم متاثر ہوتے تھے، لیکن ان کے علم کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی بھی انسان کو متاثر کرتی تھی، یہ حد سے بڑھی ہوئی سادگی بھی ان کے بیحد وسیع علم کی دلیل تھی، کیونکہ جو لوگ صاحبِ علم ہوتے ہیں انہیں ظاہری ٹیپ ٹاپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے زرق برق لباس کی آن کے بجائے اپنے علم کی شان سے پہچانے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب دینی مدرسے کے استاد سے بڑھ کر ایک صوبے کی وزارت جیسے منصب تک پہنچے، مگر ان کی اس سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا، انہوں نے اس معلمانہ سادگی کو ایوانِ حکومت میں بھی برقرار رکھا۔

علاوہ ازیں مفتی صاحب ایک بااصول انسان تھے، وہ اپنے اصولوں کو کسی حالت میں توڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجتماع کی تاریخ مقرر ہوئی تو پاکستان کے سینکڑوں علماءِ دیوبند جانے کے لیے تیار ہوگئے، اس سلسلے میں انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ انہی دنوں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب پاکستان تشریف لائے تو اُن سے کسی نے کہہ دیا کہ عبیداللہ کی ڈیوٹی لگادی جائے کہ یہ علماء کو پیش آنے والی مشکلات دُور کرائیں۔ مَیں نے عرض کیا کہ مَیں ذاتی حیثیت میں جو کچھ کرسکتا ہُوں وہ تو پہلے ہی کر رہا ہُوں، آپ کے حکم کے بعد بھی کروں گا۔ اس دوران مفتی صاحب تشریف لے آئے۔ مَیں نے اُن سے ایک مقتدر آدمی کا نام لے کر کہا کہ مَیں اور آپ اُن سے مل کر علماء کی مشکلات سے انہیں آگاہ کریں تو وہ یقیناً ہماری مدد کریں گے۔ مفتی صاحب فرمانے لگے، اس کی ضرورت نہیں، مَیں نے انہیں بتایا کہ حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کا معاہدہ ہے کہ مخصوص لوگ مخصوص مقامات پر تبادلہ میں آجاسکتے ہیں۔ ان کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ دفتر کا نچلا طبقہ لگا بندھا جواب دے دیتا ہے کہ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے، اس لیے بہتر ہوگا ان سینکڑوں علماء کے لیے ہم اس شخص سے مل لیں۔ مفتی صاحب کہنے لگے، مَیں اس آدمی کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، اس میں منافقین کے تمام خصائل موجود ہیں، بات کرتا ہے، تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو ایفا نہیں کرتا، امانت سونپی جاتی ہے تو خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ مَیں ایسے آدمی سے کیسے مل سکتا ہوں؟ مَیں نے انہیں منوانے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہُوا، فرمانے لگے: یہ اصول کی بات ہے، مَیں اصول توڑ کر اس کی نظر میں گرنا نہیں چاہتا۔ دیوبند جانا فرض ہے نہ واجب جو لوگ آسانی سے جاسکتے ہیں ضرور جائیں، جو نہیں جاسکتے ان کو لے جانے کے لیے مَیں کچھ نہیں کرسکتا۔" مفتی صاحب کی سوچ سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی آدمی کو سمجھنے میں وہ غلطی کرتے ہوں، لیکن جہاں تک ان کی حق گوئی اور اصول پرستی کا تعلق ہے، اس میں وہ فردِ فرید تھے، ہمارے درمیان مسائل پر بحث مباحثے کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، بات چیت اور اختلاف اتفاق کا یہ ایک طویل دَور ہے۔ سب سے آخری بات

www.tezpakistan.com

پچیت دینی نصاب کے بارے میں ہُوئی۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے مدارس میں قدیم فلسفہ و ہیئت کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں شامل بہت سے نظریے اب غلط ہو چکے ہیں، اس لیے اگر ان موضوعات سے غیر اہم کتابوں کو نکال کر ان کی جگہ جدید سائنس، حساب، جغرافیہ اور دوسرے عصری علوم کو شامل کر لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ مفتی صاحب اس سے متفق تھے، کیونکہ یہ ضرورت ہم خود بھی محسوس کر رہے تھے اور کسی کے کہنے پر ایسا نہیں کر رہے تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے بھی تحریک ہُوئی، تو ایک نصاب کمیٹی بنا دی گئی، جس میں علماء کے علاوہ جدید علوم کے ماہرین بھی شامل تھے۔ کمیٹی کے ان ممبران کا اصرار تھا کہ ہم ان کے نصابِ تعلیم کو منظور کر کے دینی اداروں میں وہی نصابِ تعلیم پڑھائیں اور دینی علوم کو اس کے ساتھ چلائیں، ہم اس بات پر راضی نہ تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ دینی اداروں کی سند کو ایم اے کے برابر تسلیم کیا جائے اور اس سند کے حامل کو ملازمت کے لیے وہی مراعات دی جائیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کو دی جاتی ہیں، تاہم اس نصاب کو ہم اس حیثیت میں قبول کرتے ہیں کہ ہم دینی مدارس میں حسبِ معمول درسِ نظامی پڑھائیں گے؛ البتہ سال کی چھٹیوں میں اپنے طلبہ کو تیاری کرا کر میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے امتحان بھی دلوائیں گے، ہمارے طلباء اس قدر باصلاحیت ہوتے ہیں کہ وہ دینی مدارس کی تعلیم کے ساتھ دوسرے امتحانات دے سکتے ہیں اور اس کی مثالیں بھی موجود ہیں، بہرحال ہم نے کمیٹی کو اس بات پر راضی کر لیا، لیکن جب کمیٹی راضی ہُوئی تو مفتی صاحب اڑ گئے، مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ اس طرح ہمارے طلبہ کا مطمحِ نظر دین کے بجائے دُنیا رہ جائے گا۔ فراغت کے بعد وہ تو کُرسیوں کے چکر میں پڑ جائیں گے اور دینی مدارس کو اس سے سخت نقصان پہنچے گا، اس کے علاوہ موجودہ حکومت کے بارے میں حُسنِ ظن سے کام لے لیں، لیکن آئندہ برسرِ اقتدار آنے والوں سے یہ بات بعید نہیں کہ وہ دینی مدارس میں اپنے سرکاری عمل دخل سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے ان مدارس کو نقصان پہنچائیں۔ مَیں نے مفتی صاحب سے جواباً کہا کہ ہم یہ نصاب اپنے مدارس میں نہیں پڑھائیں گے اور حکومت کا بھی کوئی عمل دخل نہیں ہوگا، ہم سرِ دست چار صوبوں میں صرف چار مدارس میں اس کا تجربہ کریں گے، اگر نتائج اچھے نکلے، تو اسے پُورے مُلک کے مدارس میں رائج کر دیا جائے گا اور اگر اس سے بُرے نتائج برآمد ہُوئے تو ہم اسے یکسر ترک کر دیں گے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہمارے طلبہ دین کے بجائے دُنیا کے پیچھے دوڑیں گے، تو یہ محض ایک امکان ہے، لیکن اس میں اتنی سی تبدیلی کر دیجیے کہ جب ہمارے مدارس کا فاضل کسی منصب پر جائے گا تو وہ نسبتاً بہتر ہوگا۔ وہ رشوت، بددیانتی، اقربا پروری کا شاید ارتکاب کرے، لیکن اس کی دینی ہیئت اسے ایک حد تک رہنے پر مجبور کرے گی، اس کا ماضی اس کے ضمیر کو زندہ رکھنے میں مدد دے گا۔ مفتی صاحب نے جب دیکھا کہ مَیں ان کے خلاف دلائل دے رہا ہُوں تو انہوں نے ایک سب کمیٹی بنا دی، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب کو بھی شامل کیا گیا۔ کسی صاحب نے میرا نام لیا، تو مفتی صاحب نے فرمایا نہیں! مولوی عبیداللہ صاحب اس کمیٹی میں شامل نہیں ہو سکتے، انہوں نے تو میری رائے کو متزلزل کر دیا ہے، اس لیے اُن سے خطرہ ہے کہ وہ سب کمیٹی کو اپنی رائے سے متاثر کر کے انہیں ہمنوا نہ بنا لیں، مَیں اور یہ الگ بیٹھیں گے، سب کمیٹی جو فیصلہ کرے گی، وہ ہمیں منظور ہوگا۔ بعد میں مفتی صاحب کہنے لگے، مولوی عبیداللہ صاحب! بات آپ کی درست ہے اور مَیں آپ کے دلائل سے متفق ہوں، لیکن اس کے باوجود مجھے اپنی رائے پر اصرار ہے، کیونکہ جس کام میں حکومتیں دلچسپی لیا کرتی ہیں، ان کی یہ دلچسپی بلاوجہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ دلچسپی ان کے مخصوص عزائم کی نشاندہی کرتی ہے۔ مَیں اس نصاب کے اس لیے خلاف ہوں کہ اس سے حکومت کوئی فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے۔ وہ دینی مدارس کی سیاسی اہمیت سے خوفزدہ ہے، وہ اس طریقے سے انہیں تباہ کرنا پسند کرے گی جو غیر محسوس ہو، بظاہر خوبصورت اور فائدہ مند ہو۔ آپ جس حُسنِ ظن سے کام لے رہے ہیں وہ بجا ہے، لیکن آپ، حکمرانوں کی سیاسی چالبازیوں سے بے خبر ہیں۔ یہ لوگ کہیں دینی مدارس کو نقصان ہی نہ پہنچا دیں، مَیں نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ کا ارشاد بجا ہے، لیکن جب ہم دیکھیں گے کہ حکومت کے عزائم خطرناک ہیں اور وہ دین کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے تو ہم اس پر ثابت کر دیں گے کہ ہم اتنے کمزور نہیں، نہ دین اتنا کمزور ہے کہ اس کو سرکاری مصلحتوں کے تابع بنا دیا جائے، کوئی بے وقوف حکومت ہی یہ سوچ سکتی ہے کہ وہ اس طرح دینی مدارس کو اور ان کے معلمین و متعلمین کو خریدنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اگر کسی کی یہ سوچ ہے، تو وہ تاریخ سے بے خبر ہے، ہمارے اکابرین نے اس محاذ پر انگریز کو شکست دی ہے، ہم اس سے شکست نہیں کھا سکتے، مفتی صاحب فرمانے لگے، ہاں میں یہی چاہتا ہُوں کہ آپ لوگ ہشیار رہیں۔ تاریخ کے حوالے سے بات آگے بڑھی تو تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان تک چلی گئی۔ فرمانے لگے، ہمارے علماء نے تاریخ کے ہر موڑ پر درست فیصلے کیے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے انگریزوں کے خلاف اس وقت عَلمِ جہاد بلند کیا، جب اس کے خلاف سوچنا بھی مشکل تھا،

www.tezpakistan.com

لیکن انہوں نے ثابت کر دیا کہ اہلِ حق حالات کا انتظار نہیں کرتے، حالات کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔

تحریکِ پاکستان کی بات آئی تو فرمانے لگے: یہ درست ہے کہ ہمارے بعض اکابر نے تحریکِ پاکستان میں حصہ نہیں لیا۔ بعض اکابر نے اپنا جو سیاسی نقطہ نظر پیش کیا وہ اس کے خلاف تھا، لیکن حضرت تھانویؒ نے قیامِ پاکستان کا فتویٰ دے کر اس کمی کو پورا کر دیا۔ ان کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ ان کا یہ فتویٰ ہم سب کا فتویٰ ہے، اس لیے کہ وہ ہم سب کے مشترکہ رہنما تھے، اگر ہمارے بعض اکابرین کے حوالے سے ہمیں تحریکِ پاکستان کا مخالف سمجھا جاتا ہے، تو اس فتوے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی تاریخی جدوجہد کے حوالے سے ہم پاکستان کے اتنے ہی چاہنے والے ہیں جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے۔

مفتی صاحب، علماء کے اس گروہ سے زیادہ متاثر تھے، جو تحریکِ پاکستان کا مخالف تھا، لیکن پاکستان کی محبت ان کا جزوِ ایمان تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی کام کے کرنے سے قبل مشورہ کرنا اور اس کام کے کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں رائے رکھنا کوئی جرم نہیں۔ اسی طرح پاکستان کے قیام کے بارے میں برصغیر میں ایک مشاورت ہو رہی تھی، اس میں بعض کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کا بننا مسلمانوں کے لیے مفید ہوگا اور بعض یہ سمجھتے تھے کہ اس کا نہ بننا مسلمانوں کے لیے بہتر ہے، لیکن جب ملک بن گیا تو وہ رائے ختم ہو گئی، کیونکہ وہ رائے بننے کے بارے میں تھی نہ کہ بنے ہوئے پاکستان کے بارے میں۔

اب جو لوگ ہم پر بہتان طرازی کرتے ہیں وہ بزعمِ خود یہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں کہ ہمارے بزرگوں کی وہ رائے بنے ہوئے پاکستان کے بارے میں تھی، حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے بزرگ، پاکستان ہی کو مسلمانوں کا آخری قلعہ سمجھتے تھے اور یہ قلعہ بھی بحمداللہ حضرت تھانویؒ کے فتوے کے مطابق بنا ہے، اس لیے اس قلعے کی حفاظت ہر مسلمان کا فرض ہے۔

دیانت داری کی بات یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب، اسلام اور پاکستان سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور اسلام و پاکستان کی حفاظت کے لیے اُن کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور

غیر ممالک کے لیے شرح چندہ

بذریعہ رجسٹرڈ ہوائی ڈاک

	سالانہ بدلِ اشتراک
① نیپال، سری لنکا، مصر، انڈونیشیا، ایران، عراق، اردن، کویت، البحرائن، سعودی عرب، شام، ترکی۔	-/۱۵۰ روپے
② ابوظبی، دوبئی، افغانستان، بحرین، شارجہ، دوحہ قطر، مسقط، برما، یمن، بنگلہ دیش۔	-/۱۵۰ روپے
③ مالدیپ، لکادیپ، بھارت۔	-/۱۶۰ روپے
④ ہالینڈ، لیبیا، کمبوچیا، لاؤس، تھائی لینڈ، ویت نام، چین، نائیجیریا، ہانگ کانگ، ملائیشیا، جاپان، سویڈن، مغربی جرمنی، انگلستان، ناروے، اٹلی، ڈنمارک اور تمام افریقی و یورپی ممالک۔	-/۱۹۰ روپے
⑤ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، امریکہ، کینیڈا۔	-/۳۰۰ روپے

مدتِ خریداری کے دوران جو خصوصی نمبر شائع ہوں گے، وہ بھی اسی رعایتی قیمت میں شامل ہوں گے اور ان کی کوئی زائد قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔

براہِ کرم بدلِ اشتراک کی رقم بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ارسال فرمائیے۔

قومی پبلشرز۔ رانا چیمبرز۔ پرانی انارکلی۔ لاہور

www.tezpakistan.com

علامہ محمد یوسف قریشی (جامعہ اشرفیہ، پشاور)

چار آنے کی دال، چند روٹیاں، اور ساتھ ہی چائے انہوں نے مزے لے لے کر ہمارے ساتھ یہ کھانا "تناول" کر لیا!

مفتی محمود صاحب سے تعلق تو بہت پرانا ہے لیکن اس تعلق میں اضافے کا سبب ایک خاص واقعہ ہے، اس سے قبل تعلق و محبت کے باوجود میں اُن سے کھلا اور نہ گھلا، ملا۔ میں سمجھتا تھا کہ مفتی صاحب بھی دوسرے رہنماؤں کی طرح "ہٹو بچو" کے ایک خاص ماحول میں رہنے والے آدمی ہیں اس لیے ان سے زیادہ قرب مناسب نہیں، لیکن اس واقعے نے ان کی ذات کے بارے میں میرے خدشات و خطرات کو باطل کر دیا اور میں مفتی صاحب سے دُور بھاگنے کے بجائے تیزی سے قریب آنے لگا۔ مسجد مہابت خان کے دروازے تو پہلے ہی اُن کے لیے کھلے تھے، اب دل کے دروازے بھی وا ہو گئے۔

ہُوا یوں کہ ایک روز میں سرحد کے بزرگ عالم دین اور مفتی مولانا عبدالقیوم کے ہمراہ مسجد قاسم علی خان میں بیٹھا تھا کہ اچانک مفتی محمود صاحب آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ تھا۔ میں نے اُٹھ کر وہ بیگ ان کے ہاتھ سے لیا اور معانقہ کیا لیکن مفتی عبدالقیوم صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

مفتی صاحب اُس وقت اتنے بڑے رہنما نہیں تھے کہ ان کے استقبال کے لیے لوگوں کا کوئی بڑا ہجوم ہوتا، لیکن اتنے چھوٹے بھی ہرگز نہ تھے کہ ان سے بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کر لینا ہی کافی ہوتا۔ میں نے مفتی قیوم صاحب کی اس سرد مہری کو محسوس تو کیا لیکن وہ مفتی محمود صاحب سے بھی بڑے عالم تھے، اس لیے فوری طور پر ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور اندر ہی اندر اس بات پر کڑھتا رہا۔ خاصی دیر گزرنے کے بعد مفتی محمود صاحب کو بھوک لگی تو انہوں نے مجھے اپنی روایتی بے تکلفی سے کہا: "علامہ صاحب! کیا بات ہے آج کچھ کھانے پینے کا پروگرام نہیں؟"

مشکل یہ تھی کہ میں نے ان کی آمد کی گھر اطلاع نہیں دی تھی کہ ان کے لیے کوئی ڈھنگ کا کھانا تیار ہوتا اور بازار لے چلنا انہیں اس لیے دشوار تھا کہ اس وقت اتفاق سے میری جیب میں صرف دو روپے تھے، ہر چند کہ زمانہ سستا تھا اور دو روپے میں انہیں کھانا کھلانا ممکن تھا، لیکن وہ کھانا ان کے معیار کا نہ ہوتا۔ میں اس خیال سے اُٹھ کر باہر جانے لگا کہ گھر سے کچھ پیسے لے آؤں لیکن مفتی صاحب نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا: "شاید آپ گھر جانا چاہتے ہیں۔ اس وقت گھر والوں کو تکلیف دینا مناسب نہیں، کھانا وانا سب کچھ یہیں آ جائے گا۔"

یہ کہہ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ غالباً کھانا خود منگوانے کے موڈ میں تھے اور یہ بات میرے لیے بڑی باعثِ شرم ہوتی۔ میں جلدی سے مسجد کے خادم کے پاس گیا اور اسے دو روپے دے کر کہا "جو ملتا ہے لے آؤ، پیسے کم ہوں تو بعد میں مجھ سے لے لینا۔" تھوڑی دیر بعد خادم دو روپے میں تین آدمیوں کا کھانا لے کر

www.tezpakistan.com

آگیا۔ دو چار آنے کی دال' ڈھیر ساری روٹیاں اور ساتھ ہی چائے۔ ہم تینوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا' لیکن مجھے شرمندگی ہو رہی تھی کہ مفتی صاحب نے کھانے کی خود فرمائش کی اور ان کو یہ فرمائشی کھانا کھلایا گیا' لیکن مفتی صاحب ان باتوں سے بے نیاز مزے لے لے کر کھاتے رہے۔

بعد میں جب مفتی صاحب کو میں نے اپنے گھر جانے کی وجہ بتائی تو وہ ہنس کر کہنے لگے: "اللہ کے بندے! میں تو روزانہ یہی کھانا کھاتا ہوں' آدمی کو وہی خوراک پسند کرنی چاہیے جو اسے روزانہ میسر ہو۔" میں نے اس واقعے سے اندازہ لگایا کہ ان کی شخصیت داستانِ حرم کی طرح سادہ اور زمزم کی طرح پاکیزہ و شفاف ہے۔

مفتی صاحب کے جانے کے بعد میں نے مفتی قیوم صاحب سے ان کی سرد مہری کا شکوہ کیا تو وہ بولے: "علامہ صاحب! مفتی محمود سیاست میں ہم سے بڑے ہیں علم میں بڑے نہیں۔ میں بوڑھا آدمی ہوں میرے لیے کسی کے استقبال کے لیے کھڑا ہونا ضروری نہیں ۔۔۔" ایک اور موقع پر جب مفتی قیوم صاحب کا یہی جواب مفتی محمود صاحب کے علم میں آیا تو وہ فرمانے لگے: "مفتی قیوم صاحب کے تمام فتوے مصدقہ ہیں لیکن یہ فتویٰ سب سے زیادہ مصدقہ ہے' وہ ہمارے بزرگ ہیں ان کا احترام ہمارے لیے واجب ہے نہ کہ ہمارا احترام ان کے لیے۔"

میں نے اس ایک واقعے سے مفتی صاحب کے بارے میں کئی باتیں معلوم کریں۔ مثال کے طور پر پہلی بات تو میں نے یہ محسوس کی کہ مفتی صاحب انتہائی سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں' ایسے لوگ غریب عوام کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کی ذاتی زندگی ٹھاٹھ باٹھ سے گزرتی ہے وہ غریب لوگوں کے مسائل سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔ دوسری بات جو میری سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ مفتی صاحب اپنے دوستوں اور عزیزوں کے درمیان بے تکلفی سے بیٹھتے' اٹھتے اور کھاتے پیتے ہیں' ان میں بڑے لوگوں والی بیماریاں نہیں ہیں' ایسے لوگ بڑے مناصب پر پہنچنے کے بعد بھی اپنے دوستوں سے میل جول برقرار رکھ سکتے ہیں کیونکہ ان کا معیارِ زندگی اہلِ اقتدار کی طرح نہیں بلکہ عام لوگوں کی طرح ہوتا ہے اور انہیں اپنے سادہ ماحول ہی میں سکون ملتا ہے۔ تیسری بات میں نے یہ محسوس کی کہ مفتی صاحب دل کے صاف ہیں' کوئی ان کی عزت کرے نہ کرے' وہ ہر ایک کی عزت کرتے ہیں اور کسی کے خلاف دل میں میل نہیں رکھتے۔

کمروں کی زیبائش میں

پردے بُنیادی اہمیت رکھتے ہیں

ہم نے پردوں اور صوفہ کورز کے لیے نئے ڈیزائن تخلیق کرائے ہیں جو اپنی بناوٹ اور رنگوں کے خوبصورت امتزاج کے سبب خاموش کمروں میں زندگی کی نئی لہر پیدا کر دیتے ہیں اور خوشی کے احساس کو دوبالا کر دیتے ہیں!!

سلائی اور تیاری میں بھی ماہرانہ صلاحیت والے کاریگروں کا انتظام ہے!!

ہمارے شوروم پر تشریف لاکر ملاحظہ فرمائیں!!

شفیق سنز

دکان ایک سو ایک
پردے ایک سے ایک

101 بوہری بازار صدر کراچی۔ فون: 515101

www.tezpakistan.com

مولانا نورالہدیٰ (کراچی)

انہوں نے سوال کرنے والے
کی طرف دیکھا، اور کہا:
افسوس، تم لوگ بتیس سال تک انگریزی نظام
کے تحت چپ رہے
اب فقہ حنفیہ اور فقہ جعفریہ پر لڑ رہے ہو....

حضرت مفتی محمود صاحب سے میری پہلی ملاقات ۶۲ء میں ہوئی جب وہ ——— گجرات ضلع مردان کے مدرسہ خیرالمدارس میں تشریف لائے تھے۔ مولانا مفتی محمود صاحب اس وقت بالکل نوجوان تھے اور آپ کی ڈاڑھی کالی تھی۔ ۷۰ء میں کراچی کے نشتر پارک کے جلسے میں تفصیلی تعارف ہوا۔ اس کے بعد ان سے گہرے روابط قائم ہو گئے۔

مولانا مفتی محمود کی علمیت، ملکی حالات پر گہری نظر، خدا پرستی اور بے لوث دینی خدمت کے جذبے نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ملک کا ہر شخص ان کی علمی قابلیت کا معترف تھا اور علمی و فقہی مسائل کے سلسلے میں ان کی رائے حتمی سمجھی جاتی تھی۔ علوم حدیث کے لیے طلبہ کا ان کی طرف بکثرت رجوع تھا۔ میری ان سے علمی مسائل پر ۷۳ء میں حرمین شریفین میں گفتگو ہوئی۔ میں اس سال حج پر گیا تھا اور مفتی صاحب بھی حج پر تشریف لے گئے تھے۔ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کی کتابوں پر میری ان سے چھ روز بحث و گفتگو ہوئی۔ مسئلہ اپنی جگہ، مگر مولانا کی علمی قابلیت، پھر ان کی شفقت اور بحث کے انداز نے مجھے بیحد متاثر کیا۔

حضرت مولانا مفتی صاحب کی ملکی حالات پر بہت زیادہ گہری نظر تھی اور اس کا اندازہ شوریٰ کے اجلاس میں اکثر و بیشتر ہوتا رہتا تھا۔ مفتی صاحب مسائل پر اظہار رائے فرماتے، کچھ ساتھی ان کی رائے سے اختلاف بھی کرتے، مگر آخر میں حضرت مفتی صاحب کی بات ہی صحیح ثابت ہوئی اور ساتھیوں کو بھی کچھ عرصہ بعد اس کو تسلیم کرنا پڑتا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نوراللہ مرقدہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کے بارے میں سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کی احکام کی پیروی انہوں نے سیاسی میدانوں میں بھی کبھی ترک نہیں کی، مگر آنکھوں سے اس پر کسی کو عمل پیرا دیکھا، تو وہ مفتی محمود صاحب تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود کبھی احکام خداوندی سے انحراف نہیں کیا، اور نہ خدا کے علاوہ کسی اور سے خوف محسوس کیا۔ بڑے بڑے اجلاسوں کے دوران آپ نے نماز باجماعت کبھی ترک نہیں کی اور اس کی تلقین وہ اپنے کارکنوں کو بھی کرتے رہے۔ انہیں نہ تو کبھی قتل کی دھمکیوں نے مرعوب کیا اور نہ کبھی جیلوں کے خوف سے وہ کلمۂ حق سے باز رہے۔ فرماتے کہ جب تک خدا تعالیٰ نے میری زندگی کے دن رکھے ہیں، کوئی مجھے مار نہیں سکتا اور جب موت کا وقت آگیا تو کوئی بچا نہیں سکتا۔ اس بنا پر میں دنیا والوں سے خوف کیونکر کھاؤں۔ اور یہی ہوا۔ جب وقت اجل آیا، ماہر ترین ڈاکٹر

www.tezpakistan.com

دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور آپ ایک سیکنڈ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے اور کوئی ان کو نہ بچا سکا۔

مولانا مفتی محمود زندگی بھر دین کی خدمت میں مصروف رہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب آپ کی فکر اور ذہن سے دینی خدمت کا جذبہ اُترا ہو۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر آرام کرتا رہوں تو اس زندگی کا کیا فائدہ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی دین کی خدمت کے لیے عطا کی ہے اور اس کا حق ہی یہی ہے کہ اس کو خدمت میں صرف کیا جائے۔ بے نوشی کا یہ عالم کہ پوری زندگی مدرسہ قاسم العلوم کی معمولی سی تنخواہ پر گزار دی، حالانکہ اگر چاہتے، تو بلڈنگیں کھڑی کر سکتے تھے۔

مولانا مفتی محمود صاحب نے زندگی بھر دین کو اہمیت دی۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح اس مُلک میں اسلامی نظام آجائے۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ میرے نزدیک پوری دُنیا کی بادشاہی سے بہتر وہ جگہ ہے، چاہے وہ چند گز کا ٹکڑا کیوں نہ ہو، جہاں پر اسلامی نظام مکمل طور پر موجود ہو۔ اس چند گز جگہ کے لیے بھی قربانی دیں گے۔ ایک بار کسی محفل میں کسی نے پوچھا کہ مُلک میں فقہ حنفی نافذ ہو یا فقہ جعفری؟۔ آپ نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا اور کہا، افسوس کی بات ہے تم لوگ بتیس سال تک انگریزی نظام کے تحت چُپ رہے — اب جب ذرا کچھ اسلامی نظام کی اُمید ہوئی ہے تو فقہ حنفیہ اور فقہ جعفریہ پر لڑائی کر رہے ہو۔ فقہ حنفی ہو یا فقہ جعفریہ کم از کم اس نظام سے تو بہتر ہو گا جو اس وقت انگریزی اور بے دینی نظام کی صورت میں یہاں رائج ہے۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے — کہ سب لوگ اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے متحد ہو جائیں۔ مولانا مفتی محمود اتحاد کے معاملے میں خاصے فراخ دِل واقع ہوئے تھے اور اس معاملے میں انہوں نے بعض دفعہ اپنے احباب کی ناراضی کی بھی پروا نہیں کی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی وغیرہ جو ان سے علیحدہ ہوئے، اس کی وجہ بھی یہی اتحاد تھا، مگر آپ نے اتحاد کے لیے انفرادی مفادات کو اکثر قربان کیا۔

مولانا مفتی محمود صاحب کو عام لوگوں نے غالباً ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے پہچانا، مگر حقیقت یہ ہے کہ مولانا مفتی محمود صاحب گوناگوں خصوصیات کی حامل ایک جامع شخصیت تھے۔ ایک طرف سیاسی میدان کے شہسوار تو دوسری طرف مذہب میں آپ ممتاز مقام پر فائز۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم کی بے بہا دولت بڑی فراوانی سے عطا کی۔ آپ شیخ طریقت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآنِ مجید کی حلاوت بھی عطا فرمائی تھی۔ آپ قرأت کی تمام روایتوں پر مکمل عبور رکھتے تھے۔

مولانا محمد اسفندیار (کراچی)

اختلاف کرنے والے نے کہا: ——

مفتی صاحب کے پاس دلیل کی وہ قوت ہے کہ — لکڑی کو چاہیں تو سونا ثابت کر دیں

حضرت مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ سے میری پہلی ملاقات مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ مارکیٹ کراچی میں ہوئی اور وہیں تعارف ہوا۔ حضرت مفتی

www.tezpakistan.com

محمود صاحب کی جماعت کا پہلا مرکز مظہر العلوم کھڈہ تھا اور یہ حضرات کراچی میں اسی جگہ قیام کرتے تھے۔ اس کے قریب میمن سوسائٹی ہے۔ وہاں مفتی صاحب کی تقریر تھی۔ یہ پہلی تقریر تھی جو میں نے سُنی۔ ایسی مدلل اور ایسی پُراثر کہ میں تقریر سنتے ہی حضرت مفتی صاحب کی علمیت اور تقویٰ کا معتقد ہوگیا اور میں نے اسی وقت ارادہ کرلیا کہ ایسے لوگ جس جماعت میں کام کر رہے ہوں، میں بھی اس میں کام کروں گا۔ مفتی صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، مگر ان کی چند باتوں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا:

(۱) جماعتی ڈسپلن کا پابند ہونا: میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے اس کی تفصیل آپ کے سامنے آجائے گی۔ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کے شیخ الحدیث، حضرت مفتی صاحب کے ہم وطن، بلکہ ہم گاؤں تھے۔ میں بھی صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوں، مگر مفتی صاحب کا ہم گاؤں نہیں۔ میرا اور ان شیخ الحدیث کا ایک مسئلے میں اختلافِ رائے ہوگیا۔ میری رائے کچھ اور تھی اور شیخ الحدیث صاحب کی رائے کچھ اور۔ معاملہ مفتی محمود صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ ان کے ساتھ علامۃ العصر شیخ الحدیث مولانا سید محمد یوسف بنوری بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، حضرت بنوری میرے بزرگ اور قابلِ احترام شخص ہیں، لیکن اگر یہ بھی اس مسئلے میں کچھ کہیں گے، تو میں جماعتی اصول وضوابط میں ان کی رائے کے خلاف عام کارکن کی صحیح رائے کو ترجیح دوں گا اور حضرت مفتی صاحب نے میری بات کو تسلیم کیا۔

(۲) علمائے کرام کو سیاست میں لاکر ان کو ایک بلند مقام تک پہنچانا: اس سے پہلے علمائے کرام مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا سیاست یا اقتدار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کے اس رویے سے عوام الناس اور خصوصاً انگریزی دان طبقہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ علمائے کرام حکومت وسیاست کے اہل نہیں۔ ان کا کام صرف نمازیں پڑھانا اور تقریریں کرنا ہے۔ ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسی کہ انگریزوں میں پادریوں اور ہندوؤں میں سادھوؤں کی کہ وہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کرائیں اور بس۔ حضرت مفتی صاحب نے علمائے کرام کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دین کی عظمت وسربلندی کے لیے اور اسلامی نظام کی راہ ہموار کرنے کے لیے میدانِ عمل میں آئیں۔

(۳) مدلل گفتگو: مفتی صاحب جو بات بھی فرماتے، مدلل۔ اور کسی بات کو تسلیم کرتے، تو وہ بھی دلائل کی بنیاد پر۔ وہ نہ اپنا حکم کسی پر ٹھونستے تھے اور نہ کسی کا حکم یا بات بغیر دلائل کے تسلیم کرتے۔ ان کے دلائل اس قدر مضبوط اور محکم ہوتے کہ بڑے سے بڑا آدمی ان دلائل کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک واقعہ سناتا ہوں۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی اور حضرت مفتی محمود ہمارے قائدین میں سے تھے۔ ان دونوں میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ میں نے ایک بار مولانا ہزاروی سے عرض کیا کہ آپ ان اختلافات کو شوریٰ میں کیوں حل نہیں کرتے۔ مفتی صاحب تو کہہ چکے ہیں کہ شوریٰ میں بیٹھ جاؤ اور جو فیصلہ ہو دونوں منظور کرلیں۔ ہزاروی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ بھائی تم نہیں جانتے، مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دلائل کی کتنی قوت دی ہے۔ وہ اگر چاہیں کہ لکڑی کو سونا ثابت کریں، تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اپنے دلائل سے لکڑی کو سونا ثابت کردیں اور کوئی ان کے دلائل کو رد نہیں کرسکے گا۔ شوریٰ میں تو سراسر ان کی جیت ہے۔ اسی ضمن میں مولانا ہزاروی کا ایک اور واقعہ عرض ہے۔ اس سے حضرت مفتی صاحب کی عظمت کا آپ کو خود احساس ہوجائے گا۔ مولانا ہزاروی نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ ایک دن بھٹو کہنے لگے: "کیا مفتی محمود بہت بڑے عالم ہیں؟" — اس وقت ہمارا اختلاف ہوچکا تھا — میں نے جواب دیا: "مولانا مفتی محمود صاحب جیّد عالمِ دین ہیں، بہت بڑے فقیہہ اور مفتی ہیں، بلند پائے کے محدث اور مفسر ہیں۔ چاروں سلسلوں میں ان کو خلافت ملی ہوئی ہے۔ قرآن مجید کی ساتوں قراتوں کے قاری ہیں۔ اس کے علاوہ بہت بڑے سیاستدان بھی ہیں۔ میرا اور ان کا اختلاف سیاسی نوعیت کا ہے۔" بھٹو یہ سن کر بڑا حیران ہوا کہ اتنی مخالفت کے باوجود اتنی تعریف۔

مولانا مفتی محمود کی پوری زندگی اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی۔ ان کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پورے پاکستان، بلکہ پورے عالمِ اسلام میں اسلام کو عملی طور پر رائج اور نافذ کردیا جائے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت اسلام اور اسلامی تعلیمات کو حاصل تھی اور وہ اس سلسلے میں کسی قسم کی سودے بازی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اپنے کارکنوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا حکم دیتے اور پھر ان سے ان پر عمل نہ کرنے کی صورت میں بازپرس بھی کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ اگر یہ مدارس اور خانقاہیں اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بنیں گی، تو ہم ان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اسلامی تعلیمات اور علوم کے فروغ کے لیے ان کی خواہش تھی کہ عصری درس گاہوں

www.tezpakistan.com

کے نصاب میں ان علوم کو بھی شامل کیا جائے تاکہ قوم کے بچے صحیح معنوں میں مسلمان بن سکیں، لیکن دینی درسگاہوں میں وہ عصری تعلیم کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دینی مدارس سے محدث، مفسر، مفتی اور خطیب پیدا ہوں اور اس کے لیے انہوں نے کوششیں بھی کیں۔ دینی مدارس کے معیار کو بلند کرنے کے لیے انہوں نے ایک بورڈ وفاق المدارس العربیہ قائم کیا تھا اور چاہتے تھے کہ ہر مدرسہ اس بورڈ میں شامل ہو جائے اس بورڈ میں اس وقت پانچ سو مدارس ہیں۔ دوسری چیز جسے وہ بہت زیادہ اہمیت دیتے، وہ شخصی آزادی تھی۔ اس پر ناروا پابندیوں اور بندشوں کے سخت خلاف تھے۔

یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مولانا مفتی محمود نے زندگی میں کسی بھی مرحلے پر غلط بیانی اور جھوٹ سے کام نہیں لیا؛ حالانکہ آجکل کی سیاست میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی سیاست دان سچ بھی بول سکتا ہے۔ اس کی بات اور فعل کسی نہ کسی مصلحت کا تابع سمجھا جاتا ہے، لیکن مفتی صاحب نے سیاسی جلسے ہوں یا عام نجی محفلیں ہمیشہ ہر جگہ سچ کو فوقیت دی اور کسی وقت بھی غلط بیانی کا سہارا نہیں لیا، بلکہ کسی کے جھوٹ بولنے پر یہ حدیث ارشاد فرماتے کہ منافق کی علامتوں میں سے ایک علامت جھوٹ بولنا ہے۔

مفتی صاحب نے اپنی خودداری پر بھی کسی مرحلے میں آنچ نہیں آنے دی۔ ایک بار ہم نے کراچی میں شریعت کانفرنس منعقد کی۔ اس پر تقریباً ۳۵ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ کچھ عرصے بعد مفتی صاحب نے ہم سے پوچھا کہ شریعت کانفرنس پر آپ لوگوں نے کتنا خرچہ کیا؟ ہم نے ان کو بتایا، تو مفتی صاحب نے فرمایا آپ لوگوں نے اتنی رقم جمع کی، مگر جب میں ائیر پورٹ گیا، تو میرے پاس بمشکل اتنے پیسے تھے کہ رکشے کا کرایہ ادا کیا جا سکے۔ وہ بھی بڑی مشکل سے پورے ہوئے۔ یہ ان کی خودداری تھی کہ اس وقت منتظمین ان کے ساتھ موجود تھے، لیکن انہوں نے نہ تو کسی سے پیسے طلب کیے اور نہ کسی کو اپنی حالتِ زار کا علم ہونے دیا ـــــ حالانکہ اگر وہ کانفرنس کے منتظمین سے کرایہ وغیرہ طلب بھی کرتے، تو اس میں کوئی قباحت نہ تھی کہ یہ ان کا حق تھا۔

مولانا تاج محمود (مدیر "لولاک" فیصل آباد)

وہ اگر
یورپ میں ہوتے، تو
قومی ہیرو کے طور پر ان کا اعتراف کیا جاتا۔
ان کے کارنامے
تعلیمی نصاب میں شامل ہوتے ....

برصغیر میں قافلۂ حریت کے جدِ امجد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تھے اور ان کے نامور سپوت شاہ عبدالقادرؒ، شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ رفیع الدینؒ کے علاوہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا سید انور شاہ

www.tezpakistan.com

کاشمیریؒ، مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد حسنؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ جیسے رخشندہ ستارے اسی خانوادۂ علم و عمل کے وارث تھے۔ مفتی محمود کی عظمت کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ قدرت نے انہیں اپنے ان عظیم رُوحانی اجداد کا قابلِ فخر جانشین بنایا تھا، لیکن قدرت نے انہیں بہت سے ذاتی اوصاف سے بھی متصف فرمایا تھا۔

مفتی صاحب ایک بہترین مدرس، بلند پایہ شیخ الحدیث، عظیم المرتبت فقیہہ، مشہورِ زمانہ مفکر، منجھے ہوئے سیاستدان، سنجیدہ خطیب اور مانے ہوئے پارلیمنٹرین اور مقرر تھے۔ مسئلہ ختم نبوت کے حوالے سے ہمارے لیے وہ جماعتی رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۵۳ء میں وہ ہمارے عظیم قائدین کے ہمراہ قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے اور پھر ۱۹۷۴ء کی مُلک گیر تحریک میں انہوں نے مُلک کے علمی، سیاسی اور پارلیمانی محاذ پر ایک منفرد کردار ادا کر کے ہمارے دِل اور اپنے عظیم اسلاف کی ارواح کو مسرور کر دیا۔ ویسے تو ان کے اور بھی بہت سے قابلِ فخر کارنامے ہیں لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے زیادہ قابلِ تحسین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس گئے گزرے دور میں علماء، طلباء اور مُلک کی تمام دینی طاقتوں کو متحد کیا اور پھر اس ملبے میں رُوح پھونک کر اسے ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔ اس عظیم کارنامے میں انہیں مولانا خان محمد جیسے درویش صفت رہنما، مولانا عبداللہ درخواستی جیسے صاحبِ جذب بزرگ، مولانا عبیداللہ انور جیسے نیک شہرت مجاہد مولانا عبدالحق جیسے علم و عمل کے روشن چراغ اور دینی جذبے سے سرشار مُلک کے لاکھوں نوجوانوں کا تعاون حاصل رہا۔

لیکن اس موقع پر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مفتی صاحب ایک زندہ، بیدار اور متحرک علاقے سے اُبھر کر قومی سطح اور پھر قومی محاذ سے بین الاقوامی سطح کے رہنما بنے۔ اگر وہ پنجاب کے کسی علاقے میں پیدا ہوتے تو شاید بی ڈی ممبر بھی نہ بن پاتے اور تمام عمر دینی مدارس میں علم و عمل کے چراغ روشن کرتے رہتے مگر قومی سطح پر انہیں اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ہی نہ ملتا۔ رہنما اپنی قوم کے کردار و عمل کی بدولت آگے بڑھتے ہیں۔ جس قوم میں کردار اور عمل کا فقدان ہو وہ کسی غیر معمولی انسان کو پیدا نہیں کر سکتی۔ مفتی صاحب کے علاقے کے لوگ اس لحاظ سے قابلِ تکریم ہیں کہ انہوں نے ایک سُچا موتی قوم کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے تین بار مفتی صاحب کو قومی اسمبلی کے لیے منتخب کیا اور دو بار ان کو اس ایوان میں ذمہ داریاں نبھانے کا موقع ملا۔ قومی اسمبلی میں انہوں نے جو قابلِ فراموش کردار ادا کیا، قوم میں اسی کردار نے ان کی ذات کو ناقابلِ فراموش بنایا۔ اسی کردار و عمل کی بدولت مُلک کے ہر طبقے میں ان کے خیالات کو پذیرائی ملی۔ یہیں سے وہ ایک بہترین قائد کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اسی ایوان سے کلمۂ حق کی پاداش میں انہیں اُٹھا کر باہر پھینکا گیا۔ اسی مقام پر کھڑے ہو کر اس مردِ مجاہد نے ظلم و بربریت کا قلع قمع کرنے کا عہد کیا اور آخر کار اسی ایوان کے تقدس کی بحالی کے لیے اپنے دور کے سب سے بڑے آمر بھٹو سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس جنگ میں انہیں نہ صرف اسلام کی صداقت پر یقین رکھنے والی تمام جماعتوں بلکہ سیکولر ذہن کی تنظیموں کی بھی حمایت حاصل رہی۔ مُلک اور قوم کو جبر و بربریت سے بچانے کے لیے قوم کے مختلف طبقے، مختلف نظریات کی حامل جماعتوں کے رہنما، دینی اداروں کے سربراہ، مساجد کے آئمہ، یونیورسٹیوں کے طلباء، مارکیٹوں کے تاجر، ٹریڈ یونینوں کے نمائندے اور ملی محاذ پر کام کرنے والے متعدد اداروں کے رضاکار ان کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے۔ مُلک کی تاریخ میں اس قدر وسیع اتحاد اس سے پہلے کبھی نہیں ہُوا، اور اسی طرح قیامِ پاکستان کے بعد کسی قومی رہنما کی قیادت میں اتنے انسان اسلامی نظام کے نفاذ کی جنگ لڑنے کے لیے یکجا نہیں ہُوئے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ہمارے دور کی واحد مثال ہے کہ اس قدر متضاد نظریات کے حامل افراد کو متحد و مطمئن رکھتے ہُوئے آخر دم تک اُن سے کام لیا گیا۔ ان کی صلاحیتوں کو ایک اعلیٰ مقصد کے لیے انتہائی خوبصورت طریقے سے استعمال کیا گیا۔ اگر یہ اعزاز ہے تو یہ اعزاز مفتی محمود کو مِل چکا ہے اور حق یہ ہے کہ مفتی محمود اپنی خداداد صلاحیت و بصیرت کے لحاظ سے اس مُلک میں کم از کم اسی اعزاز کے مستحق تھے۔ اگر یورپ میں ہوتے تو قومی ہیرو کے طور پر ان کی عظمت کا اعتراف کیا جاتا، ان کے کارنامے قومی تعلیمی نصاب میں شامل کیے جاتے اور تمنا کی جاتی کہ اس نصاب کے پڑھنے والے اسی کردار کے حامل نوجوان بنیں۔

اللہ کے لیے لوگوں سے باہم تعاون کرنا اور اللہ ہی کے لیے محبت رکھنا اور اللہ ہی کے لیے بُغض رکھنا ایمان کا مضبوط ترین رشتہ ہے۔ ——— حدیثِ نبویؐ

www.tezpakistan.com

مولانا عبدالحکیم

پہلے وہ میرے دوست تھے،
پھر لیڈر بنے —
لیکن افسوس!
تاریکی میں سایہ، جسم سے
الگ ہو گیا۔

مَیں نے مفتی محمود کے ساتھ طویل عرصہ کام کیا ہے۔ ہمارا مسلک ہی ایک نہیں تھا، رُوح اور سانس بھی ایک تھی، لیکن جس طرح تاریکی میں اپنا سایہ وجود سے الگ ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک عہدِ پُرآلام میں ہمیں بھی ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑا، مگر یہ تو ایک حقیقت ہے کہ سایہ جسم سے الگ ہو، تو جسم متاثر ہوتا ہے نہ سایہ۔ بالکل اسی طرح جب ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو ایک دوسرے کو منفی انداز میں متاثر کیے بغیر الگ ہوئے۔ اس میں صرف کار اور طریق کار کا اختلاف نہیں تھا، معاصرین کی چشمک بھی شامل تھی، اپنوں کے حسد اور بیگانوں کی نظر کا بھی دخل تھا۔ لاہور ائیرپورٹ پر مفتی صاحب نے مجھے بتایا کہ کچھ لوگ میرے جمعیت میں موجود ہونے سے شاکی ہیں۔ مَیں نے عرض کی کہ اگر میرے الگ کرنے سے وہ دوست خوش ہو سکتے ہیں، تو اس سے بڑی خوشی کیا ہو گی؟ مفتی صاحب جو میرے ہاتھ میں ہاتھ دیے چل رہے تھے، انہوں نے میرے ہاتھ کو جھولا دیتے ہوئے کہا: "بُری باتیں مُنہ سے نہیں نکالنی چاہییں، ہمت اور استقامت کے بعد ہی خدا کی مدد آتی ہے"۔ لیکن اِن تمام محبتوں، قربتوں، شفقتوں اور رفاقتوں کے باوجود میرے اور ان کے تعلقات کے لیے "رفاقت" کا استعمال درست نہیں۔ یہ لفظ میرے وجود سے بلند اور ان کے مقام سے فروتر ہے۔ مَیں ان کا خادم تھا وہ میرے مخدوم، مَیں راہی تھا وہ رہنما، مَیں سپاہی تھا وہ سپہ سالار، مَیں ماتحت تھا وہ افسر، مَیں چھوٹا تھا وہ بڑے، بہت بڑے، مجھ ہی سے نہیں، اپنے تمام معاصرین سے بڑے، علم، عمل، اخلاق، اخلاص، ہر چیز میں بڑے اور ہر مقام پر بڑے۔

میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ملتان کنونشن کے موقع پر ہوئی۔ مَیں مندوب تھا اور وہ مجلس استقبالیہ کے صدر۔ مجھے سب سے پہلے جس چیز نے متاثر کیا، وہ ان کی انوکھی وضع قطع تھی۔ کُرتا لمبا، بہت ہی لمبا، سر پر بہت بڑا رومال، کُرتے کے کھُلے آستین اور خاص طرز کی بناوٹ یہ افغانی سرداروں کا سا لباس تھا جو مَیں نے پہلی بار دیکھا۔ اِس لباس میں مفتی صاحب قدیم عرب عالم نظر آتے تھے۔ ہماری رہائش قاسم باغ اور مدرسہ قاسم العلوم کے قریب ہی تھی۔ اجلاس سے پہلے اور بعد مفتی صاحب سے اس قیام گاہ پر بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں، ان کی ہر ملاقات یادگار اور ہر بات شاہکار تھی۔ لباس کے بعد مَیں ان کی عالمانہ گفتگو سے بھی بہت متاثر ہوا، لیکن اتنا ہی جتنا کسی اچھے دوست کو پانے کے بعد کوئی متاثر ہوتا ہے۔

www.tezpakistan.com

یہ اُس دَور کی بات ہے جب جماعت میں مفتی صاحب کے پاس کوئی عہدہ نہیں تھا۔ وہ ایک اچھے اور مخلص کارکن کی حیثیت میں کام کر رہے تھے، لیکن ان کی یہ حیثیت بھی کچھ قابلِ ذکر نہیں تھی۔ انہیں اپنے علاقے کے بی ڈی ممبروں نے منتخب کیا اور اس طرح وہ پہلی بار قومی اسمبلی میں گئے۔ قومی اسمبلی میں جانے کے بعد جماعت نے اُن سے غیر معمولی توقعات وابستہ نہیں کیں، کیونکہ جماعت یہ سمجھتی تھی کہ وہ اتنے تجربہ کار نہیں کہ ایوان میں کوئی قابلِ ذکر کام کر سکیں۔ جماعت کے لیے اتنی بات ہی کافی تھی کہ اس کا ایک آدمی قومی اسمبلی میں اس کی نمایندگی کر رہا ہے۔

لیکن مفتی محمود نے جب قومی اسمبلی کی عام مباحث میں حصّہ لیا، تو جماعت کے بڑے بڑے قدآور رہنما حیران و ششدر رہ گئے، صرف انہی پہ کیا منحصر ہے، قومی اسمبلی میں پرانے پارلیمنٹرین بھی ان کے دلائل سے دم بخود ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہیں حیرت تھی کہ ایک مدرسے کا مولوی اس قدر گھاگ اور تجربے کار سیاستدانوں سے کس طرح نبرد آزما ہے، لیکن ان کی تمام بحثیں ایک طرف اور قومی اسمبلی میں عائلی قوانین کے بِل پر انہوں نے جو کچھ کہا وہ ایک طرف۔ انہی علمی تقاریر نے ملک اور جماعت میں ان کی ترقی کا دروازہ کھولا۔ اِن تقریروں سے کوئی کتنا متاثر ہُوا، مجھے نہیں معلوم، لیکن خود مَیں کتنا متاثر ہوا، اُسے مَیں ہی جانتا ہُوں یا میرا خُدا۔ اِس سے پہلے وہ میرے دوست تھے، اس کے بعد میرے لیڈر بن گئے۔ پھر جماعت نے بھی انہیں لیڈر بنا دیا۔ اب جماعت موجود نہیں، مَیں موجود ہُوں، وہ میرے جب بھی لیڈر تھے، اب بھی لیڈر ہیں۔ جب وہ اسمبلی کے ممبر بنے، تو راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں کمرہ لے کر رہنے لگے۔ جب مجھے معلوم ہُوا تو مَیں انہیں اپنے یہاں لے آیا۔ مَیں نے ان کی رہائش کے لیے مسجد کے قریب ہی ایک مکان لے لیا۔ وہ ۱۹۷۵ء تک اسی مکان میں قیام پذیر ہوتے رہے۔

قومی اسمبلی میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ مذاہبِ خمسہ کی نمایندگی تھا۔ پارلیمنٹ کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عائلی قوانین کے خلاف مذاہبِ خمسہ کی آواز کو بلند کیا۔ قومی اسمبلی میں عائلی قوانین بل پر اپنی طویل تقریر میں انہوں نے مذاہبِ خمسہ کی جس خوبصورتی سے نمایندگی کی، وہ اپنی مثال آپ تھی۔ تقریر میں اٹھائے گئے سوالات نے عائلی قوانین کے ارباب بست و کشاد کو دَم بخود کر دیا۔ چند سوالات آپ بھی سُن لیں۔

غالباً ۱۹۵۶ء کی بات ہو گی کہ حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ ایک ایسی رپورٹ تیار کرے جس میں عورتوں کے وہ حقوق محفوظ ہو جائیں جو اسلام نے انہیں دیے ہیں، لیکن جن لوگوں کے ذمّے یہ کام لگایا گیا، انہیں اسلام کے بارے میں مطلوبہ علم نہیں تھا، چنانچہ جب اس نے رپورٹ تیار کر لی، تو کمیشن کے واحد عالم رُکن مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس پر اختلافی نوٹ لکھا۔ اس طرح وہ رپورٹ التوا میں پڑ گئی، لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد قائم ہونے والی فوجی حکومت نے ایک آرڈی ننس کے ذریعے اس رپورٹ کے بعض حِصّے نافذ العمل قرار دے دیے۔ مفتی صاحب کی تقریر کا موضوع یہی آرڈی ننس اور اس کی دفعات تھیں۔ مفتی صاحب نے سوال کیا: "جناب والا، اس آرڈی ننس کی پہلی دفعہ وراثت سے متعلق ہے جس میں طے کیا گیا ہے کہ کسی لڑکی یا لڑکے کا باپ سے پہلے انتقال ہو جائے، تو ان کو باپ کی اسی قدر وراثت کا حِصّے دار تصوّر کیا جائے گا جو انہیں زندہ ہونے کی صورت میں ملتی۔ پھر وراثت کا یہی حِصّہ ان کی اولاد کو منتقل کیا جا سکے گا۔

سب سے پہلی غلطی یہ ہے کہ اس دفعہ کے ذریعے اسلامی وراثت کا مفہوم ہی بدل دیا گیا ہے۔ وہ وراثت رہی ہی نہیں، از روئے لغت وارث زندہ شخص کو کہتے ہیں جو مرے ہوئے شخص کے ترکے سے حِصّہ لیتا ہے، لیکن آپ کا قانون وارث مُردہ کو قرار دیتا ہے جو انسان سے حِصّہ لینے کا مجاز ہے۔ کیا آپ دنیا کے کسی ملک کے قانون سے اس کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں؟

اس قانون کے مندرجات خلافِ اسلام ہی نہیں، خلافِ عقل بھی ہیں۔ اس میں ایک مُردہ شخص کو مفروضے کے طور پر زندہ تسلیم کیا جاتا ہے، پھر اسے وارث بنا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے دو بیٹے ہیں جنہیں آپ خالد اور بکر سمجھ لیں۔ بکر اپنے باپ زید سے پہلے فوت ہو جاتا ہے اور خالد زندہ ہے۔ اِس قانون کی رُو سے وراثت کی تقسیم کے وقت پہلے تو بکر کو زندہ تصوّر کیا جائے گا اور اسے خالد کے برابر حِصّہ ملے گا، پھر فوراً ہی اسے مردہ تصوّر کر کے اس کا تمام حِصّہ اس کی اولاد کو منتقل کر دیا جائے گا۔ اس طرح اس قانون نے جتنا حِصّہ زید کے بیٹے کو دیا، اتنا ہی زید کے پوتے کو بھی دے دیا۔ یہ قرآن و سنّت کی تقسیم کے علاوہ عقل و منطق اور قوانینِ عالم کے بھی بالکل خلاف بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت ایسا کر کے اسلام کے سوا کس دین اور پاکستان کے سوا کس ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے؟

اگر ایک شخص کو مرنے کے بعد پہلے زندہ اور پھر مُردہ تصوّر کرنا ضروری ہے اور صرف اس لیے کہ اس کی اولاد کو اس کے باپ کی وراثت

www.tezpakistan.com

کا حقدار قرار دیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ اس قانون میں صرف یتیموں سے کیوں ہمدردی ظاہر کی گئی ہے، متوفی کی بیوہ اور ماں کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے؟ اس فرضی ضابطے کو صرف اولاد ہی میں نہیں، تمام ورثا میں نافذ ہونا چاہیئے تھا۔ کیا دُنیا کے کسی بھی قانون میں اس قدر اندھیر نگری دکھائی جاسکتی ہے؟

پھر اس قانون کو بناتے وقت اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ جس طرح باپ کے مرنے سے بیٹا وارث بنتا ہے، اسی طرح بیٹے کے فوت ہونے سے باپ کو بھی وراثت منتقل ہو جاتی ہے۔ جب زید کا بیٹا بکر فوت ہو گیا، تو باپ خود بخود ہی اس کا وارث بن گیا۔ یہ کہاں کا انصاف اور کیسا انصاف ہے کہ باپ کو محروم کرنے کے لیے مرے ہوئے بیٹے کو خیالی طور پر زندہ کیا جائے، پھر اسے وراثت دی جائے، پھر اسے فرضی طور پر مار کر یہ وراثت اس کی اولاد کو منتقل کر دی جائے۔ مسلمان قرآن و سُنّت پر عمل کریں یا ان مصنفین کے خیالات اور مفروضوں پر؟

مَیں کہوں گا کہ یہ قانون غلط ہی نہیں، خلافِ عقل اور ناقابلِ عمل بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص مرجاتا ہے جس کا نام زید ہے۔ اس کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکا زید کی زندگی ہی میں مرجاتا ہے، لیکن اس لڑکے کی ایک بیٹی موجود ہے۔ یعنی ایک زید کی بیٹی اور ایک پوتی۔ اب اس قانون کی رُو سے وراثت کی تقسیم اس طرح ہو گی کہ مرے ہوئے لڑکے کو زندہ تصوّر کر کے دو حصّے دیے جائیں گے۔ ایک حصّہ لڑکی کو ملے گا جو اس کی بہن ہے، پھر لڑکے کے یہ دونوں حصّے اس کی بیٹی یعنی زید کی پوتی کو دیے جائیں گے۔ اس صورت میں مورث کی بیٹی کو تو ایک حصّہ ملا، لیکن پوتی دو حصّوں کی حقدار بن گئی۔ یہ انصاف نہیں ظلم ہے!

علاوہ ازیں قرآن کریم نے تقسیمِ وراثت کا جو اصول بتایا ہے، یہ قانون اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: "والدین اور قریبی رشتہ داروں کے مال میں مردوں کا حصّہ ہے"۔

قرآنی اصول کے مطابق پہلا حق قریب کا ہے، اس کے بعد بعید کا، ہر اقرب البعد کو محروم کر دیتا ہے، لیکن اس قانون میں اقرب کو محروم کر کے البعد کو وارث بنایا جاتا ہے جو قرآن، قانون، اخلاق اور عقل و فطرت کے خلاف ہے۔

ایک اور مثال بھی قابلِ غور ہے۔ ایک شخص کے دو لڑکے ہیں۔ ایک لڑکا تو اس کی زندگی میں مرگیا۔ اس مرے ہوئے لڑکے کی ایک لڑکی بھی ہے۔ اس موجودہ قانون کی رُو سے باپ کے مرنے کے بعد مال دو حصّوں میں تقسیم ہوگا۔ ایک حصّہ لڑکے کو ملے گا اور دوسرا اس کے بھائی کی لڑکی کو۔ اس طرح مورث کا حقیقی بیٹا اور پوتی برابر حصّوں کے مالک ہوں گے۔ اگر انصاف اسی کا نام ہے، تو پھر مجھے بتایا جائے کہ ظلم کسے کہتے ہیں؟

اس موقع پر وزیرِ صحت نے سوال کیا: "مفتی صاحب، اگر دو برابر حصّے تقسیم ہو جائیں، تو اس میں کیا حرج ہے"؟

مفتی صاحب نے جواباً کہا: "اس میں صرف یہ حرج ہے کہ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کا حکم ہے" اللہ تعالیٰ تمہیں وصیّت کرتا ہے کہ مرد کا حصّہ دو عورتوں کے برابر ہے"۔

مفتی صاحب نے اپنے دلائل کے حق میں مذاہبِ اربعہ کے علاوہ فقہ جعفریہ سے بھی حوالے پیش کیے۔ مالکی مذہب کی کتاب "جواہر الاکلیل" شافعی کی شرح "المنظومۃ الوصیۃ"، اسی طرح حنبلی اور حنفی کی متعدد کتب اور جعفری فقہ کی "الاستبصار" اور "من لایحضر الفقہ" جیسی اہم کُتب پیش کیں۔

اس طرح پہلی بار ایوانِ بالا میں مفتی صاحب نے ہر فقہ کے ماننے والوں کی نمایندگی کر کے اپنی علمی اور پارلیمانی حیثیّت کا لوہا منوایا۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے عائلی قوانین کی اس دفعہ کی مخالفت کی جس میں پوتے کو زبردستی وارث بنایا گیا تھا، بلکہ پوتے کی وراثت کی جائز صورت بھی پیش کر کے ان لوگوں کی زبان بند کر دی جو یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے کہ اسلام پوتے کو وراثت نہیں دیتا۔"

www.tezpakistan.com

مولانا گلزار احمد مظاہری

انہوں نے دین و سیاست

درس و تدریس کو ایک ساتھ چلایا

ان کے کارکن بھی ان پر دباؤ ڈال کر کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں کرا سکتے تھے!

مفتی صاحب سے میرے روابط کا دور زیادہ طویل نہیں، لیکن یہ مختصر دور ان کی شخصیت کی طرح خوبصورت ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اُن سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی، جب ہم نے علماء کے درمیان موجود اختلافات کو کم کرنے اور ان کے قلبی روابط کو بڑھانے کے لیے "اتحاد العلماء" کے نام اور کام سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں ہم نے دیگر علماء کی طرح مفتی صاحب سے بھی ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنا پروگرام پیش کیا۔ اس سے پہلے ہم دوسرے درجے کے علماء سے مل چکے تھے اور ان کا یہ نقطۂ نظر بھی معلوم کر لیا تھا کہ اگر اکابرین کے مابین اختلاف ختم ہو جائیں یا کم از کم اختلافات میں اعتدال پیدا ہو جائے تو نچلی سطح پر اتحاد کی فضا یقیناً سازگار ہو جائے گی۔

مفتی صاحب نے نہ صرف پروگرام سے اتفاق کیا، بلکہ ہماری کوششوں کو بھی سراہا، لیکن ان کی تجویز یہ تھی کہ اتحاد کے لیے کسی نئی تنظیم کی بنیاد رکھنے کے بجائے پہلے سے قائم جماعتوں کو ایک ضابطۂ اخلاق کا پابند بنایا جائے۔ اس سلسلے میں وہ بھی کوشش کے لیے آمادہ تھے، ان کے خیال میں اس سے اتحاد کا مطلوبہ مقصد بھی حاصل ہو گا اور تمام جماعتوں کا انفرادی وجود بھی برقرار رہے گا۔ ہم نے اپنے انداز میں جو کام شروع کیا تھا، اس کو آگے بڑھایا، چونکہ نئی تنظیم کے قیام سے ان کو اتفاق نہیں تھا، اس لیے انہوں نے ہم سے تعاون نہیں کیا، تاہم ہمارے مقاصد سے متفق ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے کسی قسم کا اختلاف بھی سامنے نہیں آیا۔

میں، مفتی صاحب کی بعض خصوصیات سے نہ صرف متاثر بلکہ مرعوب بھی تھا۔ ان خصوصیات میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے قبل ہمارے جتنے اتحاد ہوئے ان کا محور ہمیشہ ہی کوئی غیر عالم رہا ہے کسی عالمِ دین کی قیادت میں کبھی بھی کوئی بڑا اور قابلِ ذکر اتحاد نہیں ہوا۔ علماء ہمیشہ ہی کسی نہ کسی غیر عالم کی قیادت میں جمع ہوئے اور کام کیا۔ مثالیں تو بہت سی دی جا سکتی ہیں، لیکن اس طرح شخصیات کو زیرِ بحث لانے سے بات بڑھ جائے گی۔ عام لوگوں کے گرد علماء کا اکٹھا ہونا ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے، لیکن یہاں اس گنجائش سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہی کافی ہے کہ علماء نے اپنے سے کم تر لوگوں کی قیادت کو قبول کیا، لیکن اپنے کسی بھائی بند، کسی عالم اور کسی مدرسے کے فاضل کی قیادت میں جمع ہونا کسرِ شان سمجھا۔ اس طرح کے مختلف افراد اور جماعتوں کی مثالیں موجود ہیں، بلکہ تاریخ کے بعض ادوار میں ایسے وسیع تر اتحاد کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ نہ صرف مسلم فرقوں کے درمیان اتحاد کی بات ہوئی بلکہ اس سے بڑھ کر غیر مسلم قوموں کے ساتھ بھی اتحاد کی طرح

www.tezpakistan.com

بیل ڈالی گئی اور اس سے "فلسفہ اتحادِ ادیان" سامنے آیا۔ یہ سب کچھ ہُوا، لیکن یہ کبھی نہیں ہُوا کہ علماء نے کسی عالمِ دین کی قیادت میں جمع ہو کر کوئی تحریک چلائی یا کسی تحریک میں حصّہ لیا ہو۔ ہماری تاریخ کا یہ منفرد واقعہ مفتی محمود کے دَور میں وقوع پذیر ہُوا اور چشمِ فلک نے پہلی بار یہ منظر دیکھا کہ تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے زعماء ایک عالمِ دین کی قیادت میں جمع ہو کر عہدِ حاضر کی سب سے بڑی آمریت کے خلاف سیسہ پیر ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا کہ قوم کے تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہُوئے۔ تمام جماعتوں نے اتحاد کیا اور اس اتحاد کا قائد مفتی محمود کو بنایا گیا۔

مفتی محمود نے اپنی سیاسی بصیرت، تدبّر اور اہلیت کا یُوں ثبوت دیا کہ انتہائی دانشمندی سے اس اتحاد کو برقرار رکھا۔ انتہائی تدبّر سے تحریک کو آگے بڑھایا، بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہُوئے اپنے حریفوں سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور یہ ثابت کر دیا کہ مسجدوں میں رہنے والے بوریہ نشین سیاسی بات کرنا جانتے ہیں، ان میں بات کرنے کی صلاحیّت موجود ہے، تحریکوں کی قیادت کر سکتے ہیں، وہ قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں، وہ مُلکوں کا نظام سنبھالنے کی اہلیت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ تحریک تنہا مفتی صاحب کا کارنامہ نہیں اس میں تمام قوم شامل تھی۔ یہ تمام قوم کا کارنامہ تھا لیکن جہاں تک اس کی بمثال قیادت کا تعلق ہے اس کا اعزاز قدرت نے مفتی محمود کو دینا تھا، سو دے دیا۔

مفتی محمود صاحب کی دوسری خصوصیت جس سے مَیں متأثر ہُوا، یہ تھی کہ انہوں نے دین و سیاست اور درس و تدریس کو ایک ساتھ چلایا۔ وہ ایک طرف پارلیمنٹ میں قومی اُمور پر بحث کرتے اور دوسری طرف اپنے مدرسے میں حدیث کے طالب علموں کو بھی اپنے چشمۂ علم سے فیض یاب کرتے۔ یہ کام معمولی نہیں، غیر معمولی ہے۔ دورۂ حدیث میں صرف حدیث کا ترجمہ کر کے طلباء کو مطمئن نہیں کیا جاتا، بلکہ تقابلِ ادیان کی بحثیں ہوتی ہیں، اپنے مسلک کی ترجیح پر دلائل ہوتے ہیں، دوسرے مذاہب کے رَد میں دلائل دیے جاتے ہیں، پھر ان کا رَد کر کے اپنے مسلک و عقیدہ کو مضبُوط ثابت کیا جاتا ہے۔ طلبا کے اعتراضات کے جوابات دیے جاتے ہیں، یُوں ہی اِدھر اُدھر کی باتوں سے نوجوان علما کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ مفتی محمود کو قدرت نے ذہانت کا وہ جوہر عطا فرمایا تھا جس کے بل بوتے پر وہ ایک طرف قومی اُمور پر بحث کرتے اور دوسری طرف علمِ حدیث کے طالبعلموں کی بھی تشنگی دُور کرتے، مولانا سیّد حسین احمد مدنی کے بعد یہ پہلے عالمِ دین تھے جنہوں نے علم و سیاست کو ایک ساتھ چلایا اور نبھایا۔

تیسری خصوصیّت ان کی یہ تھی کہ وہ حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے، اپنے لیڈر ساتھیوں سے ان کے مرتبے کے مطابق سلوک کرتے اور علما سے بھی اس طرح پیش آتے کہ جس طرح ان کے ساتھ ان کے مرتبے کے مطابق پیش آنا چاہیے اور مجلس میں آنے والے نوجوانوں سے اسی شفقت و محبت سے پیش آتے جس کے کہ وہ مستحق ہوتے۔ اس سلسلے میں مَیں نے بہت سے عملی مظاہرے دیکھے ہیں، انہیں اپنے دوستوں سے بھی ملتے دیکھا ہے، دُشمنوں سے بھی ملتے دیکھا ہے، حریفوں سے بات کرتے ہُوئے دیکھا اور حلیفوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی دیکھا، وہ مُلاقات میں کسی کے علمی یا معاشرتی مرتبے کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

۱۹۸۰ء کے اوائل میں جب وہ دَورۂ ایران پر تشریف لے گئے تو اتّفاق سے ہم دونوں گئے بھی ایک ہی جہاز میں اور آئے بھی ایک ہی جہاز میں۔ اس دوران بہت باتیں ہُوئیں، بہت سے مسائل پر تبادلۂ خیال ہُوا، وہ اختلافات پر اخلاقیات کو ترجیح دیتے تھے۔ ہر بات دلیل سے کرنے اور سُننے کے خواہشمند ہوتے تھے۔ اختلافات کے باوجود رواداری کے قائل تھے۔ مسائلِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے، بلکہ اکثر یُوں ہوتا کہ وہ مسائلِ حاضرہ پر بات کرتے ہُوئے فقہی استدلال سے بھی کام لیتے تھے، اس سے اندازہ یہ ہوتا تھا کہ وہ سیاسی مسائل کو اجتہاد و تفقہ کی ترازو میں تولتے ہیں اور پھر ان مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔

مفتی صاحب کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے متأثر کیا، وہ یہ تھی کہ عام طور پر سیاسی اور مذہبی قائدین کے کارکُن جماعتوں پر حاوی ہوتے ہیں کہ بہت سے فیصلے اپنی مرضی کے مطابق اُن سے کروا لیتے ہیں اور بہت سے ایسے کام کر گزرتے ہیں جن پر بعد میں انہیں وضاحتیں کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ فلاں کام ان کی مرضی کے بغیر ہو گیا ہے جس کا انہیں علم نہیں تھا۔ مفتی صاحب کو اپنے کارکنوں پر بہت کنٹرول حاصل تھا، اُن سے کارکن یا مُلک کے بڑے اور ذمہ دار رہنما بھی اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کروا سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار فیصل آباد میں مولانا تاج محمود نے ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں مفتی صاحب کے اکثر متعلقین موجود تھے، میاں طفیل محمّد بھی مدعو تھے اور مَیں بھی حاضر

www.tezpakistan.com

تھا۔ اس میٹنگ میں مولانا تاج محمود نے بتایا کہ قادیانی جماعت کے لیڈر قومی اسمبلی کے فیصلے کے خلاف اپنی کارروائیوں میں مصروف ہیں اور انتظامیہ ان کی سرگرمیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتی' اس لیے اس اجلاس میں ایک محضر نامہ تیار کر کے اعلیٰ حکام کو بھیجنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ مفتی صاحب ایک اعلیٰ صاحبِ انتظام سے بات کریں۔ مفتی صاحب اس سے پہلے کئی مواقع پر ہمیں بتا چکے تھے کہ ان صاحب سے اب وہ کسی بھی مسئلے پر بات چیت نہیں کرنا چاہتے' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اُن سے بات چیت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا' وہ وقتی طور پر سب کچھ مان لیتے ہیں' لیکن بعد میں کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہر مُلاقات کے بعد مجھے ہمیشہ مایوسی ہُوئی ہے' اب مَیں نے بھی مایوس ہونے کے بعد فیصلہ کر لیا ہے کہ اُن سے کوئی بات نہ کی جائے' لیکن اس میٹنگ میں ان کے حلقے کی تمام چھوٹی بڑی مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کی طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ ان صاحب سے بات کریں اور اس میٹنگ میں فیصلہ کر لیا جائے کہ ختمِ نبوت کے مسئلے پر ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب کو ختمِ نبوت کی حفاظت کے سلسلے میں کسی طریقہ کار کے طے کرنے سے تو اتفاق تھا' لیکن وہ کسی ایسے محضر نامے پر دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جو ان صاحب کے پاس جائے اور نہ وہ ان صاحب سے زبانی بات کرنے کے لیے تیار تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میٹنگ میں تمام لوگوں کے تیور یہی ہیں کہ وہ ایک صاحبِ اختیار سے ملاقات کریں تو مفتی صاحب نے ان کی بات کی تائید کی نہ تردید' وہ ایک دم مجلس سے یہ کہہ کر اُٹھ گئے کہ مَیں نے چنیوٹ جانا ہے' وہاں وعدہ کیا ہُوا ہے' نہ پہنچا تو بُری بات ہو گی' مَیں حیران اور ہکا بکا رہ گیا کہ مفتی صاحب نے کس قدر ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے کہ اس وقت تک میٹنگ میں موجود رہے جب تک ان کے جانے کا وقت نہیں ہُوا اور جب اُٹھنے کا وقت آیا تو اپنی رائے محفوظ لے کر اُٹھ کھڑے ہُوئے اور کسی شخص کو جرأت نہیں ہُوئی کہ وہ انہیں روک دیتا یا اُن سے زبردستی کوئی فیصلہ کرواتا' یا ان کی مرضی کے بغیر انہیں کسی کے ساتھ ملنے پر مجبور کر دیتا۔

مفتی صاحب کی عظمت کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کی کبھی تاویل نہیں کی' جو کہا کھُلم کھُلا کہا۔ کسی سابقہ فیصلے یا اقدام پر انہیں کبھی پچھتاوا نہیں ہُوا' کسی سابقہ بیان کی توجیہہ کی ضرورت محسوس نہیں کی' جو بات جس وقت کہی پوری ذمہ داری سے کہی۔

مولانا عبدالرحمٰن (جامعہ اشرفیہ لاہور)

وہ حضرت تھانویؒ اور حضرت مدنیؒ کے سچّے پیروکار تھے

مفتی محمود سے ۱۹۵۳ء میں میری پہلی ملاقات مدرسہ خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسے میں ہوئی۔ اس کے بعد مختلف مجالس' اجتماعات' تقاریب اور پبلک جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جامعہ اشرفیہ بھی وہ کئی بار تشریف لائے۔ ان کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ اس پر کچھ کہنا سورج کی روشنی پر دلائل دینے

www.tezpakistan.com

والی بات ہے۔ سورج کی روشنی پر دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ روشن ہوتا ہے اور اپنی روشنی کا ہر دیکھنے والے سے اقرار کراتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے آنکھوں کی اور صرف آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی کو خدا نے قوتِ بینائی نہیں دی، تو وہ سورج کی تمازت سے اس کی روشنی کی گواہی دیتا ہے، لیکن ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے ثبوت میں دلائل دیے جائیں۔ مفتی صاحب کے علم پر ایک زمانہ شاہد و عادل ہے اور ان کی بعض خوبیوں کو دیکھ کر ان کے مخالفین بھی ان کی علمی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔

بحیثیت خطیب و مقرر ان کو اپنے تمام معاصرین میں اس لحاظ سے ایک فوقیت حاصل تھی کہ ان کا لہجہ شُستہ، زبان ستھری، گفتگو بے لاگ اور مدلل ہوتی تھی۔ بات ہمیشہ سنجیدگی سے کرنے اور سننے کے عادی تھے۔ اپنے بدترین مخالفوں کا نام بھی احترام سے لیتے تھے، اسی لیے ہر طبقے میں ان کا نام بھی احترام سے لیا جاتا تھا اور ان کے کام کی تعریف ہوتی تھی۔ ہر دلعزیزی کا یہ مقام حاصل کرنے میں ان کے دیگر علمی اوصاف کا بھی یقیناً دخل ہوگا، لیکن میرے خیال میں سب سے زیادہ جس چیز نے انہیں ہر دلعزیز بنایا، وہ ان کی سُلجھی ہوئی گفتگو، ہر ایک سے اس کے مرتبے کے مطابق پیش آنا، ہمیشہ سچ کہنا، سچ کا ساتھ دینا اور حق کے لیے ڈٹ جانا تھا۔ ان کے معاصرین انہیں ایک متبحر عالمِ دین اور مدبر سیاستدان سمجھتے تھے۔

لیکن میں ان کی جس بات کا سب سے زیادہ معترف ہوں، وہ ان کی اپنے اسلاف و اکابر سے محبت تھی۔ دینی مدارس، ماحول اور جماعتوں میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنے بڑوں سے کتنا قریب ہے۔ اگر شاگرد استاد سے قریب نہ ہو، مُرید پیر سے قریب نہ ہو، اخلاف اپنے اسلاف سے ذہنی اور فکری اعتبار سے قریب نہ ہوں، تو ایسے افراد کو مذہبی حلقوں میں کبھی پذیرائی نہیں مل سکتی۔ جو لوگ اکابر سے کٹے ہوئے اور اسلاف سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں، انہیں دینی طبقوں میں عزت و عظمت کا ملنا محال ہوتا ہے، خواہ وہ کتنے صاحبِ علم ہوں، دینی حلقے ان کے ظاہر پر تو کسی حد تک اعتماد کر لیتے ہیں، ان کے باطن پر اعتماد نہیں کرتے۔ معاشرتی تعلقات کے باعث ان کا احترام کر سکتے ہیں، لیکن دینی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی برتری کو تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ دینی اداروں کا سلسلۂ سند دو طرح کا ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ کوئی شخص دینی ادارے سے تعلیم حاصل کر کے سند حاصل کرے۔ وہ سند اس کے علم کی دلیل نہیں ہوتی، کیونکہ علم کے لیے اس کے علم کا اظہار ہی دلیل ہوتا ہے۔ یہ سند اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس کے پیچھے علما و اساتذہ کا ایک روحانی سلسلۂ نسب موجود ہے، اس کے پڑھانے والا فلاں اور اس کا استاد فلاں فلاں ہے۔ یہ سند اپنے بزرگوں سے اس کا علمی رابطہ قائم کرتی ہے۔ دوسرا سلسلۂ سند آدمی کی عملی زندگی سے نظر آتا ہے۔ اس کی باتوں سے، اس کے چال چلن سے، اس کے رہن سہن اور خورد و نوش سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر کسی استاد یا بزرگ کا کتنا اثر ہے، اس کے اندر کون بول رہا ہے، اس کے روحانی اور فکری رابطے کس سے ہیں۔

ہمارے متاخرین کا روحانی سلسلہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے ملتا ہے اور ان کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ و مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، دو علمی و روحانی مفکرین ہیں جن کے متوسلین اور چاہنے والے نسبتاً زیادہ ہیں۔ یہ دونوں سلسلے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمود حسنؒ اسیرِ مالٹا، مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے صاحبِ علم و بصیرت بزرگوں کے علمی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ ان تمام بزرگوں کا علمی سلسلہ مختلف واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک چلا جاتا ہے۔ عہدِ قریب کے یہ دو بزرگ تھانویؒ و مدنیؒ الگ الگ سلسلوں کے بانی نہیں تھے، بلکہ مقامات کے فرق نے پیروکاروں میں تقسیم کر دی اور آگے چل کر کچھ تو ایک بزرگ سے منسوب ہو گئے، کچھ دوسرے سے۔ حضرت مولانا مفتی محمود ان دونوں بزرگوں کے سچے اور سچے پیروکار تھے۔ ایک طرف تو وہ حضرت تھانویؒ کے علمِ کلام و قرآن کے وارث تھے، تو دوسری طرف حضرت مدنیؒ کے علمِ حدیث اور علمِ سیاست کے حامل۔ جس طرح شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت تھانویؒ کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے پاکستان بنانے میں مدد دی، کیونکہ حضرت تھانویؒ نے قیامِ پاکستان کے لیے فتویٰ دیا تھا، اسی طرح پاکستان بننے کے بعد مفتی صاحب نے حضرت مدنی کی جانشینی کا اس کی حفاظت کر کے حق ادا کیا کہ حضرت مدنیؒ نے اس کی حفاظت کے لیے دعا مانگی تھی۔

پاکستان حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے کر ہندوستان میں کلمۂ اسلام بلند کرنے والے ان لاکھوں مسلمانوں کی میراث ہے جسے ان کے خونِ شہادت کے نتیجے میں حاصل کیا گیا تھا۔ مفتی محمود نے ان لاکھوں شہیدوں، حضرت تھانویؒ و حضرت مدنیؒ اور دوسرے علمائے حقہ کی اس میراث کی حفاظت کے لیے اپنی عمر وقف کیے رکھی۔ میں مفتی محمود صاحبؒ کی زندگی کے اسی پہلو سے زیادہ متاثر تھا کہ وہ اپنے اسلاف سے محبت کرتے

www.tezpakistan.com

تھے۔ اپنے اکابر سے وہ جس محبت و شیفتگی کا اظہار اکثر کرتے رہتے تھے، وہ ان کے دونوں سلسلہ ہائے سند کے معتبر ہونے کی دلیل تھا۔

مَیں نے انہیں سنایا کہ جب مَیں پہلی بار اپنے والد مفتی محمد حسنؒ صاحب کے ہمراہ ہندوستان گیا، تو میری نیت ہندوستان دیکھنے کی نہیں، بلکہ حضرت مدنیؒ جیسے بزرگ کی زیارت تھی؛ چنانچہ جب مَیں وہاں پہنچا، تو حضرت مدنیؒ کو قریب سے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ مَیں اس حال میں ان کی مسجد پہنچا کہ نماز کا وقت قریب تھا۔ مَیں نے حضرت مدنیؒ کے قُرب کے شوق میں پہلی صف میں ان کے ساتھ جگہ حاصل کر لی۔ عمر کم تھی۔ فقہی مسائل پر زیادہ عبور نہیں تھا؛ چنانچہ حضرت کا جسم چُھونے کی غرض سے نماز میں اپنا شانہ ان کے شانے سے مِلا کر کھڑا ہو گیا۔ سلام پھیرنے کے بعد حضرت میری اس حرکت پر مسکرا کر رہ گئے۔ بعد ازاں مَیں نے ان کی مجلس میں ان سے بہت سے سوالات کیے۔ میرے کچھ سوالات پر ان کے عقیدت مندوں نے سمجھا کہ مَیں حضرت کا مخالف ہوں، وہ مجھے گھور کر دیکھنے لگے۔ اس پر حضرت مدنیؒ نے فرمایا: "عبدالرحمٰن صاحب میرے مہمان ہیں، میرے مخالف نہیں۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے اتنے دور سے آئے ہیں۔ تم انہیں میرا مخالف سمجھ کر گھورتے ہو۔ انہیں ہر قسم کے سوالات پوچھنے کی اجازت ہے۔" مَیں حضرت مدنیؒ کی شفقت سے بے حد متاثر ہوا اور جب مَیں نے یہی واقعہ مفتی محمود صاحب کو سنایا، تو وہ جھوم اٹھے، کہنے لگے: "وہ واقعہ پھر سنائیں، بہت مزے دار واقعہ ہے۔ واقعی بڑوں کا اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہی برتاؤ ہونا چاہیے جو شیخ مدنیؒ کا تھا۔"

مَیں نے مفتی صاحب کے اس اصرار پر کہ یہ واقعہ دوبارہ سناؤ، یہ اندازہ لگایا کہ مفتی صاحب کو اپنے بزرگوں کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت نے انہیں مرجعِ عقیدت بنایا تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی انہیں بڑی محبت تھی۔ ان کی باتیں سُن کر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ میرا خیال ہے مفتی صاحب کی جماعتی عظمت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے سچے پیروکار تھے اور ان کے کارکن انہیں ان بزرگوں کا نعم البدل سمجھتے تھے۔ وہ تو اپنے بڑوں کے جانشین بننے میں کامیاب ہو گئے، لیکن اب ان کا نعم البدل مشکل ہی سے پیدا ہو گا۔

مولانا محمد عبداللہ، (اسلام آباد)

انہوں نے کہا، دیکھنا آج کیا بنتا ہے؟ پھر وہی کر دکھایا!

مفتی محمود صاحب کا اور میرا استاد شاگرد کا رشتہ نہیں تھا، لیکن مُرید و مُرشد اور خادم و مخدوم کا رشتہ ضرور تھا۔ ان کی یادگارِ زمانہ شخصیت سے میری ملاقاتیں بے شمار ہیں اور ہر ملاقات کی ہر بات یادگار ہے۔ میرے لیے یہ بات بہت مشکل ہے کہ ان کی کسی ایک علمی بات کو یادگار قرار دوں؛ تاہم ایک واقعہ اس لحاظ سے ناقابلِ فراموش ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک بار مجھے ضرور یاد آتا ہے اور اس واقعے کا تعلق محراب و منبر

www.tezpakistan.com

سے ہے۔ مفتی صاحب نے جامع مسجد میں بارہا جمعہ کے روز خطاب کیا۔ یہ مسجد ان کا مرکز بھی، لیکن اس بات سے انہیں ہمیشہ اختلاف رہا کہ یہاں نمازِ جمعہ دیر سے ادا کی جاتی ہے۔ کئی بار انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ اوّل وقت میں نمازِ جمعہ پڑھانے کا اہتمام کروں لیکن یہ میرے بس کا کام نہ تھا۔ لوگ مسجدوں میں دیر سے پہنچنے کے عادی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ان کی مصروفیات ہی ایسی ہوں گی کہ یہ نمازی اس وقت سے پہلے آ ہی نہیں سکتے، چنانچہ ہماری نمازِ جمعہ کا وقت اڑھائی بجے کا طے ہو گیا۔

ایک بار مفتی صاحب جمعہ کو تشریف لائے تو مَیں نے حسبِ سابق انہیں تقریر کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر دعوت قبول کر لی کہ آج میں تمہاری لیٹ کی رسم ہمیشہ کے لیے توڑ دوں گا۔ مَیں نے ہنس کر کہا: "حضرت، یہ جماعتی کارکن تو نہیں کہ آپ انہیں پہلا حکم دے کر ہی پابند کر لیں گے۔" مفتی صاحب نے بھی ہنستے ہوئے کہا: "دیکھو پھر آج بنتا کیا ہے؟" چونکہ مفتی صاحب کی آمد کی خبر پہلے ہی مشہور ہو چکی تھی اس لیے لوگ بڑی تعداد میں آغازِ تقریر ہی میں موجود تھے۔ اس روز مفتی صاحب نے اوّل وقت میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کی افضلیت پر تقریر کی۔ فقہ کی کئی کتابوں سے دلائل دے کر سامعین کو سمجھایا کہ نمازِ جمعہ نام ہی اوّل وقت میں ادا کی جانے والی نماز کا ہے۔ نہ صرف تقریر میں اس بات پر زور دیا، بلکہ اسی وقت اعلان بھی کر دیا کہ "آج سے مَیں نمازِ جمعہ کے لیے ڈیڑھ بجے کا وقت مقرر کرتا ہوں۔" مفتی صاحب نے گھڑی دیکھی، تو ڈیڑھ بجنے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔ لوگوں کو صف بندی کا حکم دیا، اذان اور خطبہ مسنونہ کے بعد ڈیڑھ بجے ہی نماز کھڑی کر دی گئی۔ اس کے بعد مَیں نے وقت کو نبھانے کی کوشش کی۔ ابتدائی چند ہفتے تو بڑی تکلیف ہوئی، لوگ بروقت نہیں آتے تھے لیکن آہستہ آہستہ لوگ جلدی آنے کے عادی ہو گئے۔ اب پورے اسلام آباد میں سوا ایک بجے نمازِ جمعہ ادا کی جاتی ہے۔ اگر مفتی صاحب خود اس بات کا اہتمام نہ کرتے، تو شاید اس افضل وقت کی کبھی نوبت نہ آتی اور اسلام آباد میں نمازِ جمعہ کے اوقات کی اصلاح نہ ہو سکتی۔ مفتی صاحب معروف معنوں میں بھی "مصلحِ وقت" تھے اور اس انقلابی اقدام کے حوالے سے بھی انہیں "مصلحِ وقت" کہنا بجا ہے۔

مولانا امیر الزمان کاشمیری (آزاد کشمیر)

آزادیٔ کشمیر
ان کی دلی تمنّا تھی
اُسی مہمان خانے میں ان سے آخری مُلاقات ہُوئی جہاں پہلی بار مِلا تھا!

میری پہلی ملاقات حضرت مولانا مفتی محمود سے اس زمانے میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں ہوئی جب وہ آغا شورش کاشمیری مرحوم کی رہائی کے سلسلے میں کراچی تشریف لائے ہوئے تھے۔ مَیں بھی اس وقت کراچی میں تھا۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مہمان خانے میں حضرت سے جا کر ملا، اپنا تعارف کرایا، بہت ہی خوش ہوئے اور کشمیر کے حالات دریافت فرمائے۔ یہ ملاقات

www.tezpakistan.com

تقریباً آدھ گھنٹہ رہی۔ اس کے بعد پھر ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اکثر ملاقاتیں راولپنڈی، لاہور، گوجرانوالہ اور کراچی میں ہوئیں مئی ۷۴ء میں جمعیت طلباء اسلام آزاد کشمیر کے مرکزی کنونشن منعقدہ باغ میں حضرت مفتی صاحب بھی مدعو تھے، لیکن مجھ سے فرمایا کہ اگر آپ دعوت دیں تو میں کنونشن میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میں نے انہیں بااصرار دعوت دی، تو شرکت کا وعدہ کیا اور وقتِ مقررہ پر شریک بھی ہوئے۔

اس دورے میں ان کا قیام میرے مدرسہ عربیہ قاسم العلوم نعمانپورہ میں تھا جہاں انہوں نے مدرسے کا معاینہ کیا، رجسٹر حسابات آمدن اور خرچ ملاحظہ فرمائے اور طلبا سے امتحان بھی لیا، پھر مدرسے کی "کتاب الآراء" میں ان خیالات کا اظہار فرمایا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــــ حامداً و مصلیاً و مسلماً ــــ امابعد آج بتاریخ ۲۶ مئی ۱۹۷۴ء بمطابق ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ بیوم یکشنبہ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم نعمانپورہ آزاد کشمیر حاضر ہوا۔ مدرسہ ماشاء اللہ علمی خدمات بوجہ احسن سرانجام دے رہا ہے۔ یہ مدارس آج کے مظلم دور میں روشنی کا مینار ہیں اور دین کی حفاظت کے مضبوط قلعے ہیں۔ حضرت مولانا امیر الزماں صاحب مدرسہ ہذا کے مہتمم اور مدرس ہیں۔ دوسرے مدرسین آپ کے زیرِ نگرانی نے فرائض کی تکمیل میں مشغول ہیں۔ آزاد کشمیر کی پہاڑیوں میں دور دراز دور افتادہ پسماندہ علاقے میں یہ علمی خدمت قابلِ قدر ہے۔ مولانا امیر الزماں خان نے مدرسے میں کتب کی ضرورت اور عمارت کے ناکافی ہونے کی شکایت بیان فرمائی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاگو ہوں کہ وہ غیب سے مدرسے کی خاص نصرت فرما کر کارکنان کی للہیت اور خلوص میں بیش از بیش اضافہ فرمائے اور اہلِ خیر سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی پاک کمائی یہاں صرف ہو کر صحیح مصرف پر لگ کر دنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنے گی۔ واللہ الموفق وہو خیر معین

محمود عفا اللہ عنہ خادم مدرسہ قاسم العلوم ملتان شہر، ناظم عمومی جمعیۃ علماء اسلام کل پاکستان، ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان و رکن قومی اسمبلی پاکستان"

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب جب راولپنڈی پولی کلینک ہسپتال میں زیرِ علاج تھے، تو ہمارے ایک عزیز مولوی عبدالحلیم آف جھگڑی کے ذریعے ملاقات کے لیے پیغام بھیجا۔ اس وقت بھی حاضرِ خدمت ہوا اور آزاد کشمیر کی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال ہوا۔

عام لوگ تو حضرت مفتی صاحب کو ایک سیاستدان کی حیثیت سے جانتے تھے، لیکن اصل میں مفتی صاحب ایک عظیم محدث، فقیہہ اور متکلم اور علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون پر جتنا گہرا مطالعہ اُن کا تھا اُتنا شاید کسی اور کا نہ ہو۔

خدا کی قدرت دیکھیے کہ میں بغرض علاج ۱۲ اکتوبر کو کراچی پہنچا، یہاں معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب بھی تشریف فرما ہیں، تو ۱۳ اکتوبر کو جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے اسی مہمان خانے میں آخری ملاقات ہوئی جہاں سے ملاقات کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں بہت سے امور زیرِ بحث رہے۔ تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو رہی۔

مفتی صاحب نے کشمیر کی آزادی کے لیے بھی جدوجہد کی اور کشمیر کے خلاف سازشوں کو بڑی جرأت سے بے نقاب کرتے رہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

"۲۸ سال سے کشمیر کے متعلق پاکستان کا یہ موقف چلا آرہا ہے کہ کشمیریوں کی تقدیر کا فیصلہ حق خود ارادیت سے ہی ہوگا، خواہ ان کشمیریوں کا تعلق آزاد کشمیر سے ہو یا مقبوضہ کشمیر سے، وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کریں گے۔ پاکستان نے کشمیر کی تقسیم کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔ اگر آزاد کشمیر کے لوگوں کو پاکستان کی قومی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے کسی بھی ایوان میں نمایندگی دی گئی، تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا حصہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور موجودہ کنٹرول لائن کو مستقل لائن کی حیثیت دے کر کشمیر کے مسئلے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر بھارت کو طشتری میں پیش کر دیا جائے گا اور کنٹرول لائن کے اِس پار کا علاقہ پاکستان کو مل جائے گا۔ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ انڈیا کے ساتھ اُن کا

www.tezpakistan.com

کوئی خفیہ سمجھوتہ ہوا ہے اور یہ کشمیر کی آزادی کے خلاف سازش ہوگی۔ کشمیریوں کے خلاف یہ فیصلہ پاکستانیوں اور کشمیریوں دونوں کے لیے ناقابل قبول ہوگا۔" (ہفت روزہ چٹان ۲۱ جون ۱۹۷۶ء)

گویا یہ بتا دیا کہ آزاد کشمیر کو پاکستان کے کسی ایوان میں نمایندگی دینے کا مطلب کشمیر کی موجودہ حیثیت کو ہمیشہ کے لیے قبول کرنا اور مسئلۂ کشمیر کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے مترادف ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن (جامعہ اشرفیہ لاہور)

خُفیہ باتیں
اہم مُلاقاتیں
قومی راز
سعودی عرب میں
اُن کی قیمتی متاع گم ہوگئی

حضرت مفتی صاحب کے ساتھ سفر تو بہت کیے، لیکن سفرِ ہند اور دورۂ سعودی عرب دو یادگار سفر ہیں۔ کسی بھی انسان کے ساتھ لین دین اور سفر کرکے اس کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مَیں نے اگرچہ اس نقطۂ نظر سے ان کے ساتھ سفر نہیں کیا تھا، لیکن سفر کے نتیجے میں خود بخود ہی یہ حقیقت ظاہر ہوگئی، ان کے ساتھ سفر میں اکثر یہ بات دیکھنے میں آئی کہ وہ حتی الامکان اپنے ہمسفروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، بیرونِ مُلک دوروں میں بڑے لوگوں کا رویّہ بالعموم اپنے چھوٹوں کے ساتھ مخدوموں کا سا ہوتا ہے۔ وہ اپنے چھوٹے ہمراہیوں کو خادم سمجھتے ہیں، انہیں جا و بیجا احکامات دیتے رہتے ہیں، انہیں مختلف کاموں میں اُلجھائے رکھتے ہیں، لوگوں کو اپنے بڑے اور دوسروں کے چھوٹے ہونے کا تاثر دیتے ہیں، وہ خود کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچاتے اور اپنے ساتھیوں کو کسی نہ کسی آزمائش سے دوچار کیے رکھتے ہیں، مگر مفتی صاحب نے ایسا کبھی نہیں کیا۔

وہ اپنے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے تھے، کسی نے دعوت دی تو یہ نہیں کہ خود چلے گئے اور رفقاء کو چھوڑ دیا، بلکہ یہ کہہ کر دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ مَیں اپنے دوسرے رفقاء کو چھوڑ کر دعوت قبول نہیں کرسکتا۔ مَیں وہی کھانا پسند کروں گا جو ان سب کو میسر ہوگا۔ سفرِ دیوبند میں ان کے ہمراہ علماء، طلباء تھے، یہ سب ان کی خدمت اپنے لیے باعثِ اعزاز سمجھتے تھے، لیکن مَیں نے دیکھا کہ مفتی صاحب اپنے چھوٹے موٹے کام خود کرتے ہیں، کسی کو تکلیف نہیں دیتے، کسی پر حکم نہیں چلاتے، کوئی ان کی خدمت کرتا ہے تو روک دیتے ہیں، کوئی ان کے پاؤں دابتا ہے تو یہ کہہ کر منع کر دیتے ہیں کہ تم خود تھکے ہُوئے ہو، تم میری خدمت کرو گے تو تمہاری خدمت کون کرے گا۔ اگر تم مجھے بھی خدمت کا یہی حق دے دو تو ٹھیک ہے۔ مَیں تم میں کسی سے کوئی بلند رتبہ آدمی نہیں۔ ان کا یہ عمل دراصل ان کے انتہائی منکسر المزاج ہونے کی علامت تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں اپنے خُلیے، مخصوص وضع قطع اور معمر ہونے کے باعث پہچانے جاتے تھے، ورنہ عام لوگوں کے ساتھ اس طرح گھُل مِل کر رہنا اور اُٹھنا بیٹھنا پسند کرتے تھے کہ جیسے

www.tezpakistan.com

کیسے تھے؟ میری معلومات کے مطابق لین دین، مفتی صاحب کے معمولات سے خارج تھا، وہ کسی سے قرض نہیں لیتے تھے۔ ممکن ہے رشتہ داروں میں کوئی ایسی صورت موجود ہو، تاہم ان کے سامنے والوں سے ان کا یہ معاملہ کبھی نہیں رہا، البتہ سفر کے دوران بعض جگہ میں نے کچھ پیسے خرچ کیے یا مفتی صاحب کے لیے کوئی چیز لی تو مفتی صاحب نے کسی نہ کسی رنگ وہ پیسے فوراً لوٹا دیے، یہ ظاہر کیے بغیر کہ انہوں نے اس چیز کی قیمت ادا کی ہے کیونکہ جو انہوں نے لوٹایا وہ اس قیمت سے زیادہ ہوتا تھا، وہ کسی چیز کی خریداری کی شکل میں ہو یا تبادلے کی شکل میں۔

اس طرح میں نے سفر اور معاملاتِ سفر، لین دین اور اس کے متعلق امور میں بھی مفتی صاحب کو متقی پایا۔ ان کی زندگی عملی تھی۔ وہ، وہ نہیں کہتے تھے جو کر نہیں سکتے تھے، جو کہتے تھے وہ کر کے دکھاتے تھے۔ وہ مستقل مزاج، صائب الرائے، نرم خُو اور حلیم الطبع انسان تھے، خوش اخلاق اور ملنسار تھے۔ وہ خوبیاں جو کسی کو ممتاز کرتی ہیں وہ تمام ان میں موجود تھیں۔

مولانا قاضی احسان الحق (راولپنڈی)

کبھی کبھار اختلاف کے باوجود حضرت شیخ القرآنؒ انہیں اہلِ حق کا نمائندہ سمجھتے تھے

حضرت مفتی صاحب کو میں نے پہلی بار اپنے والدِ محترم شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں صاحب کے ساتھ اسی دارالعلوم تعلیم القرآن میں تشریف فرما دیکھا۔ والد صاحب ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی علمی و سیاسی خدمات کے قدردان تھے۔ مفتی صاحب جب کبھی تشریف لاتے، تو والد صاحب مجھے یا میرے کسی بھائی کو ان کی خدمت پر مامور کر دیتے۔ ان کے مذہبی اور سیاسی جلسوں کے لیے دارالعلوم کی مسجد کو ہمیشہ کھلا رکھا گیا اور انتظامیہ کو تعلیم القرآن کا جلسہ خراب کرنے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔ والد صاحب سمجھتے تھے کہ مفتی محمود صاحب سیاست میں ہمارے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سیاست ہمارے اکابرین کی وراثت ہے۔ ہمارے اکثر اکابر سیاستدان تھے۔ اب ان کے پاکیزہ سیاسی مشن کی مفتی محمود صاحب حفاظت کر رہے ہیں، اس لیے ہم سب کو ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

سیاسی امور میں بسا اوقات اختلاف بھی ہوتا تھا اور حضرت شیخ القرآن، مفتی صاحب سے صاف صاف کہہ دیتے تھے کہ آپ کے فلاں سیاسی فیصلے سے مجھے اختلاف ہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی وقت سیاسی اختلاف کی وجہ سے والد صاحب نے مفتی صاحب سے عدم تعاون کیا ہو۔ وہ سیاست پر مذہب کو ترجیح دیتے تھے اور چھوٹے موٹے سیاسی اختلاف کے باوجود مفتی صاحب کو اہلِ حق کا نمائندہ سمجھتے ہوئے ان سے ہمیشہ تعاون کرتے تھے۔ مولانا غلام اللہ خاں نے سیاست میں ہمیشہ محتاط طور پر حصہ لیا۔ انہوں نے انتخابی جھمیلوں میں کبھی الجھنے کی کوشش

www.tezpakistan.com

نہیں کی۔ کئی بار خود مفتی صاحب نے فرمایا کہ آپ الیکشن لڑیں، لیکن والد صاحب نے اس سے ہمیشہ انکار کیا، کیونکہ انہیں انتخابی سرگرمیوں اور پبلک سے کیے جانے والے عجیب وغریب وعدوں سے طبعی نفرت تھی۔ وہ اس میدان سے ہمیشہ بچتے تھے، لیکن انتخابی ہنگاموں سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بھی وہ انتخابی سرگرمیوں سے الگ نہیں رہ سکتے تھے، کیونکہ ایسے مواقع پر مفتی صاحب کی ذات سامنے آجاتی تھی۔ ان کی جماعت کا کوئی نہ کوئی امیدوار کھڑا ہوتا تھا، اس کے لیے انہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا تھا، مگر وہ لوگوں سے واضح طور پر کہہ دیتے تھے کہ یہ نمائندہ اگر دیندار ہے اور آپ کے نزدیک اسلام کے لیے اس کی کامیابی ضروری ہے، تو اسے ووٹ دیں، اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی کامیابی اسلام کے لیے نفع بخش نہ ہوگی، تو اسے ووٹ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ کچھ مہربانوں نے بعض درباری حلقوں کے اشارے پر مفتی صاحب اور والد صاحب کو ایک دوسرے سے دُور رکھنے کی کوشش کی۔ اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ ملّی اور قومی امور جو اتفاقِ رائے سے انجام پذیر ہو رہے ہیں، ان میں تعطل پیدا ہو۔ دونوں بزرگوں کو دُور کر کے، دونوں کے حلقوں کو ایک دوسرے سے دُور کر کے اختلاف کا بیج بو دیا جائے۔ ان کی اس کوشش کا مذہبی طور پر تو نقصان نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان دونوں بزرگوں کے عقائد ونظریات میں کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن ان کی دُوری سے سیاسی سطح پر نقصان کا امکان موجود تھا۔ چونکہ والد صاحب طبیعت کے بہت سخت واقع ہوئے تھے، اس لیے بسا اوقات کسی بات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی طبیعت کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ جونہی دوسری طرف سے مفاہمت کا ہاتھ آگے بڑھا، ان کا سارا غصہ جاتا رہا۔ حضرت مفتی صاحب، والد صاحب کی طبیعت کو سمجھتے تھے۔ جب کبھی وہ دیکھتے کہ ان کے مزاج میں سختی ہے، تو وہ فوراً سمجھ جاتے کہ کسی دشمن نے کوئی ہوائی اڑا دی ہے، چنانچہ فوراً ہی ان کی غلط فہمی دُور کر دیتے۔ ہماری والدہ کا انتقال ہوا، تو مفتی صاحب کسی وجہ سے تعزیت کے لیے نہ آسکے۔ ان کی مصروفیات ہمارے پیشِ نظر تھیں، کچھ لوگوں نے اس بات کو بہانہ بنا کر ان بزرگوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن اس معاملے میں انہیں کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ والد صاحب ایسی باتوں کو اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ پھر اس روز ایک لطیفہ ہی ہو گیا جب مفتی صاحب، مولانا محمد اجمل خاں کے ہمراہ تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ حضرت شیخ القرآن اس وقت موجود نہ تھے۔ میں نے مفتی صاحب کو بٹھایا۔ انہوں نے فاتحہ پڑھی اور تشریف لے گئے۔ والد صاحب آئے، تو میں نے مفتی صاحب کی تشریف آوری کا ذکر کیا۔ وہ ہنس کر فرمانے لگے، مفتی صاحب کی تشریف آوری نے لوگوں کے کہنے کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ یہ بات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ بزرگوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف میں بھی چھوٹوں کے لیے ایک سبق ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ مومن کی دوستی ودشمنی اور محبت وعدم محبت ہمیشہ اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب اور دوسرے بہت سے اہلِ حق جو والد صاحب کے پاس تشریف لاتے تھے، ان کے درمیان، ان کے اور والد صاحب کے درمیان کئی بار کسی بات پر اختلاف ہوا۔ پھر یہ اختلاف یوں مٹ گیا جیسے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے دوران والد صاحب علیل تھے، لیکن انہوں نے اپنی علالت کے باوجود خیر کی قوتوں کا ساتھ دیا اور شر کی قوتوں کو شکست دینے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ پھر جب مفتی صاحب کی قیادت میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰ چلی، تو حضرت شیخ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ بہت خوش تھے کہ اس تحریک کا علم اہلِ حق کے نمایندے کے ہاتھ میں ہے۔ جس روز پشاور سے مفتی صاحب نے گرفتاری پیش کی، حضرت شیخ پنڈی کے تمام علما کو میدان میں لے آئے اور شہر سے اتنے علما نے گرفتاریاں دیں کہ انتظامیہ کے لیے ان کے لیے جیل کا انتظام کرنا بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ مرکزی قیادت کی طرف سے لانگ مارچ کا اعلان ہوا، تو پنڈی آنے کے تمام راستے حکومت نے مسدود کر دیے اور جو لوگ راولپنڈی پہنچنے میں کامیاب ہوئے، انتظامیہ، سی آئی ڈی، ایف ایس ایف اور حکومت کے دوسرے سول اور سرکاری اہل کاروں نے شہر میں ایک قدم چلنا بھی ان کے لیے دشوار بنا دیا۔ جگہ جگہ مجاہدین کی پکڑ دھکڑ اور پٹائی ہو رہی تھی۔ حضرت شیخ نے اپنے تمام طلبا اور متعلقین کو حکم دیا کہ وہ گلی کوچوں میں نکل کر ان کی حفاظت کریں اور غنڈوں سے انہیں محفوظ کرنے کے لیے بندوبست کیا جائے۔ حضرت شیخ فرماتے تھے، لانگ مارچ کے ذریعے پنڈی آنے والے لوگ مفتی محمود کے سپاہی اور ہمارے مہمان ہیں۔

تحریک کے دوران ایک بار سرکاری اہل کاروں اور ان کے سویلین رضا کاروں نے دارالعلوم تعلیم القرآن پر حملہ کر کے طلبہ کو مار مار کر باہر

www.tezpakistan.com

نکال دیا اور رات بھر یہاں شراب نوشی ہوتی رہی۔ ان لوگوں نے مسجد کے تقدس کو بھی پامال کر دیا۔ اس واقعے سے حضرت شیخ کی طبیعت پر بُرا اثر ہوا اور کئی دن تک وہ بار بار یہ کہتے رہے، اس قوم کی نجات کیسے ہوگی جس کو خدا کے گھر میں شراب نوشی سے شرم نہیں آئی۔ حضرت مفتی صاحب نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا، شیخ صاحب آپ تو خود ہی حق کی راہ میں آنے والے صدمات کو برداشت کرنے کی تلقین فرمایا کرتے ہیں، اب خود ہی اس واقعے سے اس قدر دل برداشتہ ہو رہے ہیں، آپ کو صبر کے ساتھ یہ واقعہ برداشت کرنا چاہیے اور دین کے دشمنوں کا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بہرحال اس ملک کی فلاح و بہبود اور اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کی کوششوں، کاوشوں اور قربانیوں کا بڑوں کو بھی اعتراف تھا اور ہم چھوٹوں کو بھی اعتراف ہے۔ ان کی عظمت کو تسلیم کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ان کے متعلقین، متوسلین اور چاہنے والے اپنے آپ کو تیار کریں۔ مفتی صاحب کے لیے ہمارا سب سے بڑا خراجِ عقیدت یہ ہے کہ ان کے پروگرام کی تکمیل کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو وقف کر دیں۔

قاری عبدالعزیز جلالی، راولپنڈی

مجھے سخت غصّہ آیا
سرحد کے "وزیرِ اعلیٰ"
کو خُوب ڈانٹا — مگر
پھر شرم سے پانی پانی ہو گیا

میں اُن کے کمرے میں پہنچا، تو رات کا ایک بجا تھا۔ اس وقت سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کی آنکھیں سرخ، بال بکھرے ہوئے اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ کاغذوں کے انبار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے انداز و اطوار سے سخت غصّے اور اضطراب اور اندرونی کرب کا اظہار ہو رہا تھا، لیکن میں ان سے کہیں زیادہ غصّے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھا۔ مجھے آخر غصہ کیوں نہ آتا۔ میں نے صرف تین روز پہلے راولپنڈی میں ان سے ملاقات کا باقاعدہ وقت لیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا دو روز چھوڑ کر تیسرے روز صبح نو بجے آجانا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا، لیکن ملاقات کے لیے پندرہ گھنٹے کا طویل اور جان لیوا انتظار، صبح آکر بیٹھا، دوپہر ہوئی، شام ہوئی، رات آگئی اور اب رات کے پچھلے پہر میں ان کے آدمیوں کو زبردستی دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔ وہاں اس وقت بھی ہجوم تھا۔ میں اپنے علاقے کے ظالم خوانین کے مظالم کی داستانیں لے کر آیا تھا، لیکن اس وقت وزیرِ اعلیٰ ہاؤس میں جو ہجوم تھا اس میں خوانین کے دو تین تنخواہ دار ملازم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گویا مفتی صاحب کا انہوں نے پہلے ہی گھیراؤ کر رکھا تھا۔

مفتی صاحب نے فرمایا "کیسے جلالی صاحب!" یہ سننا تھا کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے اتنی زور سے بات شروع کی کہ باہر کھڑے لوگ بھی ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اندر آگئے۔ میں نے کہا: آپ نے مجھے صبح نو بجے کا وقت دیا تھا۔ اب رات کا ڈیڑھ بج چکا ہے۔ آپ کی حالت

www.tezpakistan.com

یہ ہے کہ آنکھوں میں نیند، چہرے پر اضطراب، مَیں آپ سے کیا کہوں۔ آپ کے کارندے شریف لوگوں کو اندر نہیں آنے دیتے۔ آپ شریف لوگوں کو وقت دیتے اور پھر اسی وقت میں کسی اَور سے ملتے ہیں۔ مَیں جن لوگوں کے ظلم کی داستان سُنانے آیا ہوں، وہ آپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کو ظالم مظلوم کا فرق ہی معلوم نہیں۔ مومن اپنی فراستِ ایمانی سے جان لیتا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے آپ نے اب تک عشا کی نماز بھی ادا نہیں کی ہوگی، اس لیے آپ اپنی ایمانی فراست سے معلوم نہیں کرسکتے کہ آپ کے پاس وہ لوگ بیٹھے ہیں جو آستینوں میں سانپ اور ڈاب میں خنجر رکھتے ہیں، جن کے ہاتھ غریبوں کے خون سے رنگین ہیں۔ آپ فرماتے ہیں مَیں بات کروں۔ مَیں کیا بات کروں، یہ کوئی بات کرنے کا وقت ہے؟ مَیں جارہا ہوں، قیامت کے روز اس شخص کا گریبان پکڑ کر خدا کے رُوبرو بات کروں گا جو صبح سے شام تک لوگوں کو دروازے پر بٹھائے رکھتا تھا۔
یہ کہہ کر مَیں دروازے کی طرف بڑھا اور آناً فاناً باہر نکل گیا۔

باہر آتے ہی وہاں پر موجود لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ سرکاری ملازمین بھی میری طرف بڑھنے لگے۔ معاً میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کسی نے مجھے پیچھے موڑنے کی کوشش کی۔ مَیں نے دیکھا کہ یہ خود مفتی صاحب تھے۔ فرمانے لگے "صرف سنانا ہی مردانگی نہیں، سُنا کر سُننا بھی مردانگی ہے۔ مَیں نے ابھی جواب ہی نہیں دیا کہ آپ چل دیے۔" غصہ تو مَیں پہلے ہی نکال چکا تھا، اب جو مفتی صاحب نے مجھے باہر آکر خود روکا، تو رہا سہا غصہ بھی جاتا رہا۔ بہرحال مَیں ان کے کہنے پر دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا: "قاری صاحب! آپ نے بہت کچھ کہا ہے، آپ کی بہت سی باتوں کا مَیں جواب دینا چاہتا ہوں۔ مَیں اگر اس وقت آپ کو واپس نہ لاتا، تو کوئی بات نہیں تھی۔ آپ میرے بیٹے ہیں۔ بیٹے ناراض ہوتے ہیں، پھر خود ہی گھر واپس آجاتے ہیں۔ آج آپ جاتے، تو کل پھر واپس آتے۔ مَیں نے اس لیے آپ کو روکا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے آپ کی باتوں کا جواب دُوں جن کا مَیں نوکر ہوں۔"

"نوکر ہیں؟ آپ نوکر ہیں، کیا مطلب؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "جی ہاں! مَیں نوکر ہوں۔ یہ لوگ جو یہاں موجود ہیں، مَیں ان کا وزیرِ اعلیٰ ہوں، وزیرِ اعلیٰ نوکر ہی ہوتا ہے۔ آپ کو شکایت ہے کہ مَیں نے آپ کو صبح نو بجے کا وقت دیا تھا، مَیں آٹھ بجے آیا ہوں۔ مجھے آپ کی آمد کی اطلاع نہیں ملی۔" مَیں نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو میری چٹ لے کر اندر گیا تھا۔ اس نے شرم سے سر جھکا لیا۔ اس نے مفتی صاحب تک میری آمد کی اطلاع نہیں پہنچائی تھی۔ مفتی صاحب کے پوچھنے پر اس نے اقرار کیا کہ مَیں وہ چٹ نہیں پہنچا سکا، کیونکہ وہ اس سے گم ہوگئی تھی۔ مَیں نے بتایا کہ مَیں نے دوسری بار بھی اسے اپنا نام لکھ کر دیا تھا۔ اب وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ مفتی صاحب نے حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے چلا جائے اور کل سے اس کی ڈیوٹی یہاں نہیں ہوگی۔ پھر مفتی صاحب نے مزید کہا: "آپ کا یہ فرمان تو درست ثابت نہیں ہوا کہ مَیں شریف لوگوں کو وقت دے کر دوسرے لوگوں سے ملتا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا، تو پھر بھی اپنے آپ کو شریف اور دوسرے لوگوں کو "بدمعاش" تصور کرنا کوئی شریفانہ سوچ نہیں۔ یہ لوگ گواہ ہیں کہ مَیں نے عشا کی نماز نہیں ادا کی ہے۔ آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ مَیں نے ابھی تک نماز ادا نہیں کی۔ جہاں تک ایمانی فراست کی بات ہے، تو مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ مَیں بہت گنہگار آدمی ہوں۔ اگر بفرضِ محال میری جگہ کوئی اَور آدمی یہاں بیٹھا ہو اور وہ آپ کی طرح صاحبِ فراست بزرگ ہو، وہ اپنی فراست سے کسی کے بارے میں معلوم بھی کرلے کہ فلاں ظالم ہے، اس نے آپ کے ساتھ ظلم کیا ہے، تو وہ اپنی فراست کو بنیاد بنا کر اسے سزا نہیں دے گا۔ اس کو سزا دلوانے کے لیے آپ کو دلائل سے اس کا ظالم ہونا ثابت کرنا ہوگا۔ جب تک آپ اس کو برسرِعام ظالم ثابت نہیں کردیں گے، اس پر سزا جاری نہیں ہوسکتی۔ یہ مسئلہ تو ابتدائی دینی کتابیں پڑھنے والے طالب علم بھی جانتے ہیں۔ آپ تو ماشاءاللہ قاری ہیں، عالم ہیں، آپ کی اس مسئلے کے بارے میں اتنی ناقص اور ادھوری معلومات ہیں۔ اگر آپ صوبہ سرحد میں کسی سرکاری محکمے کے ملازم ہوتے اور آپ کے ذمے دینی امور ہوتے، تو مَیں آپ کو اسی وقت اس ذمہ داری سے معزول کردیتا، کیونکہ آپ کی دینی معلومات ناکافی ہیں ___ اور آپ کی آخری بات کہ آپ قیامت کے روز میرا گریبان پکڑیں گے، اتنی دیر انتظار کی ضرورت نہیں، یہ لیجیے میرا گریبان حاضر ہے۔" یہ کہہ کر وہ میرے کچھ اور قریب آگئے۔

مَیں شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا۔ مَیں نے غصے میں اتنا کچھ کہہ دیا تھا کہ اب مجھے خود بھی یاد نہیں تھا، لیکن مفتی صاحب کے چہرے پر اب بھی ناگواری کے اثرات نہیں تھے۔ وہ معمول کے مطابق دھیمے انداز میں تمام باتیں کر رہے تھے اور مَیں زمین میں گڑا جارہا تھا۔ مَیں نے ہمت کرکے کہا:

www.tezpakistan.com

"مفتی صاحب! خدا کے لیے مجھے مزید شرمندہ نہ کیجیے۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ کئی گھنٹے انتظار کے بعد غصہ آنا قدرتی بات ہے اور غصے کا اظہار بھی تو اسی لیے ہو گیا ہے کہ ہم آپ کو اپنا سربراہ ہی نہیں، باپ بھی سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو نہ اس کی ملاقات کے لیے اتنا انتظار ہوتا اور نہ اس سے شکوہ شکایت کرنے کی گنجائش ہوتی۔ یہ شکوے اور شکایات بھی ہماری آپ سے دلی محبت کی دلیل ہیں۔"

میری بات سُن کر مفتی آبدیدہ ہو گئے اور پھر ارشاد فرمایا: "قاری صاحب! یہ دنیا کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ لوگ اس کی طرف پاگلوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ جب کوئی مولوی میرے پاس دنیاوی کام لے کر آتا ہے، تو میرا دل چاہتا ہے میں اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں۔ یہ دنیا کی لعنت دنیا والوں کے لیے ہی رہنے دیں، تو اچھا ہے، اور جب کوئی مولوی لوگوں کے مسائل لے کر آتا ہے، تو مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آپ علاقائی مسائل لے کر آئے ہیں، تو مجھے خوشی ہے۔ فرمائیے۔ میں ابھی سنوں گا اور میرے بس میں جو ہوا وہ ضرور کروں گا۔ میں قیامت سے ڈرتا ہوں۔ وہاں کی باز پُرس میں کون کامیاب ہو سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ اللہ اپنا کرم کر دے، تو خیر! ورنہ ہمارے پاس کیا ہے جو لے کر جائیں گے؟"

میں نے لاکھ چاہا کہ صبح بات کی جائے، لیکن مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ صبح تک زندگی کی کیا ضمانت ہے؟ میں کم از کم آج کی بات آج ہی سنوں گا اور اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو گا وہ ہو گا۔ بہر حال میں نے انہیں اپنے مسائل سے آگاہ کیا۔ رات کٹ گئی۔ صبح تک باتوں میں مشغول رہے۔ ہمارے مسائل جو اُن کے دائرۂ کار میں تھے، وہ اس حد تک تو درست ہوئے کہ مقامی انتظامیہ سیدھے منہ بات کرنے لگی، لیکن ایک بگڑے ہوئے ڈھانچے کو راتوں رات ٹھیک کرنا مفتی صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔

مفتی صاحب سے اس سے پہلے بھی بارہا باتیں ہوئیں، سخت بھی، گرم بھی، لیکن اس روز جو کچھ ہوا، وہ مجھے آج بھی ذرا ذرا یاد ہے۔ خلافتِ راشدہ کا دَور واپس نہیں آسکتا، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ خوفِ خدا رکھنے والے لوگ اس نظام کو دل و جان سے چاہنے والے لوگ اگر کسی بڑے منصب پر چلے جائیں، تو وہ اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے سامنے جواب دِہ سمجھتے ہیں۔ مفتی صاحب کو جو کچھ میں نے کہا وہ کوئی وزیرِ اعلیٰ تو رہا ایک طرف، کوئی معمولی آدمی بھی سُن کر آپے سے باہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، لیکن آفرین ہے مفتی محمود کو کہ وہ یہ سب کچھ سنتے تھے، اپنے آپ کو لوگوں کا خادم سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں خدا کا خوف تھا، آخرت کا ڈر تھا۔ میں نے بڑے بڑے بُردبار لوگوں کو دیکھا ہے، لیکن اس قدر بُردبار آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا جو با اختیار بھی ہو اور بردبار بھی — پھر میں یہ سُن کر حیرت میں ڈوب گیا کہ مفتی صاحب کی یہ تیسری رات ہے جو آرام کیے بغیر گزر گئی ہے۔ وہ پہلی دو راتیں بھی لوگوں کے مسائل سننے میں گزار چکے ہیں۔

ان کی سیاست سے ہمیں اختلاف تھا۔ ان کی بعض باتیں ہمارے سیاسی نظریات کے سخت خلاف تھیں، لیکن ان کا کردار ایک مومن کا کردار تھا۔ ان کا یہ کردار مثالی تھا۔ وہ اس کے آئینے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آتے تھے۔ میں نے صبح رخصت ہونے سے پہلے ان سے معذرت چاہی، تو کہنے لگے: آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، میں اس سے خوش ہوں۔ یہ آپ کا حق تھا۔ جب تک دنیا میں راستباز زبانیں موجود رہیں گی، عدل و انصاف کے وجود کو کوئی خطرہ نہیں اور جب ان زبانوں کو روک دیا جائے گا، دنیا ظلم کا گہوارہ بن جائے گی — کاش! اسلام کا یہ سپاہی کچھ دیر مزید کام کر سکتا۔ کاش! اسلام کا یہ جاں باز کچھ دیر اور زندہ رہتا، مگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہم اس کے وجود سے محروم

فتح الملہم شرح صحیح مُسلم

اور دیگر عُلمائے دیوبند کی مُستند کُتب

بازار سے بار عایت — ہم سے طلب فرمائیں

اسلامی کتب خانہ عقب جامع مسجد علامہ بنوری ٹاؤن۔ کراچی ۵ پاکستان

www.tezpakistan.com

ہو جائیں. وہ نیکی ہم سے دُور چلی جائے، وہ روشنی کا مینار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جائے اور آفتاب کی وہ کرن قیامت تک کے لیے موت کی بدلیوں میں چھُپ جائے. انا للہ وانا الیہ راجعون.

قاری سعید الرحمٰن (راولپنڈی)

مدینہ منوّرہ میں ایک بزرگ نے حضورؐ کا پیغام مفتی صاحب کو پہنچایا

مفتی صاحب کو علمِ دین کے مختلف پہلوؤں پر پُورا عبور تھا. حدیث، تفسیر، فقہ پر اُن کی گہری نظر تھی. مشہور دینی درس گاہ قاسم العلوم ملتان میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے اور وہاں حدیث کی بڑی کتابوں، بخاری شریف، ترمذی شریف کا بڑے عرصے تک درس دیتے رہے. آپ کو فقہ سے خصوصی لگاؤ تھا اور ہزاروں فتاوے آپ کے قلم سے نکل کر مُلک کے طول و عرض میں پھیلے. علوم کا سطحی علم رکھنے والے افراد تو بہت ہوتے ہیں لیکن گہرائی اور عمق رکھنے والی شخصیتیں اس دَور میں بہت کم رہی ہیں. مفتی صاحب کی شخصیت خصوصاً فقہ اور افتاء کے معاملے میں امتیازی حیثیت کی مالک تھی. جدید مسائل اور نت نئے پیدا ہونے والے معاملات میں مفتی صاحب کی رائے بڑی وزنی اور گہری ہوتی تھی. بارہا مجھے ایسی مجالس میں شرکت کا موقع مِلا جہاں بڑے بڑے علماء موجود ہوتے تھے. جدید مسائل پر مفتی صاحب قوتِ استدلال سے اپنی بات منوا لیتے. حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کی حیات میں جدید فقہی مسائل اور احکام پر شرعی نقطہ نظر سے غور کرنے کے لیے چیدہ چیدہ جیّد علماء کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا تھا جس کے روحِ رواں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ، مولانا یوسف بنوریؒ اور حضرت مفتی محمودؒ صاحب تھے. عام طور پر کراچی میں یہ علمی مجالس منعقد ہُوا کرتی تھیں، جن میں کراچی کے دیگر حضراتِ علماء اور مفتیانِ کرام بھی شریک ہوتے. ان مجالس میں مباحث کے دوران مفتی صاحب کی فقہ میں گہرائی کا اندازہ ہوتا تھا. کئی بار ان کے ساتھ سعودی عرب، کویت، دوبئی، ابوظہبی اور جنوبی افریقہ تک سفر کا موقع مِلا. ان ممالک کے جیّد علماء سے مفتی صاحب کی علمی مباحث پر گفتگو ہوتی تھی، وہ حضرات بھی مفتی صاحب کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرتے. ان میں امامِ حرم شیخ عبداللہ بن سبیل، مکّہ مکرمہ کے مشہور عالمِ دین محمد مالکی مکّی، ابوظہبی کے رئیس القضا محمد بن عبدالعزیز المبارک، قطر کے شیخ عبداللہ الانصاری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں.

تقریباً ۱۵ سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے، جب بھی مفتی صاحب راولپنڈی تشریف لاتے اُن کا قیام جامعہ اسلامیہ میں ہی ہوتا. کبھی کبھی یہ قیام کئی کئی مہینے بھی رہا. مفتی صاحب ایک ایسے انتھک انسان تھے کہ مسلسل بھاری بھرکم مجالس میں شرکت، سیاسی مباحث، احباب سے مُلاقاتوں پریس کانفرنسوں، عوامی اجتماعات اور جلسوں میں خطابات کے باوجود بھی اُن میں چڑچڑاپن، اضمحلال، کمزوری کے آثار کبھی نہیں پائے جاتے تھے.

www.tezpakistan.com

وہ ہر آنے والے سے بڑے ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ملتے۔ اجتماعی اور انفرادی مسائل کے حل اور اس سلسلے میں گفتگوئیں اور دور و نزدیک کے علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کی شکایت سننا اُن کے عمومی پروگرام ہوتے۔ آپ کے ہاں امیر غریب کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ غریب بھی اُسی عزت و وقار کا اہل ہوتا جیسا کہ کوئی امیر آدمی، حتیٰ کہ غیر مسلم وفود بھی جب مُلاقات کے لیے حاضر ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے جیسا کہ آپؐ نے نجران کے عیسائی وفد کے ساتھ سلوک کیا تھا — ان سے بہتر سے بہتر طور پر پیش آتے۔ ہر بات غور سے سُنتے اور اُن کے مسائل کے حل کے لیے جو کچھ اُن سے ہو سکتا تھا، کرتے۔ طلبہ دینی مدارس کے ہوں یا کالج کے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور راہنمائی حاصل کرتے۔

وہ اعلیٰ سرکاری ملازم جو یحییٰ، بھٹو کے دَور میں الگ ہوئے آپ کے پاس حاضر ہوتے۔ آپ اُن کے معاملات کے سلسلے میں حتی الامکان تعاون فرماتے۔

مفتی صاحب عام طور پر رات کو دیر سے سوتے تھے، کبھی کبھی دو اڑھائی بج جاتے، لیکن صبح سویرے تہجّد کے وقت ضرور اُٹھتے اور اپنے معمولات پُورے کرتے اور بعد نمازِ فجر تھوڑی دیر کے لیے آرام فرماتے۔ جب بھی کسی تقریب یا دعوت میں جاتے تو وہاں سب سے پہلے نماز کا اہتمام فرماتے اور اس کے بعد پروگرام وغیرہ میں شرکت کرتے۔

مفتی صاحب کو سیاسی معاملات میں خداداد بصیرت حاصل تھی۔ انہیں سیاسی مجالس یا میٹنگز میں شرکت کے لیے کسی تیاری وغیرہ کی ضرورت نہ ہوتی۔ سیاسی مسائل کو بڑی بصیرت سے حل فرماتے۔ پاکستان قومی اتحاد نے بھٹو حکومت کے ساتھ مذاکرات کے لیے جو ٹیم مقرر کی تھی، اُس کی قیادت بھی ان کے ذمے تھی۔ مُلک اُس وقت ایک نازک دَور سے گزر رہا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت اور کردار سے مذاکرات کے دوران قوم کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کیا۔ مایوس کُن حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ اُن کے عزائم ہمیشہ بلند رہتے۔ سیاسی اُمور میں ہمیشہ جمہوری ذہن سے سوچتے تھے اور اس مُلک میں اسلامی اقدار کے نفاذ کے ساتھ ساتھ جمہوری عمل اور جمہوری اداروں کو پھلتا پھُولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کا خیال تھا سیاسی عمل کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد قوم کے سیاسی شعور میں خود بخود پختگی آجائے گی۔

ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاسی اُمور پر مفتی صاحب کی گہری نظر تھی۔ بیرونِ مُلک دَوروں کے دوران یہ بات محسوس ہُوئی کہ مفتی صاحب کو وہاں کے حالات سے کماحقہٗ آگاہی ہوتی تھی، لیکن ان کی حب الوطنی کا کمال تھا کہ پاکستان میں حکومت سے اختلاف کے باوجود بیرونِ ملک اختلافی مسائل پر گفتگو نہ کرتے۔ ساؤتھ افریقہ کے دورے کے دوران ایک اخبار نویس نے مفتی صاحب سے انٹرویو کی گزارش کی، لیکن آپ نے اس بنا پر انکار کیا کہ ملکی معاملات کے بارے میں بیرونِ مُلک کوئی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ جوہنسبرگ کے ایئرپورٹ پر جہاز کی روانگی سے قبل بی بی سی، وائس آف امریکہ، رائٹر اور کئی دوسری بین الاقوامی نیوز ایجنسیوں کے نمائندے گفتگو کے لیے آئے۔ آپ نے اُن سے واضح طور پر کہہ دیا کہ مَیں پاکستان کے بارے میں کسی سوال کا جواب نہ دُوں گا، البتہ بین الاقوامی معاملات پر گفتگو کے لیے تیار ہوں۔ ساؤتھ افریقہ میں قیام کے دوران جب انہوں نے کالے گورے کی تفریق کو اس طرح واضح انداز میں دیکھا کہ کالے نہایت کسمپرسی کے عالم میں ہیں تو بڑا دُکھ ہُوا۔ اُس وقت کے وزیرِ اعظم کو جب پاکستان کی اس عظیم شخصیت کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ ساؤتھ افریقہ میں ہیں تو اُس نے مُلاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہاں کے میزبانوں نے اس کا انتظام بھی کر لیا تھا، لیکن جب مفتی صاحب نے اُن میزبانوں کو اپنے جذبات سے آگاہ کیا کہ مَیں اس مُلاقات میں سب سے پہلے نسلی تعصب پر اور گوروں کی طرف سے کالوں پر مظالم کے بارے میں گفتگو کروں گا، تو وہاں کے لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر یہ مُلاقات ہوگئی تو شاید آئندہ پاکستان کے عملے کے دوروں میں مشکلات پیش آئیں، چنانچہ مُلاقات کا یہ پروگرام ختم کر دیا گیا۔

مفتی محمود جب سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے، تو اس بلند عُہدے پر ہونے کے باوجود انتہائی سادگی کا مظاہرہ کیا۔ تکبّر اور رعونت آپ سے کوسوں دُور تھے۔ وزارتِ علیہ کے دوران آپ کے رہن سہن، طرزِ مُلاقات، اسلوبِ معاشرت میں ذرا برابر فرق نہ آیا۔ شاید مفتی صاحب واحد وزیرِ اعلیٰ تھے جو اپنی سرکاری مصروفیات کے باوجود سینکڑوں افراد سے روزانہ مُلاقات کرتے۔ مہمان نوازی کا بھی وہ انداز برقرار رہا جو پٹھانوں کی روایت میں شامل ہے۔

عام طور پر ہمارے مُلک میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ سیاست سرمایہ داروں اور امیروں کا کھیل ہے اور سیاسی کاموں کے سلسلے میں یہی لوگ لاکھوں روپیہ

www.tezpakistan.com

خرچ کر کے اپنی دکان چمکا سکتے ہیں، لیکن مفتی صاحب نے غریب گھرانے کا ایسا فرد ہونے کے باوجود جس نے ایک قریبی مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا ہو، سیاست میں حصہ لیا اور دیکھتے دیکھتے پیشہ ور سیاست دانوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور اُس کے بعد ۱۹۷۰ء کے ہنگامہ پرور دور میں جب پوری قوم روٹی، کپڑے اور مکان کے سیلاب میں بہہ رہی تھی، مفتی صاحب نے مسٹر بھٹو کو شکست دی اور جس کا آخری دم تک مسٹر بھٹو کو غم رہا۔ سیاست میں اُن کی کامیابی کے اسباب میں اُن کی غریب پروری، سادگی، خلوص، عام سیاسی لیڈروں کی منافقانہ چالوں سے الگ تھلگ ہو کر ظاہر و باطن کی یکسانیت تھی۔ ہمارے ہاں سیاست کاروبار کے لیے کی جاتی ہے۔ لوگ سیاسی عہدوں سے فائدہ اُٹھا کر لاکھوں میں کھیلنے لگتے ہیں، لیکن مفتی صاحب کی اس ملک میں شاید منفرد مثال ہو کہ جو اس قدر اُونچے مقام پر پہنچے، لیکن اُن کے رہنے کا مکان وہی رہا اور لباس وغیرہ میں بھی وہی سادگی قائم رہی۔

سیاست میں مفتی صاحب ہمیشہ اسلامی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے۔ ناجائز سفارش نہیں کرتے تھے۔ ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے کہ مفتی صاحب کے جاننے والے ایک مذہبی گھرانے کے دو صاحبزادگان آئے، جو بنک میں اپنی ملازمت کی ترقی کے لیے سفارش کرانا چاہتے تھے۔ مفتی صاحب اُن کا یہ عندیہ جان کر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا "میں نے کچھ اصول اپنائے ہوئے ہیں، اُن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ بنک کا کاروبار سُودی کاروبار ہے اس لیے بنک کی ملازمت کو جائز نہیں سمجھتا اور اُس کے لیے سفارش کرنے کا میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا، چاہے کوئی راضی ہو یا ناراض"۔

سیاست میں وہ اپنے اصولوں اور موقف پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ قومی اتحاد کی ۱۹۷۷ء کی تحریک کو وہ برِ صغیر کی بہت بڑی سیاسی تحریک سمجھتے تھے۔ اُس کی کامیابی کے لیے انہوں نے شب و روز ایک کر دیے تھے۔ ۵ جولائی کے انقلاب کے بعد جو نئے حالات پیش آئے اور کچھ جماعتوں نے قومی اتحاد سے علیحدگی کا انداز اختیار کیا تو اس پر بہت رنجیدہ ہوئے۔ فرماتے تھے: "قوم نے ہم پر اتحاد کی وجہ سے اعتماد کیا تھا۔ تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح سیاسی جماعتوں کا الگ الگ کام کرنا، قوم کے اعتماد اور اتحاد کو ٹھیس پہنچائے گا اور قوم ایسے لوگوں کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گی"۔

تعصب سے نفرت تھی۔ سیاسی میدان میں اُنہوں نے کبھی فرقہ وارانہ اختلافات کو اہمیت نہیں دی۔ مذہبی اختلافات کو وہ مُلک و قوم کے لیے نہایت خطرناک سمجھتے تھے، اس لیے اپنی تقریروں میں کبھی بھی اختلافی مباحث کو نہیں چھیڑتے تھے اور اپنے عقیدتمندوں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ جو لوگ مُلک میں مذہبی منافرت پھیلانے کی کوشش کرتے اُن کے لیے فرماتے: "یہ اُن کی کوتاہ نظری ہے۔ پاکستان جب بنایا گیا تھا تو مُسلمانوں میں کوئی مذہبی تفریق نہیں تھی، اور تحریکِ پاکستان میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ شریک تھے۔ اگر مذہبی اختلافات سامنے آتے تو پاکستان کبھی بھی نہ بن سکتا"۔

آپ فرماتے: "مُلک پر جب بھی کوئی کڑا وقت آیا تو قوم کے وسیع تر اتحاد کے ذریعے سے مسائل کا حل ہُوا۔ تحریکِ ختمِ نبوّت اور تحریکِ نظامِ مصطفےٰ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ جب تک مذہبی تفریق یا مسلکی اختلافات کو بالائے طاق نہیں رکھا جائے گا، مُلک ترقی نہیں کر سکے گا۔ بعض لوگ نُورِ بشر کے مسائل کے ذریعے عوام کے ذہنوں کو خراب کرتے ہیں۔ اُن کے بارے میں فرماتے، ان مسائل کے بارے میں قیامت کے روز نہیں پُوچھا جائے گا۔ مثال دیتے ہُوئے فرماتے کہ دیوبندی، بریلوی اختلافات کو پاکستان میں بُھلا دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ دیوبند اور بریلی ہندوستان میں رہ چکے ہیں یہاں ہم سب پاکستانی ہیں اور ہمیں یہاں اسی حیثیت سے رہنا چاہیے اور وسعتِ ذہنی اور فراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب کے اس بلند کردار کے بارے میں مجھے سردار عبدالقیوم صاحب کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں: "ہم مفتی صاحب کی اس لیے عزت نہیں کرتے کہ وہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے رہنے والے ہیں، یا صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں، ایک جماعت کے سربراہ ہیں یا یہ کہ وہ دیوبندی ہیں، بلکہ اس لیے عزت کرتے ہیں کہ وہ ایک غیر متعصب اور اتحادِ بین المسلمین کے علمبردار عالمِ دین ہیں"۔

افغانستان کے مسئلے میں مفتی صاحب کا نہایت واضح اور سخت موقف تھا۔ وہ رُوسی تسلط کو انتہائی جارحانہ اور ظالمانہ اقدام قرار دیتے تھے۔ افغان مجاہدین کی حمایت کے لیے انہوں نے اندرون اور بیرونِ مُلک دورے کیے۔ انتہائی بیماری اور ضعف کے باوجود دُور دراز علاقوں تک گئے۔ افغان مجاہدین کے لیڈروں سے ہمیشہ رابطہ رکھتے اور اُن کے درمیان اتحاد کے لیے کوشاں رہے۔ افغان لیڈر بھی اُن کے پاس مشورے کے لیے آتے رہتے۔ افغان لیڈروں میں اتحاد کے لیے کئی بار پشاور میں اُن کے مراکز میں گئے اور اُنہیں اتحاد کے لیے قائل کیا، بالآخر اُن کی یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہُوئیں، چاہے ظاہری طور پر اس اتحاد کا کریڈٹ کوئی اور لے، لیکن اس اتحاد میں مفتی صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔

www.tezpakistan.com

آخر میں میں ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جس سے مفتی صاحب نے اپنی زندگی میں بیان کرنے سے منع فرمایا تھا، لیکن اب اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں:

مدینہ منورہ میں ایک صاحبِ نسبت بزرگ نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مفتی صاحب کو ان الفاظ میں پیغامِ بشارت دیا گیا: "قل لہٗ منی السلام یتقوی باللہ ولا یقول الا الحق واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل"۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ میری طرف سے آپ کو سلام کہیں، ہر معاملہ میں اللہ سے قوت وطاقت کے طلب گار ہوں، ہمیشہ حق بات کہیں۔ اللہ تعالیٰ سچ اور حق کہتا ہے اور وہی صحیح راستہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

میں نے جب عرض کیا کہ حضرت، سفرنامے میں اس کو شائع کیا جائے۔ پہلے تو کچھ نہ کہا، جب ریاض جانے کے لیے مدینہ منورہ ایئرپورٹ کی طرف جارہے تھے، تو ازخود فرمایا کہ اس خواب کو مت لکھو، اس سے خودستائی کا پہلو نہ نکل آئے۔ صرف دو اور واقعات سُن لیجیے:

شیخ عبدالمحسن عباد جو سعودی عرب کے ایک ممتاز عالم اور اس وقت مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، جب مفتی صاحب یونیورسٹی کے دورے پر تشریف لے گئے، تو دورانِ گفتگو شیخ عبدالمحسن عباد نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا: "واللہ انا اشکرہٗ وکل مسلم یشکرہٗ۔ خدا کی قسم، میں مفتی صاحب کا شکرگزار ہوں اور ہر مسلمان کو ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔"

مفتی صاحب، جب امام مسجدِ نبوی شیخ عبدالعزیز صالح سے مُلاقات کے لیے تشریف لے گئے اور مفتی صاحب نے اُٹھنے کی اجازت چاہی، تو امام صاحب نے فرمایا: "واللہ ھذا المجلس لا یمل"۔ خدا کی قسم، اس مجلس سے دِل نہیں بھرتا، تشنگی باقی رہتی ہے۔"

عمر محمد فلاطہ، مدینہ یونیورسٹی کے سیکرٹری جنرل تھے، انہوں نے دورانِ مُلاقات کہا کہ میں آپ کو دیکھ کر اس لیے خوش ہورہا ہوں کہ آپ دین کے ایک بلند مقام پر فائز ہیں اور آپ نے دین وسیاست کو اکٹھا کرکے دکھایا ہے۔

اے ہمارے رب!
ہمیں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی طرح جینے
اور اُن کی طرح مَرنے کی توفیق عطا فرما!

برآمدات کا قدیم ترین ادارہ ——— جو

پاکستان

سے ایکسپورٹ کے ایک سو سال نہایت کامیابی سے پورے کرچکا ہے

قائم شدہ ۱۸۸۰ء

ایس۔ مُحکم دین مُحمد امین

S.MOHKAMDIN MOHAMED AMIN

PLOT NO. 56 KORANGI INDUSTRIAL AREA. SECTOR 7-A KARACHI-31 PAKISTAN
Telephones: 311840 - 311870 - 312650 Telex 25426 - AMIN PK Cable: MUSHTAQ KARACHI

NASIR

www.tezpakistan.com

ابرِ گوہر بار

www.tezpakistan.com

"انتخابات کا اصل مقصد مضبوط جمہوری حکومت کا قیام ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہم سیاسی قوّت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اقتدار کا حصُول اعلیٰ مقصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہمارا مقصد نظامِ مُصطفٰے کا قیام ہے۔ اِسی مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ نظامِ مُصطفٰے وہ نظامِ حیات ہے جو خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اِس پر عمل کر کے دکھایا ہے عوام کے مسائل کا حل نمائندہ حکومت کا قیام ہے اور جمہوریت کے قیام کا مقصد قانون کی بالادستی، عوام کی خوشحالی اور ہر قسم کے استحصال کا حقیقی خاتمہ ہے جمعیّۃ علماءِ اسلام ہر قسم کے استحصال سے پاک اسلامی نظام کی حامی ہے۔ حق تعالیٰ پاکستان کی سلامتی، ترقی اور اس کے باشندوں کو خوشحالی نصیب فرمائے اور اپنی رضا سے نوازے۔ آمین!"

(ایک تقریر سے اقتباس)

www.tezpakistan.com

مولانا محمد موسیٰ (جامعہ اشرفیہ، لاہور)

پھر باتیں نہ ایسی سُنیے گا

مَیں چھوٹا بچّہ تھا،
ان کے گھر میں رہتا تھا،
وہ اُس وقت مُراد آباد میں زیرِ تعلیم تھے

حضرت مفتی محمود صاحب نور اللہ قبرہٗ و اعلی اللہ درجاتہ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے اور شاید ہی کوئی خوبی ایسی ہوگی جو حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے عطا نہ فرمائی ہو۔

لاریب! ان کی شخصیت سدا یادگار رہے گی۔ اِس وقت اُن کی مَوت سے چمنستانِ اسلام اُجڑ گیا ہے، علما یتیم ہو گئے ہیں اور خصوصاً مَیں بہت زیادہ نڈھال ہو گیا ہوں کہ ان کے ساتھ ہمیشہ ہی بوقتِ ضرورت علمی بحث ہوتی تھی۔ مَیں اپنی مشکلات ان کے سامنے پیش کرتا تھا۔ مختلف علمی مباحث کے بارے میں ان سے سوالات کرتا تھا، متعدد مشکلات کا حل طلب کرتا تھا اور وہ ہمیشہ ہی شفقت و محبّت سے میرے سوالات کا جواب دیتے اور مشکلات کو حل کر دیتے تھے۔ ان کی باتیں بے شمار ہیں، ان کے سُنانے والے بھی بے شمار ہیں، ان کی زندگی کے مختلف گوشے مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور زندگی ایک کھُلی ہوئی کتاب کی طرح موجود ہے ؎

کچھ قمریوں کو یاد ہے کچھ بُلبُلوں کو حفظ　　عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

لیکن ان کے بارے میں جو مَیں جانتا ہوں شاید ہی کوئی اور جانتا ہو۔ مَیں بہت چھوٹا تھا جب ان کے گھر میں آیا، وہیں پلا بڑھا، ان کی نگرانی میں تربیت پائی، علم حاصل کیا، پھر جب مجھے انہوں نے اس قابل بنا دیا کہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث کوئی مسئلہ خود نہیں دیکھ سکتے، تو مجھ سے پُوچھ لیتے ہیں اور مَیں ہر وقت تیار رہتا ہوں کہ نہ جانے کس وقت انہیں کسی مسئلے پر دلائل دینے پڑیں۔ ٹھیک ایسے ہی وقت وہ مجھے اور اپنے بے شمار چاہنے والوں کو روتا دھوتا چھوڑ کر اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آج مَیں علمی باتیں اُن سے پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن وہ موجود نہیں اور ان کے بغیر میری باتوں کا جواب دینے والا اور کوئی نہیں ہے۔ ان کے بغیر وہ علمی مجلسیں بے رونق ہیں اور وہ مجمع العلوم و فنون شخصیت کہیں نہیں جس کے دم سے ہر قسم کی دینی و علمی مجلسیں آباد تھیں ؎

آہِ گلچینِ چمن یہ تجھ سے نادانی ہوئی　　پھُول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

شعر بس یونہی یاد آگیا، رُوئے سخن خدا کی طرف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ گلچیں سے نادانی ہو سکتی ہے، خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے، جو اسے

www.tezpakistan.com

منظور ہوتا ہے، وہی کرتا ہے، اس کی مرضی کے سامنے کسی کو دَم مارنے کی اجازت نہیں۔ موت پہلوں پر بھی آئی، آئندہ پیدا ہونے والوں پر بھی آئے گی۔ مفتی صاحب میرے شیخ تھے، ان پر بھی موت وارد ہوئی۔ مَیں نے زندگی کا طویل حصّہ ان کی صحبت میں گزار کر اُن سے فیض حاصل کیا۔ اس طویل دَور کی صحبت کے تین زمانے تھے۔

اوّل وہ زمانہ کہ مَیں چھوٹا بچہ تھا اور ان کے گھر ہی میں رہتا تھا۔ اس وقت مفتی صاحب جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں پڑھتے تھے تعطیلات کے دنوں میں گھر آتے تھے۔ مجھے ان کی طالب علمی کا زمانہ خواب کی طرح کچھ کچھ یاد ہے۔ ان کے بڑے بھائی خلیفہ احمد اور چھوٹے بھائی خلیفہ محمد میرے بہنوئی ہیں۔ خلیفہ احمد خانقاہ یٰسین زئی میں رہتے تھے۔ یہ مقام پنیالہ سے قریب تھا۔ میرے والد صاحب ملّا شیر محمد فوت ہو چکے تھے، انہوں نے فوت ہونے سے قبل میری اور میرے چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری مفتی صاحب کے والد صاحب اور ان کے خاندان کو سونپ دی تھی۔ کچھ تو وہ میری تربیت کے خیال سے مجھے اپنے گھر میں رکھنا چاہتے تھے اور کچھ اپنی ہمشیرہ کی وجہ سے میرا دل بھی چاہتا تھا کہ مَیں یہیں رہ کر تعلیم حاصل کروں؛ تاہم مَیں ایک دو ماہ والدہ کے پاس رہتا اور ایک دو ماہ مفتی صاحب کے گھر میں۔

ہمارے اور مفتی صاحب کے خاندان میں رشتہ داری اس طرح شروع ہوئی کہ ہمارے علاقے میں لڑکیوں کو پیسے لے کر بیاہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے والد صاحب غریب آدمی تھے، وہ پیسے دے کر لڑکیاں نہیں لے سکتے تھے اور نہ اسے درست سمجھتے تھے۔ ادھر میرے والد صاحب بھی پیسے لینا درست نہیں سمجھتے تھے اور لڑکیوں کے لیے اچھے رشتوں کے فکرمند تھے۔ مفتی صاحب کے والد مولانا محمد صدیق صاحب نے میرے والد صاحب سے اپنے بڑے لڑکے خلیفہ احمد کے لیے رشتہ مانگا۔ چونکہ میرے والد صاحب، صاحبِ کشف بزرگ تھے، انہوں نے مفتی صاحب کے والد صاحب سے کہا، مَیں رشتہ تو دینے کے لیے تیار ہُوں لیکن تمہارے دوسرے لڑکے محمود کے لیے۔ مولانا صدّیق صاحب نے کہا، بڑے لڑکے کی موجودگی میں چھوٹے کی شادی مناسب نہیں۔ والد صاحب کہتے تھے مولانا صدّیق صاحب کا بڑا لڑکا زیادہ عالم نہیں، اس نے بیماری کی وجہ سے درمیان ہی میں تعلیم چھوڑ دی تھی۔ اسی سوال جواب میں دو تین سال گزر گئے یا اس سے بھی زیادہ۔ میرے والد صاحب مفتی محمود سے بہت محبّت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ محمود کے چہرے پر مجھے عظمت، بلندی و ذکاوت اور علم کے بڑے آثار نظر آتے ہیں۔ بعد کے واقعات نے میرے والد صاحب کے اس کشف کی تصدیق کر دی، کیونکہ مفتی صاحب دنیا میں سیّد العلماء والاتقیاء بن کر چمکے۔ انہیں قدرت نے دینی جلالت کے ساتھ ساتھ دنیاوی عظمت بھی عطا فرمائی۔

میرے والد اور مفتی صاحب کے والد کے درمیان بات ہوئے تین سال گزر چکے تھے اور والد صاحب خلیفہ احمد کے لیے رشتہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ ان کو بیماری نے آلیا۔ اس بیماری میں جب انہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا، تو پھر انہوں نے یہ رشتہ منظور کر کے مفتی محمود صاحب کے والد کو وصیّت کی کہ میرے بچّوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری تم پر اور تمہارے بعد تمہارے خاندان پر ہو گی۔

مفتی صاحب جب مراد آباد سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تو کم از کم دو سال فارغ رہے۔ ان کی فراغت کے زمانے میں گھر کے مالی حالات بہت پریشان کُن تھے۔ ان کے بڑے بھائی بیمار تھے اور اہلِ خانہ پر اکثر فاقے گزرتے تھے۔ مفتی صاحب اس حالت سے سخت دل گرفتہ اور پریشان تھے۔ وہ اپنے گھر والوں پر گزرنے والے فاقے نہیں دیکھ سکتے تھے اور تدریس کے لیے کسی جگہ کے متلاشی تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ان کے پاس مرزائیوں کے قادیان سے آدمی پہنچے اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے چند بڑے لوگوں سے بھی سفارش کروائی کہ ہم ایک بہت بڑا دینی مدرسہ بنا چکے ہیں، اس میں ایک معقولی یعنی منطق و فلسفہ پڑھانے والے استاد کی ضرورت ہے۔ انہیں شاید مراد آباد وغیرہ سے مفتی صاحب کے معقولی ہونے کا علم ہو چکا تھا، اسی لیے وہ ان کے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب کو سَو روپے ماہانہ تنخواہ دینے کی پیشکش کی جو اس وقت کے حساب سے بہت زیادہ تنخواہ تھی اور بہت کم لوگ اتنی تنخواہ پاتے تھے، مگر مفتی صاحب نے اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی انتہائی غربت کے باوجود اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس پیشکش کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ مَیں مسلمانوں کے مقابلے میں مرزائیوں کو معقولی بناؤں۔ چند مخلص اور ہمدرد لوگوں اور دوستوں نے سمجھایا کہ ملازمت تو غیر مسلموں کی بھی درست ہے، آپ نے پیسے لینے ہیں اور تعلیم دینی ہے، کسی مسلمان کو تو مرزائی نہیں بنانا، پھر آپ کی مجبوری بھی ہے کہ آپ اس ملازمت کو قبول کر لیں، مگر مفتی صاحب انکار پر جمے

www.tezpakistan.com

رہے۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

بعد ازاں انہوں نے پہلی تدریسی مدرسہ عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں منظور کی اور ان کی تنخواہ یہاں دس روپے مقرر ہوئی اور تقریباً تین سال تک یہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح ان کا اور طلبا کا یہ پہلا تعارف ہوا۔ اس تین سالہ عرصے میں ان کی شہرت دُور دُور تک پھیلتی چلی گئی اور دُور دُور سے طلبا ان کے پاس آنے لگے۔ اس کے بعد مفتی صاحب اپنے پیر مولانا عبدالعزیز کے گاؤں "اباخیل" ضلع بنوں میں تشریف لے گئے۔ ان کے مشورے سے وہاں مدرسہ بنایا۔ پہلا مدرسہ مفتی صاحب کے جانے کے بعد اُجڑ گیا۔ پھر جس سال قحط پھیلا، تو مفتی صاحب اباخیل سے عبدالخیل آ گئے۔ اسی سال پاکستان بن گیا۔ قیام پاکستان کے وقت مفتی صاحب عبدالخیل آ کر امام مقرر ہوئے۔ ان کی یہاں کوئی تنخواہ نہیں تھی۔ سال کے بعد گندم وغیرہ رواجاً امام کو دی جاتی ہے، وہی ان کو بھی ملتی تھی، مگر وہ اس گندم کو طلبا پر خرچ کر دیتے اور خود جو کھانا میسّر آتا، وہی کھا لیتے۔ اس جگہ کو مفتی صاحب نے مستقل سکونت کے لیے منتخب کر لیا اور ہمیشہ کے لیے عبدالخیل کے ہو کر رہ گئے۔ مَیں ہر جگہ اور ہر حال میں ان کے ساتھ رہا، مگر بچہ تھا، ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سارے عرصے میں مفتی صاحب بڑے تنگدست اور پریشان حال رہے، اسی سال مَیں بڑی کتابیں پڑھنے کے لیے اکوڑہ خٹک چلا گیا۔ سال کے آخر میں چھٹیاں ہوئیں، تو مولانا غلام اللہ خاں کے دورۂ تفسیر میں شرکت کے لیے راولپنڈی آ گیا۔ اسی سال ایک مخالف گروہ کی طرف سے مولانا غلام اللہ خاں پر ایک زبردست منطقی سوال کیا گیا۔ مولانا غلام اللہ خاں نے وہ سوال طلبا کے سامنے پیش کر کے کہا: کوئی ایسا طالب علم موجود ہے جو اس سوال کا جواب دے، مولانا کے حلقۂ درس میں شامل لوگ عالم ہوتے تھے اور میری کتابیں ابھی مکمل نہیں ہوئی تھیں۔ مَیں طالب علم تھا، اس لیے چُپ رہا کہ کوئی اور بولے گا، مگر جب سب پڑھنے والے خاموش رہے، تو مولانا کہنے لگے اگر تم نہیں بتا سکتے، تو اقرار کرو، مَیں تم کو بتا دوں گا۔ سب نے کہا ہم یہ سوال حل نہیں کر سکتے، لیکن مَیں نے مولانا سے کہا، مَیں آپ کو کل اس کا تحریری جواب دُوں گا۔ مولانا میری جسارت پر بڑے خوش ہُوئے۔ دوسرے روز مَیں نے عربی میں جواب تحریر کر کے مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولانا فرمانے لگے: "واللہ، یہ لڑکا بڑا منطقی ہے، میرے ذہن میں اس سوال کا جو جواب تھا، یہ اُس سے بھی خوبصورت اور زوردار جواب ہے اور اس نے اسے عربی میں لکھا ہے"۔

اس کے بعد مولانا ہر سال یہ سوال دُہراتے اور جواب سناتے تھے۔ ایک روز مولانا نے کسی سے تذکرہ کیا کہ انہیں مدرسے میں ایک استاد کی ضرورت ہے۔ مَیں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے مفتی صاحب کا نام پیش کیا۔ مولانا غلام اللہ خاں فوراً راضی ہو گئے۔ انہوں نے کہا تم بڑے منطقی ہو، تمہارا اُستاد یقیناً قابل آدمی ہو گا۔ میرے خط پر مفتی صاحب تشریف لائے۔ وہ پڑھانے پر راضی تھے، لیکن دیگر معاملات طے نہ ہو سکے، اس لیے مفتی صاحب کو ان کے یہاں تدریس کرنے کا موقع نہ ملا۔

دوسرے سال جب مَیں تعطیلات گزارنے گھر گیا، تو مفتی صاحب نے دوبارہ جگہ کی تلاش کے لیے کہا۔ اس سال مَیں مدرسہ قاسم العلوم میں داخلے کے لیے گیا۔ چونکہ ابتدائی کتابیں مَیں نے مفتی صاحب سے پڑھی تھیں، وہ مجھے ساری کی ساری زبانی یاد تھیں۔ فراغت کے بعد پہلے سال مفتی صاحب ماہ رمضان میں اعتکاف میں بیٹھے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اعتکاف کے دوران عربی میں فن تجوید پر ایک رسالہ بھی لکھا۔ اس کا نام تھا "التسہیل فی التجوید والترتیل" وہ بھی مَیں نے ان سے سبقاً پڑھ لیا تھا اور مجھے اب تک یاد تھا؛ چنانچہ مَیں نے قاسم العلوم میں داخلے کا امتحان صدراً، حمداللہ اور خیالی جیسی مشکل کتابوں میں زبانی امتحان دیا ــــ ممتحن نے حیران ہو کر قاسم العلوم کے صدر اُستاد مولانا عبدالخالق کو بتایا کہ ایک پٹھان لڑکا آیا ہے جسے سب کتابیں زبانی یاد ہیں۔ اسباق شروع ہوئے، تو معلوم ہُوا کہ اس مدرسے میں ایک اُستاد کی ضرورت ہے۔ بہت سے طلبا نے اپنے اساتذہ کے نام پیش کیے۔ مَیں نے اپنے شیخ مفتی محمود کا نام پیش کیا جن کو ہم مولوی محمود کہتے تھے، کیونکہ اس وقت تک وہ مفتی نہیں تھے، چونکہ استاد اور صدر مدرس مولانا عبدالخالق میری ذہانت و لیاقت کے بہت معترف ہو گئے تھے، اس لیے وہ کہنے لگے اس کا اُستاد یقیناً قابل آدمی ہو گا۔ انہوں نے مولوی محمود کے نام خط لکھا جو مجھے ہی دے دیا۔ مَیں نے اپنے خط کے ساتھ ایک ہی لفافے میں دونوں خط روانہ کر دیے۔ مولوی محمود صاحب میرے اور مدرسے کے خط پر ملتان آ گئے۔ اس وقت ان کی تنخواہ ستر یا اسّی روپے مقرر ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے، مدرسے میں مجھے ان کا معتمد اور مشیر سمجھا

www.tezpakistan.com

جاتا تھا۔ ان کی تنخواہ بھی مَیں خود وصول کر کے انہیں دیتا تھا۔

کچھ عرصے بعد مولانا عبدالخالق نے فتوے کا کام بھی انہی کو سونپ دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کی شہرت ہو گئی اور ابتدائے سال ہی سے طلبا کی کوشش ہوتی کہ ان کی کتابیں مفتی صاحب کو دی جائیں۔ انہوں نے تدریس اور افتاء کا کام ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ اس طرح چند سال تک وہ مولوی محمود، پھر مولوی اور مفتی محمود رہے۔ بعد ازاں مفتی محمود رہ گئے۔ اب رہا یہ معاملہ کہ بحیثیتِ اُستاد وہ کیسے تھے، تو اس سلسلے میں یہ بات مَیں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مَیں نے اپنے شیوخ میں کسی کو اتنا ذہین نہیں پایا۔ وہ جتنے سیاست میں اعلیٰ تھے، اتنے ہی ذہانت میں بلند اور درس و تدریس میں بھی ارفع تھے۔ مدرسے میں جن اساتذہ کے پاس ہیں کتاب کے مشکل مقامات سمجھ نہیں آتے تھے، ہم وہ مفتی محمود کے پاس جا کر حل کر لیتے تھے۔ لیکن ان کی علمی اور سیاسی لیاقت میں ایک فرق تھا۔ وہ جس قدر ذہانت کا استعمال سیاست میں کرتے تھے اس قدر علمی دنیا کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی؛ چنانچہ ہم نے انہیں بہت کم مطالعہ کرتے دیکھا ہے۔ اکثر اوقات وہ بیٹھے رہتے اور طلبا اُن سے بحث کرتے رہتے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ اپنے عہد میں دُنیا بھر کے ذہین لوگوں میں سے ایک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو ذہانت و لیاقت دی تھی، وہ درس و تدریس کے لیے نہیں، بلکہ سیاسی طور پر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے دی تھی۔ میرے نزدیک ان کا علم ان کی سیاسی عظمت اور اسلامی خدمات کی تمہید تھا۔ اگر ان کا علمی مقام اتنا بلند نہ ہوتا تو شاید اتنے بلند پایہ سیاستدان نہ بن سکتے۔ بہت سے لوگ تمنا کرتے تھے، وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دیں، لیکن وہ پیدائشی طور پر سیاستدان تھے، ان کو خدا نے سیاست کے لیے پیدا کیا تھا۔ ان کی علمی مصروفیات قدرت نے ان کی تسکین کے لیے پیدا کر رکھی تھیں۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ عرب ممالک میں عرب علما ہم سے سوال کرتے کہ مفتی صاحب کی تصنیفات کتنی ہیں؟ جب ہم جواب دیتے کہ ان کی ایک تصنیف بھی نہیں، تو وہ حیران سے ہو جاتے، کیونکہ اہلِ عرب کے نزدیک بڑا عالم وہ ہوتا ہے جو کثیر التصانیف ہو۔ ان کے نزدیک بڑے عالم کے لیے کثیر التصانیف ہونا ضروری ہے۔ گزشتہ سال جب مفتی محمود عرب ریاستوں کے دورے پر گئے، تو ایک ریاست میں قاضی القضاۃ اور دیگر بڑے بڑے علما جمع تھے۔ وہاں مفتی صاحب نے جو تقریر کی اُسے سن کر قاضی القضاۃ کہنے لگے: "واقعی پاکستان میں بھی بڑے علما بلکہ ہم سے بھی بڑے علما موجود ہیں"۔ پھر انہوں نے کہا کہ مَیں نے پاکستانی علما میں شیخ موسیٰ کی بہت سی کتب دیکھی ہیں، ان جیسے علما عرب میں بھی موجود نہیں۔ اِس موقع پر مفتی صاحب کے ایک ساتھی مولوی محمد یٰسین سے رہا نہ گیا اور وہ بول پڑے کہ شیخ، آپ جس شیخ موسیٰ کو عربوں پر فوقیت دیتے ہیں، جانتے بھی ہیں کہ وہ کون ہیں؟ وہ شیخ موسیٰ، مفتی محمود کے تلمیذ ہیں اور اس نے فنون کی تمام کتابیں مفتی محمود صاحب سے پڑھی ہیں۔ آپ کو شیخ موسیٰ کے علم سے مفتی محمود کے علم کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔" قاضی القضاۃ نے مفتی صاحب سے پوچھا: "آپ نے تصنیفات کی طرف کیوں نہیں توجہ دی"؟ مفتی صاحب نے فرمایا: "میری ایک تصنیف شیخ موسیٰ کو تو آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اگر اس قسم کی دو چار کتابیں اور پڑھ لیں، تو آپ کو یہ سوال مجھ سے پُوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی۔" اس پر تمام حضرات ہنس پڑے۔

ایک دفعہ طالب علمی کے زمانے میں مفتی صاحب سے مَیں نے استدعا کی کہ وہ مشکوٰۃ کی شرح لکھ دیں۔ اس پر فرمایا: "بھئی عجیب آدمی ہو، مجھے کونین نہیں ملتی اور تم مشکوٰۃ کی شرح کی باتیں کرتے ہو"۔ مفتی صاحب کو اس وقت بہت بخار اور نزلہ تھا، وہ اس وقت کونین کے متلاشی تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی شاگرد آئے، تو کونین منگوا لیں۔ جب مَیں آیا، تو مَیں نے آتے ہی مشکوٰۃ کی شرح لکھنے کا مطالبہ کر دیا۔ اس پر مفتی صاحب نے مذکورہ جملہ ارشاد فرمایا۔ مَیں نے اس جُملے کو ضرب المثل بنا دیا، مگر یہ محاورہ میرے اور مفتی صاحب کے درمیان ہوتا تھا، کوئی دوسرا اسے نہیں سمجھتا تھا۔ کبھی مجلس میں کسی بڑی چیز کے حصول کا ذکر آتا، تو مَیں کہتا: "بھئی، مفتی صاحب، آپ بھی عجیب آدمی ہیں، ہمیں کونین نہیں ملتی اور آپ یہ باتیں کرتے ہیں"۔ مفتی صاحب سمجھ کر ہنس پڑتے اور انہیں ماضی کی بھُولی بسری باتیں یاد آ جاتیں۔

میرے شیخ مفتی محمود سیاست و علم دونوں میں عظیم تھے، لیکن مَیں ان کی علمی شان سے متاثر تھا۔ سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اس بات میں بھی ان کا حکم موجود تھا۔ انہوں نے مجھے علم کے لیے وقف ہونے کا حکم دیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا "سیاست میری جان نہیں چھوڑتی، تم کبھی بھُول کر بھی اس کے قریب نہ آنا۔ ان کا حافظہ بڑے غضب کا تھا، وہ خود سناتے تھے کہ مراد آباد میں جب مَیں حمد اللہ کے پرچے میں امتحان

www.tezpakistan.com

دینے کے لیے امتحان گاہ میں بیٹھا، تو ممتحن سے کہہ دیا کہ وہ میری تلاشی لے لے، میرے پاس کوئی کتاب نہیں اور تلاشی اس لیے دے رہا ہوں کہ حمداللہ کا متن اور حاشیہ دونوں مجھے یاد ہیں کہیں بعد میں آپ یہ نہ کہہ دیں کہ اس طالب علم نے کتاب سے نقل کیا ہے۔ مفتی صاحب کو مَیں نے گھر میں مطالعہ کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ مراد آباد کے بارے میں وہ خود بتاتے تھے "مَیں اپنے زمانۂ طالب علمی میں زیادہ محنت نہیں کرتا تھا، امتحان سے کچھ روز پہلے محنت شروع کر دیتا تھا اور اسی محنت سے اچھے نمبروں میں پاس ہو جاتا تھا۔"

کوئی سیاسی یا مذہبی آدمی نہیں بتا سکتا کہ مفتی صاحب نے کبھی کسی تقریر میں کوئی شعر پڑھا ہو۔ مجھے اشعار بہت یاد تھے اور مجھ سے اشعار سُن کر وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ موسیٰ خان، مجھے اشعار یاد کرنے کا بہت شوق ہے، لیکن مجھے کوئی شعر یاد رہتا ہی نہیں، اس معاملے میں میرا حافظہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ بعض اشعار تو بہت ہی اچھے ہوتے ہیں اور معمولی سی بات شعر سے خوبصورت ہو جاتی ہے۔ گو مجھے یاد کرنے کے باوجود شعر یاد نہیں ہوتا، جو یاد ہوتا ہے ایک آدھ روز کے بعد بھول جاتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں مجھ میں یہ ایک کمی ہے اور بہت بڑی کمی ہے۔ مَیں جواباً انہیں کہتا تھا شعر، علم اور علما کی شان کے خلاف ہیں، اس لیے آپ کو یاد نہیں رہتے۔ علم اور شعر میں کوئی مناسبت نہیں۔ اِس پر وہ کہتے: نہیں ایسی بات نہیں، اچھے شعر بھی ہوتے ہیں جو یاد ہوں اور برمحل سنائے جا سکیں، تو بات کی شان ہی اور ہو جاتی ہے۔ مَیں اپنے موقف کے حق میں عربی کے مشہور شاعر لبید کا یہ شعر سُنا کر انہیں خاموش کر دیتا ؎

لوکان الشعر بالعلماء یزری   لکنت الیوم اشعر من لبیدی

دورانِ تعلیم مفتی صاحب کا اپنے تلامذہ سے سلوک صرف ایک سخت گیر استاد کا نہیں، بلکہ ایک شفیق باپ کا سا ہوتا تھا۔ ان کا رویّہ طلبا کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ ہم ان کا بیحد احترام کرتے تھے، لیکن وہ ہمارے ساتھ ایک دوست کی طرح گھُل مل کر باتیں کرتے تھے۔ بسا اوقات تو طالب علم ضرورت سے زیادہ شوخیاں دکھاتے اور کبھی کبھار مذاق بھی کرتے، مگر وہ طلبہ کی ایسی شوخیوں سے ناراض نہ ہوتے تھے۔ مَیں انہیں اپنی جگہ کہتا آپ طلبہ کو اپنے ساتھ اتنا بے تکلف نہ ہونے دیں۔ اس پر مفتی صاحب کہتے "ان غریبوں کا اور کون ہے جس سے وہ مذاق کریں گے، امرا کے بچے ہوتے، تو دُنیا کی ہر نعمت میسر ہوتی اور عیش کر رہے ہوتے۔ لیکن دین پڑھنے والے بالعموم غربا کے بچے ہوتے ہیں، گھروں سے دُور پردیس میں آ کر خدا کا دین پڑھتے ہیں۔ اگر ہم بھی ان کے لیے جلاد بن جائیں تو ان کی زندگی میں محرومیوں کے سوا اور کچھ نہیں رہے گا۔"

ایک روز ایسا بھی ہوا کہ طلبا کے بارے میں اتنا نرم رویّہ رکھنے کے باوجود مفتی صاحب مذاق کرنے پر طلبا سے ناراض ہو گئے، ہم انہیں منانے کے لیے سب جمع ہو کر گئے، مگر وہ نہ مانے۔ ہم نے بڑی کوشش کی اور بڑی منت سماجت کی، لیکن انہیں بہت غصّہ آ گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم نے ان کو اس قدر غضب ناک ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے ساتھ کوئٹہ کا ایک طالب علم عبداللہ جان بھی تھا جو مفتی صاحب کا رشتے دار تھا اور مذاق کرنے میں پیش پیش رہتا تھا۔ ہم نے اس سے کہا تم ہی مفتی صاحب کو راضی کرنے کے لیے کوئی ترکیب سوچو، ورنہ کم از کم ایک دو روز اسباق میں بدمزگی رہے گی۔ وہ کہنے لگا فکر نہ کرو، مَیں نہ صرف انہیں راضی کروں گا، بلکہ ابھی ابھی انہیں ہنسانے کا بھی بندوبست کر لیتا ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ ایک بار پھر مفتی صاحب کی خدمت میں گیا۔ خود ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کہے گا۔ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں مفتی صاحب زیادہ ناراض نہ ہو جائیں۔ عبداللہ جان انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولا: "مفتی صاحب! آپ ہم غریبوں کو کیوں تنگ کرتے ہیں، یا تو آپ ٹھیک ہو جائیں، ورنہ ہم ابھی ریلوے اسٹیشن پر جا کر بابو سے کہیں گے یہ شخص ٹکٹ تو ایک آدمی کی لیتا ہے اور جگہ دو تین آدمیوں کی گھیرتا ہے۔" بس پھر کیا تھا، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ وہ پھر بولا: "آپ کتنے بڑے آدمی ہیں، نہ علم کا حساب ہے نہ جسم کا۔ کل مَیں نے آپ کا واسکٹ پہنا، تو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے چھوٹے بچے نے دادا کا کوٹ پہن لیا ہو۔" مفتی صاحب پہلی ہی بات پر ہنس پڑے تھے، اب ہنستے ہنستے ان کے آنسو نکل آئے اور وقتی طور پر جو ناراضی ان کے دل میں ہنسی مذاق سے پیدا ہوئی تھی، وہ ہنسی مذاق ہی سے ختم ہو گئی۔

مفتی صاحب عجیب استاد تھے۔ ان کی اپنے شاگردوں کے ساتھ شفقت و مروّت کی داستان بہت طویل ہے۔ ذہین اور لائق طالب علم کی بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ جب مَیں طالب علمی کے زمانے میں ان کے گاؤں میں کتابیں پڑھتا تھا، اس زمانے میں وہ مجھے غیر محسوس طور پر پڑھانے کی تربیت دے رہے تھے۔ کتابیں زیادہ ہوتیں، تو وہ کئی طلبا میرے پاس پڑھنے کے لیے بھیج دیتے اور ان کے سامنے میرے طریقِ تدریس

www.tezpakistan.com

کی تعریف کرکے ان میں بھی یہ جذبہ پیدا کرتے کہ وہ بھی طالب علمی کے زمانے ہی میں کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کی مشق کریں۔ ان کے شاگرد ایک ہی وقت میں معلم بھی ہوتے اور متعلم بھی۔

جب میں کتابوں کی تکمیل کے بعد کوئٹہ کے مدرسہ مطلع العلوم میں پہلی مرتبہ مدرس مقرر ہوا، تو مفتی صاحب نے رخصت کرتے وقت میرے لیے بہت دعا کی۔ میری حوصلہ افزائی کے لیے بہت کچھ کہا۔ یہی نہیں بلکہ میرے لیے قرآن سے فال نکالی، قرآن سے فال کا جو جواب آیا اس سے بہت خوش ہوئے۔ پہلا جواب تھا: رب زدنی علماً اور دوسری آیت وہ تھی جس میں حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے اپنے بھائی ہارونؑ کے لیے نبوت کی درخواست کی اور اللہ نے وہ درخواست منظور فرمائی۔ مفتی صاحب اس فال سے بڑے مسرور ہوئے۔ وہ مجھے اپنی تمام مصروفیات ترک کرکے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ مجھے تمام طالب علموں کے ہمراہ آکر الوداع کہا۔ مفتی محمود کے سوا کسی استاد کا اپنے طالب علموں سے ایسا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے تھے تاکہ استاد کی جگہ پر بیٹھنے والا طالب علم احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو اور اسے یقین ہو جائے کہ اس کا اپنا استاد بھی اس کی صلاحیتوں کا معترف ہے۔ وہ طالب علم کو احساسِ خودی کی دولت سے مالا مال کرتے تھے۔ یہ تعلیم کے بعد اپنے شاگردوں کے لیے ان کا آخری اور سب سے قیمتی تحفہ ہوتا تھا۔ جب ان کا کوئی شاگرد عالم بن جاتا تھا، تو اس کا اپنے معاصرین کی طرح احترام کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ یہ شخص ان کا شاگرد ہے۔ بھلا ایسی خوبیاں کسی اور میں کہاں ہیں۔ ان خوبیوں کا حامل کوئی اور کیسے بن سکتا ہے؟ جن دنوں مفتی صاحب اپنے گھر میں بیروزگاری کا وقت کاٹ رہے تھے، میں اکوڑہ خٹک سے رمضان کی چھٹیوں میں واپس گھر آیا، تو مفتی صاحب کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ میں دونوں سال پورے دارالعلوم میں اوّل نمبر پر رہا ہوں۔ اس خوشی میں وہ گھر سے بہت دور میرے استقبال کے لیے آئے۔ یہ ایک غریب، مسکین اور یتیم طالب علم کا استقبال تھا۔ پھر اس جگہ سے گھر تک میرا ہاتھ پکڑ کر میرے ساتھ چلتے رہے۔ میری کامیابی پر مجھے مبارکباد دی اور میری حوصلہ افزائی کی۔ اب کہاں ایسے اساتذہ جو اپنے تلامذہ کے ساتھ اس طرح پیش آئیں، اپنے بچوں کی اس طرح عزت کریں، ان کی حوصلہ افزائی کرکے ان کو آگے بڑھائیں اور آخرِ کار اسی مسند پر بٹھا دیں جس پر وہ خود بیٹھتے ہیں۔

جب مفتی صاحب عبدالخیل میں قیام پذیر تھے، وہاں رواج تھا کہ درس کے طلبا فصل کی کٹائی کے وقت زمینوں پر گھومتے تھے اور لوگ ان کو گندم اور چنے دیتے تھے۔ یہ وہاں کا رواج تھا اور اسے معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مفتی صاحب وہ پہلے عالمِ دین تھے جنہوں نے ہمیں اس کام سے ہمیشہ کے لیے روک دیا، انہوں نے فرمایا: "یہ علمی وقار کے خلاف ہے، اِس سے علم کی توہین ہوتی ہے۔ پسماندہ علاقوں میں اب بھی رواج ہے کہ دینی اداروں کے طالب علم سال بہ سال گندم جمع کرتے ہیں، لیکن مفتی صاحب کے مسکن عبدالخیل میں یہ رواج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔

مفتی صاحب کی حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے اسباق کے دوران بھی بعض ہنگامی مسائل پر فتویٰ لینے کے لیے لوگ درس گاہ میں آ جاتے تھے۔ مفتی صاحب کو اہم مسائل کے لیے بھی کتابیں دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، وہ بیٹھے بیٹھے فتویٰ لکھ لیتے اور حوالے کے لیے کتابوں کی عبارات حافظے سے لکھ دیتے۔ فتوے کے لیے شامی ان کی پسندیدہ کتاب تھی اور اسی سے زیادہ مسائل کا جواب دیتے تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ مسئلے کی تلاش کے لیے ہم نے انہیں شامی کی فہرست دیکھتے ہوئے کبھی نہیں پایا۔ وہ براہِ راست کتاب کھولتے اور دیکھتے ہی دیکھتے متعلقہ صفحہ نکال کر ایک نظر ڈال لیتے؛ حالانکہ بڑا ماہر فقیہہ بھی باب دیکھنے کے لیے فہرست ضرور دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شامی کا ایک ایک صفحہ ان کی نظر میں تھا۔ انہیں کتاب کھولتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ کون سے مسائل پہلے صفحات میں ہیں اور کون سے پچھلے صفحات میں۔ فقہ سے اپنی دلچسپی کا وہ خود بھی ذکر کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ فقہ بنیادی طور پر پٹھانوں ہی کا علم ہے، اس لیے اس میں علمائے پنجاب زیادہ ماہر نہیں ہوتے۔

بحیثیت استاد ان کی ایک ایسی خوبی بھی دیکھنے میں آئی جو صرف ان کی ذات سے مخصوص تھی، کسی اور شیخ میں وہ خوبی نہیں تھی۔ یہ خوبی انہیں قدرت نے وہبی طور پر عطا فرمائی تھی۔ کسی سوال کا جواب تو کتاب دیکھ کر یاد دیکھے بغیر تمام علما دیتے ہیں، مفتی صاحب کو قدرت نے

www.tezpakistan.com

تدریس اور فتاویٰ میں استخراج جوابِ جدید کا بھی بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ وہ نفسِ کتاب اور حواشی میں درج جوابات سے ہٹ کر ایک جوابِ جدید بھی دیتے تھے اور وہی جواب سب سے زیادہ تسلّی بخش ہوتا تھا۔ مَیں دورانِ تدریس جوابِ جدید حاصل کرنے کے لیے ان سے اکثر سوالات کرتا رہتا تھا۔ وہ بھی میرے ذوق اور حرصِ علمی سے واقف تھے، اس لیے مَیں کوئی نہ کوئی مشکل سوال ضرور کرتا اور اس کے متعدّد جوابِ جدید حاصل کر لیتا۔ چونکہ وہ میری نیت کو جانتے تھے، اس لیے ایک سوال کے بہت سے نئے جوابات دے دیتے تھے، لیکن کوئی دوسرا طالبِ علم ایسا سوال کرتا، تو اسے بتاتے کہ اس کے سوال کا جواب حاشیے میں موجود ہے، اس نے مطالعہ نہیں کیا، اس لیے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ مفتی صاحب ایک عالم ہی نہیں، ایک عارف بھی تھے۔ انہوں نے میرے لیے دعا کی تھی کہ تدریس میں قدرت مجھے بھی وہی ملکہ عطا فرمائے، چنانچہ درس و تدریس سے وابستہ ہو کر جب مفتی صاحب سے ذکر کرتا کہ قدرت نے وہ ملکہ مجھے عطا فرما دیا ہے، تو مفتی صاحب بہت خوش ہوتے۔

آخری دَور میں جب انہیں کھانے اور سونے کا وقت بھی بہت کم ملتا تھا، انہوں نے بیشتر مسائل کے بارے میں مجھ پر اعتماد و انحصار کر لیا تھا۔ جب زکوٰۃ آرڈی ننس نافذ ہوا، تو مفتی صاحب نے حسبِ عادت اس پر زبانی فتویٰ تحریر کیا اور مجھ سے رائے لی۔ مَیں نے دیکھا کہ حوالہ جات کے لحاظ سے وہ ایک مکمل فتویٰ تھا۔ مفتی صاحب کہنے لگے اِس پر کیا کیا اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں، مَیں نے بہت سے اعتراضات کیے، انہوں نے جوابات دیے، پھر وہ خود اعتراضات کرنے لگے اور مَیں جوابات دینے لگا، یہاں تک کہ جب ہر طرح سے ان کو یقین ہو گیا تو اس کے بعد اسے پبلک کے سامنے پیش کیا۔

مَیں نے انہیں طالبِ علم کی حیثیت سے اپنے بچپن میں دیکھا اور اُستاد کی حیثیت سے جوانی میں۔ اس کے بعد انہیں بحیثیت سیاستدان اور فقیہہ بھی دیکھا۔ میرے قلب و ذہن پر اُن کی شخصیت کا جو پرتو شروع میں پڑا، وہ آخر دم تک قائم رہا اور جوں جوں اپنا علم بڑھا، ان کے علم کو وسیع سے وسیع تر پایا۔ اگر مَیں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا کہ اپنے دَور کے وہ سب سے بڑے معلّم، فقیہہ اور سیاستدان تھے۔

نایاب کتب
کے اردو تراجم
جو ہم نے حال ہی میں شائع کیے ہیں

● مشرقی افغانستان کے خانہ بدوش قبائل
● سفرنامہ بلوچستان و سندھ
● مہمات بلوچستان
● وسطی ایشیا میں رُوس کے عزائم
● بلوچ قبائل
● شمال مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج
● بلوچستان تاریخ کے آئینے میں
● بلوچ قوم کی تاریخ
● سیستان
● مہمات بلوچستان ـــــ مصنفہ ـــــ کامل القادری
(ایک نئی کتاب ہے جسے دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے)
تفصیلات کے لیے آج ہی لکھیے
(ڈسٹری بیوٹرز)
گوشہ ادب۔ سرکلر روڈ۔ کوئٹہ۔ فون ۷۵۰۰۲ / ۷۴۶۸۱

صابنوں میں بلند مقام

کھجور مارکہ صابن (رجسٹرڈ)
ماموں کانجن
● کپڑے میں چمک پیدا کرتا ہے
● کپڑے کی عمر بڑھاتا ہے
● کپڑے زیادہ دھوتا ہے
تیار کردہ:
بدر منیر کیمیکل ورکس لمیٹڈ ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد)
فون: فیکٹری: ۱۲ ـــ رہائش: ۱۳

www.tezpakistan.com

مولانا سید عبدالقادر آزاد (خطیب بادشاہی مسجد لاہور)

کسی شاگرد کو زیادہ ڈانٹ دیتے تو اُس کے کمرے میں جاکر معذرت کرتے

مفتی محمود صاحب بصیرت عالمِ دین تھے۔ ان کا طلبا سے ہمیشہ ایسا تعلق رہا جیسا کسی باپ کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ وہ طلبا کو ہمیشہ اعتماد میں لیے رکھتے۔ ان کے گھریلو مسائل دریافت کرکے ان کے حل میں انہیں مدد دیتے اور اپنے مسائل بھی ان کے سامنے پیش کرکے ان کے حل کے لیے ان سے رائے طلب کرتے۔ اس طرح ان کے مشوروں کی روشنی میں ان کے تلامذہ کے مسائل حل ہوتے اور تلامذہ کے مشوروں کی روشنی میں ان کے مسائل بھی حل ہوجاتے۔ ہمارے قدیم اکابرین سے حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری علیہ الرحمۃ کا بھی یہی طرزِ عمل تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو اپنا کنبہ سمجھتے تھے، ان کو اپنے مسائل میں شریک کرتے اور خود ان کے مسائل میں شریک ہوتے۔ ایسی چیزیں استاد اور شاگرد میں باپ اور بیٹے کے تعلقات پیدا کردیتی ہیں، ان میں دُوری اور اجنبیت کے بجائے قرابت و انسیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے رنج کو اپنا رنج اور ایک دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔

بسا اوقات طلبا اور اساتذہ کے درمیان تلخیاں پیدا ہوجاتی ہیں، اس قسم کی تلخیاں مفتی صاحب اور ان کے شاگردوں کے درمیان بھی پیدا ہوجاتی تھیں، لیکن مفتی صاحب اور ان کے شاگردوں کے درمیان جو رشتۂ محبت قائم تھا، وہ ایسی تلخیوں کو بڑھنے نہیں دیتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی طالب علم کے ساتھ مفتی صاحب نے کوئی سخت بات کی، اسے ڈانٹ دیا، تو کچھ دیر کے بعد اسی شاگرد کے کمرے میں مفتی صاحب خود ہی معذرت کے لیے تشریف لے گئے۔ طالب علم مفتی صاحب کے اِس طرزِ عمل سے شرمندہ ہُوا، تو مفتی صاحب نے کہہ دیا، نہیں، میرا فرض ہے، مَیں نے تمہاری غلطی کی نسبت زیادہ ڈانٹا ہے۔ مفتی صاحب کے اس طرزِ عمل نے طلبا کو ان کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ واقعی ایک باپ کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اپنے شاگردوں سے شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر اپنے طلبا کے ساتھ کھانا کھاتے، وہ آخر دم تک طالب علم بنے رہے اور اپنا کھانا پینا، لباس اور دوسرے لوازماتِ زندگی کو طلبا کے لوازماتِ زندگی سے بڑھنے نہیں دیا۔

درس و تدریس میں ان کا مخصوص انداز تھا اور اس میں فقیہانہ رنگ غالب تھا، لیکن مسائل کی تفہیم میں وہ ہمیشہ اختصار و ایجاز کی راہ اختیار کرتے اور وہ مسائل جو دوسرے اساتذہ کے ہاں مہینوں اور برسوں میں بیان ہوتے، سمجھے اور سمجھائے جاتے، مفتی محمود ایسے "ادق" مسائل

www.tezpakistan.com

کو گھنٹوں اور منٹوں میں نمٹا دیتے اور جو مسائل طویل مباحث کے بعد سمجھنے میں آنے والے ہوتے، ایسے مسائل کو وہ انتہائی سادہ اور عام فہم مثال میں سمجھا کر شاگردوں کو مطمئن کر دیتے اور پھر طلبا کو مزید سوالات کی دعوت دیتے اور اس وقت تک نئے سے نیا جواب دیتے رہتے جب تک آخری اور کم سے کم ذہین اور زیادہ سے زیادہ غبی آدمی کی بھی تسلی نہ ہو جاتی۔ اس باب میں مفتی صاحب ایک منفرد اُستاد تھے۔

مفتی صاحب ابتداً درس و تدریس کے آدمی تھے، تقریر و خطابت سے ان کا دُور کا واسطہ بھی نہ تھا، لیکن جب اس میدان میں آئے، تو ہوتے ہوتے ان کا شمار فصاحت و بلوغت کے شہسواروں میں ہونے لگا۔ مَیں نے ایک دفعہ ایک بہت بڑے لیڈر سے پُوچھا کہ سیاست میں سیاسی قائدین کو کسی نہ کسی طاقت اور گروپ کی ضرور پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اور سیاست اکثر افراد کی غرض یا مشغلہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کیا آپ نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا سیاسی لیڈر دیکھا ہے سیاست جس کی نہ تو غرض ہو نہ شغل اور نہ اسے کسی طاقت کی حمایت اور سرپرستی حاصل ہو! میرے اس سوال کے جواب میں اس رہنما نے کہا ایسا لیڈر مفتی محمود ہے۔

مفتی صاحب اپنے عقائد و افکار میں بہت پختہ کار تھے اور اصولوں پر سودے بازی کے ہرگز روادار نہ تھے۔ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی ہو یہ اور بات ہے لیکن جان بُوجھ کر غلط قدم اٹھانا ان کی تربیت ہی میں نہ تھا۔ بھٹو کے دورِ ابتلا میں وہ کونسی پیشکش ہے جو ایوانِ اقتدار سے مفتی صاحب کو نہ کی گئی ہو، لیکن ان ہی کا ضمیر تھا کہ وہ بک سکے نہ جُھک سکے اور اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ جس طرح فنِ کیمیاگری میں بعض چیزوں کو اکسیر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، مفتی محمود کو مُلکی سیاست میں اکسیر کا درجہ حاصل تھا۔ ان کی نسبت سے بے شمار لوگوں کا قد کاٹھ بلند ہوا، لیکن خود مفتی صاحب فقیری سے لے کر "بادشاہ گری" کے منصب تک پہنچے، لیکن چال ڈھال، لباس، خوراک، بود و باش اور طور طریقوں میں انہوں نے حاکمانہ طمطراق کے بجائے وہی درویشانہ فقر کو ترجیح دی جو شروع دن سے ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

مفتی صاحب علمی میدان کے علاوہ تصوف و سلوک میں بھی نقشبندی سلسلہ کی اجازت و خلافت کے حامل تھے، لیکن انہوں نے اس بیت الارشاد کو تجارت کے اڈے کے طور پر ایک منٹ بھی استعمال نہیں کیا اور نہ اپنے اس منصب کی تشہیر کی کسی کو اجازت دی۔ علاوہ ازیں وہ ایک خوش الحان قاری اور حافظِ قرآن بھی تھے جب وہ حجازی لہجے میں نماز پڑھاتے، تو ایک سماں بندھ جاتا۔

۱۹۶۶ء میں جشنِ قرآن کے نام سے وزارتِ قانون حکومتِ پاکستان نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں اُس دَور کے سینیٹر و وزیر خواجہ شہاب الدین نے اسلامی اقدار کے خلاف ایک "ترقی پسندانہ" تقریر کی۔ اس وقت ملک میں ایوب خاں کے بعد وہ دوسرا درجہ رکھتے تھے۔ مفتی محمود نے ان کو اس تقریب میں آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کی تقریر کے خلاف اتنی مؤثر اور ہلا دینے والی تقریر کی کہ اُن کو اُس سٹیج پر اپنے الفاظ واپس لینے پڑے۔ وہ علم کے غنی اور استدلال کے دھنی انسان تھے۔ ان اوصاف کے ساتھ ساتھ جرأت اور استقلال کی نعمت سے بھی مالا مال تھے، اس لیے جہاں دلائل اور جرأت کا معرکہ ہوتا وہاں وہ سب سے پہلی صف میں نظر آتے اور معرکے کے بعد دیکھا جاتا، تو وہ فاتح نظر آتے۔

۷۳ء یا ۷۴ء میں وہ کئی ماہ مجھ سے ناراض رہے۔ اس ناراضی میں بعض مہربان دوستوں کا ہاتھ تھا۔ اتفاق سے مکہ مکرمہ میں بعض بزرگ علما و مشائخ کو اس بات کا پتہ چل گیا، تو انہوں نے اسی مقام پر مجلسِ صلح قائم کی۔ مَیں نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ اگر میری ذات سے دین، مسلکِ حقہ یا خود مفتی صاحب کو کوئی نقصان پہنچا ہے، تو بتایا جائے تاکہ مَیں اس کی تلافی کروں۔ مفتی صاحب فرمانے لگے، میرا اعتراض یہ نہیں ہے، میرا اعتراض یہ ہے کہ تم میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے، تم نے تین سال تک مجھ سے ترکِ تعلق کیوں روا رکھا۔ مَیں یہ پُوچھتا ہُوں کہ مَیں نے دینِ اسلام اور مسلکِ حقہ کو یا خود تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے؟ مَیں نے کہا اگر بات صرف یہی ہے، تو مَیں آپ سے معذرت خواہ ہُوں۔ اس صلح و صفائی کے بعد بعض حاسدین نے مفتی صاحب سے پُوچھا آپ نے اس سے کیوں صلح کی ہے؟ مفتی صاحب نے فرمایا: "باپ بیٹے میں، چھوٹے بڑے میں اس قسم کی تلخیاں پیدا ہونا فطری امر ہے۔ اگر ان تلخیوں کی تلافی نہ ہو، تو یہ کائنات جو امن و آشتی کا گہوارہ ہے جہنم کا رُوپ دھار لے۔" یہ واقعہ عرض کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی ناراضی میں بھی ایک سلیقہ اور قرینہ تھا۔

www.tezpakistan.com

دارالعلوم کے صدسالہ اجتماعِ دستار بندی کے موقع پر پاکستان سے آٹھ سو چالیس علما کا جو قافلہ ہندوستان گیا، مفتی صاحب بھی اس میں شریک تھے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ مختلف دینی اور انتظامی امور پر مشاورت ہوتی رہی، وہ اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے نوازتے رہے۔ ان کے مشورے بہت صائب ہوتے تھے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی، تو ہم اسلام اور عالمِ اسلام کے اتحاد اور ترقی کے لیے ان کے مشوروں اور دعاؤں سے بہت کام کر سکتے تھے۔

زندگی کے آخری دنوں میں ان کا جنرل محمد ضیاء الحق سے اختلاف ہو گیا تھا، پھر یہ اختلاف بعض لوگوں کی لگائی بجھائی سے بڑھ گیا۔ اس میں میری رائے مفتی صاحب سے مختلف تھی۔ اختلاف کو اختلاف کی حد تک رکھا جاتا، تو مَیں صحیح سمجھتا تھا، لیکن اس میں اس انداز کی شدّت میرے نزدیک درست نہ تھی، اس لیے مفتی صاحب کچھ روز مجھ سے ناراض اور برہم بھی رہے، لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ اس تمام مسئلے میں مفتی صاحب کی کوئی خطا نہ تھی، ان کو جس قسم کی غلط اطلاعات فراہم کی جاتی تھیں، ان کا تقاضا یہی تھا کہ ان کے اختلاف میں شدّت پیدا ہوتی۔ ہم سے وہ ناراض تھے اور دوسرے حضرات کی رپورٹوں کی روشنی میں وہ صدر صاحب سے ملاقات اور بات چیت نہ کرنے کا عہد کیے ہوئے تھے، افسوس کہ اس صورتِ حال نے ان کے اختلاف کو کم نہ ہونے دیا اور بہت سے امور جو اُن کے مشورے سے طے ہو سکتے تھے اور اس سے ملک و ملّت کو فائدہ پہنچ سکتا تھا، وہ دھرے کے دھرے رہ گئے؛ بہرحال ان کی صلح، ان کی جنگ، ان کی ناراضی، ان کی رضامندی، ان کا غُصّہ اور ان کی نرمی اسلام کے لیے تھی۔ وہ ذاتی رنجشوں پر کسی سے ناراض ہوتے اور نہ ذاتی دوستیوں کے لیے اپنی منزل کو نظرانداز کرتے، ان کا جینا اور مرنا صرف اسلام کے لیے تھا، کیونکہ وہ اسلام کے سچّے جانثار تھے۔

مولانا محمد ضیاء القاسمی (فیصل آباد)

ہر طالب علم کی خواہش تھی
اُس کے اسباق
مفتی صاحب کے پاس ہوں۔
وہ سچ بولتے تھے، مگر
ان کا سچ میٹھا ہوتا تھا

ہر شاگرد اپنے استاد کی تعریف کرتا ہے، لیکن ہر شاگرد کی تعریف قابلِ اعتبار نہیں ہوتی، صرف اُن شاگردوں کی تعریف معتبر ہوتی ہے جو اپنے استاد سے کسی مسئلے پر اختلافِ رائے پر بھی کر سکتے ہوں۔ جو شاگرد کسی مسئلے پر اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے، اپنے استاد کے حق میں ان کی مثبت رائے بھی غیر معتبر ہوتی ہے۔ مفتی صاحب مذہب اور سیاست دونوں میں میرے استاد تھے۔ مذہبی مسائل میں اُن سے کبھی اختلاف نہیں ہُوا، البتہ سیاسی مسائل میں اختلاف بھی ہوتا رہا ہے۔

www.tezpakistan.com

بحیثیت اُستاد اُن کا اپنا ایک مقام تھا جو انہوں نے خود ہی بنایا تھا، اس میں کسی خارجی قوت کا عمل دخل نہیں تھا۔ وہ مقام یُوں بنا کہ قاسم العلوم میں طلبا کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ان کے اسباق مفتی صاحب کے پاس ہوں۔ گویا ہر درجے کے طلبہ یہ چاہتے تھے کہ ان کی درسی کتابوں کے لیے مفتی صاحب کو پابند بنایا جائے، کیونکہ مفتی صاحب کا طرزِ تعلیم دوسرے اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ آسان زبان میں سمجھاتے، مختصر جُملوں میں بات کہتے اور طلبا کو کتابوں کا رٹا لگانے سے بے نیاز کر دیتے، ان کا سمجھایا ہوا مسئلہ ذہن سے محو نہیں ہو سکتا تھا۔

حدیث کی کتابوں میں اپنے وقت کے تمام محدثین سے ان کا انداز مختلف تھا، حدیث سے مسائل کا استخراج، اپنے عقائد کے حق میں طرزِ استدلال بہت انوکھا ہوتا تھا، ان کے پاس پڑھنے والے طالب علم بڑے زبردست مناظر بن جاتے تھے اور کتابوں پر معمولی دسترس رکھنے والا شخص ان سے بات نہ کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن مَیں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا، ان سے ان کے اندازِ تدریس اور طرزِ استدلال کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔

بخاری میں ہے کہ جب رسُولؐ اللہ غزوۂ خندق سے واپس ہوئے اور ہتھیار اُتار کر غسل فرمایا، تو حضرت جبرئیلؑ حاضرِ خدمت ہوئے اور انہوں نے عرض کیا آپ نے ہتھیار اُتار دیے ہیں، ہم فرشتوں نے تو ابھی تک نہیں اُتارے، اُدھر ان کی طرف چلیے، آپ نے فرمایا کدھر؟ انہوں نے بنو قریظہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اُدھر — چنانچہ آپ لشکر کے ساتھ اُدھر تشریف لے گئے۔" اس سے مفتی صاحب یوں استدلال کرتے تھے کہ اگر بعض لوگوں کے عقیدے کے مطابق رسُولِ کریمؐ ہر مقام پر موجود ہوتے، تو جبرئیلؑ امینؑ آپؐ کو بنی قریظہ کی طرف تشریف لے جانے کو نہ کہتے، کیونکہ اس عقیدے کے مطابق حضورؐ کو پہلے ہی سے وہاں موجود ہونا چاہیئے تھا۔ حضرت جبرئیلؑ کا آپؐ کو وہاں لے چلنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ جب ایک مقام پر تشریف فرما ہوتے تھے، تو دوسرے پر نہیں ہوتے تھے۔ بالکل اسی طرح کہ جب مکّہ میں تھے، تو مدینہ میں نہیں تھے اور جب مدینہ تشریف لے گئے، تو مکّہ میں موجود نہیں رہے۔ معراج کی رات آسمانوں پر تشریف لے گئے، تو زمین پر موجود نہیں تھے اور جب واپس زمین پر تشریف لے آئے، تو آسمانوں پر موجود نہ رہے۔ نماز کے لیے مسجد تشریف لاتے، تو گھر موجود نہ ہوتے اور گھر تشریف لے جاتے، تو مسجد میں موجود نہ ہوتے۔ جبرئیلؑ کے اس طرح آپ کو لانے اور لے جانے سے اس عقیدے کی تردید ہوتی ہے جو بعض لوگوں نے اختیار کر لیا ہے۔

بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے۔" فرماتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرتؐ کے عہد میں مسجد نبوی کی صفائی اور خدمت پر مامور تھا۔ وہ رات کے وقت فوت ہو گیا۔ صحابہؓ نے اسے دفن کر دیا اور آنحضرتؐ کو اطلاع نہ دی۔ کچھ عرصہ گزر گیا، تو حضورؐ نے دریافت کیا وہ شخص کہاں ہے؟ صحابہ کرامؓ نے بتایا کہ اس کا تو انتقال ہو چکا ہے اور ہم اُسے دفن کر آئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تم نے مجھے اس کے جنازے کی اطلاع کیوں نہ دی؟ چلو مجھے اس کی قبر بتاؤ، چنانچہ صحابہؓ نے اس کی قبر بتائی اور آپ نے اس کے لیے دعا فرمائی۔" مفتی صاحب اس سے اس طرح استدلال کرتے تھے کہ بعض مسلمانوں میں جو یہ عقیدہ مشہور ہو گیا ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے وقت آنحضرتؐ موجود ہوتے ہیں، غلط ہے، کیونکہ اگر آنحضرتؐ سوال و جواب کے وقت قبر میں موجود ہوتے، انہیں مسجد کے اس خادم کی وفات کا علم ہو چکا ہوتا اور آپؐ صحابہؓ سے اس کے بارے میں دریافت نہ فرماتے اور پھر اس کی قبر کی جگہ ان سے معلوم نہ کرتے۔ آپؐ کا یہ عمل اس نظریے کی نفی کرتا ہے جن لوگوں نے "من ہذا الرجل" سے یہ استدلال کیا ہے، اُن سے بھُول ہوئی ہے، کیونکہ اس پر کوئی صحیح حدیث موجود نہیں، بلکہ اس نظریے کی نفی پر بہت سی احادیث موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صحابہ کرامؓ کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا کہ آنحضرت صلعم سوال و جواب کے وقت قبر میں موجود ہوتے ہیں؛ ورنہ وہ حضورؐ کے سوال پر کہتے کہ آپؐ کو تو سب کچھ معلوم ہے، ہم سے کیوں پُوچھ رہے ہیں، بلکہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ مسجدِ نبوی کے خادم کے ساتھ قبر میں فرشتوں نے کیا سلوک کیا؟

بخاری ہی کی ایک دوسری روایت ہے۔" حضرت سہلؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے گھر تشریف لے گئے، تو حضرت علیؓ کو وہاں موجود نہ پایا، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تیرے چچا کا بیٹا کہاں ہے؟ عرض کیا میرے اور ان کے درمیان کسی معاملے

www.tezpakistan.com

میں بات بڑھ گئی تو وہ ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے۔ نبی کریمؐ نے یہ واقعہ سن کر ایک آدمی کو حکم دیا کہ انہیں تلاش کر کے مجھے بتا کہ وہ کہاں ہیں؟ جب اس نے آکر نبی کریمؐ کو بتایا کہ وہ مسجد میں ہیں، تو حضورؐ خود مسجد میں تشریف لے گئے، دیکھا کہ علیؓ لیٹے ہوئے ہیں اور چادر ان کے پہلو سے اُتر چکی ہے اور جسم کو مٹی لگی ہوئی ہے۔ حضورؐ انہیں تھپکی دے کر بیدار کرنے لگے، اس وقت آپ یہ الفاظ ادا فرما رہے تھے، اے مٹی والے اٹھ، اے مٹی والے اُٹھ۔ مفتی صاحب اس سے بھی استدلال کرتے تھے کہ جن لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حضور پاکؐ ہر وقت ہر بات کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے اور ہر مقام پر ہر وقت تشریف فرما ہوتے تھے، ان کی غلطی ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو حضورؐ اپنی بیٹی فاطمہؓ سے حضرت علیؓ کی بابت نہ پوچھتے اور نہ کسی آدمی کو ان کی تلاش پر مامور کرتے اور نہ اس کی اطلاع پر مسجد میں جاتے۔ آپؐ فاطمہؓ سے کچھ پوچھے بغیر ہی مسجد میں تشریف لے جاتے، کیونکہ آپ کو ان کے درمیان بڑھنے والی بات کا پہلے ہی علم ہوتا اور یہ بھی علم ہوتا کہ وہ اس وقت مسجد میں سوئے ہوئے ہیں۔

نسائی شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک تازہ قبر دیکھ کر صحابہؓ سے سوال کیا کہ یہ قبر کس کی ہے؟ پھر صحابہؓ کے بتلانے پر کہ یہ قبر فلاں خاندان کی لونڈی کی ہے، آپؐ نے اسے پہچان لیا۔ اس حدیث سے بھی مفتی صاحب یہ استدلال کرتے تھے کہ قبر میں سوال و جواب کے وقت رحمتِ دو عالمؐ کی موجودگی ایک غلط عقیدہ ہے جو لوگوں میں مشہور ہو گیا ہے اور یہ حدیث بھی اس عقیدے کی نفی کرتی ہے۔ نیز صحابۂ کرامؓ کا جواب بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ ان کا اپنا عقیدہ بھی یہ نہیں تھا کہ آنحضرتؐ قبر میں سوال و جواب کے وقت موجود ہوتے ہیں، ورنہ وہ کہہ دیتے کہ آپ تو خود ہی قبر میں سوال و جواب کے وقت موجود ہوتے ہیں، آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ قبر کس کی ہے۔

علم کا یہی رنگ مفتی صاحب کی سیاست میں موجود تھا۔ یہ بات انہوں نے بطورِ خاص اصول کے طور پر اپنا رکھی تھی کہ بولنا ہے تو صرف ضرورت کے وقت، بغیر ضرورت کے ہرگز نہیں بولنا۔ وہ عام مجالس میں بھی اس وقت تک خاموش رہتے تھے جب تک کہ ان سے رائے نہ لی جاتی یا ان کا رائے دینا ضروری نہ ہوتا۔ از خود ان کو بولنے کی اس وقت ضرورت پیش آتی جب کسی پہلو سے بات ان سے یا ان کی جماعت سے متعلق ہوتی۔ مفتی صاحب سے اپنے لوگوں کے اختلاف کا سبب ان کا حلم تھا۔ وہ بسا اوقات اتنی نرمی، فراخدلی اور رواداری کا مظاہرہ کرتے تھے کہ ان سے اختلاف ہو جاتا تھا۔ ان سے کسی دوست، شاگرد یا ساتھی کو اگر اختلاف تھا، تو اس کا سبب ان کا حلم تھا اور کچھ نہیں تھا۔

مَیں نے مفتی صاحب کو تین حیثیتوں میں دیکھا ہے:

پہلی حیثیت استاد کی تھی۔ بحیثیت استاد ان کو انتہائی لائق، ذہین اور مشفق و مہربان پایا۔ وہ اپنی درس گاہ میں صرف محقق ہوتے تھے اور کچھ نہیں۔ درس گاہ میں بیٹھے مفتی محمود کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہی محقق اور مدرّس میدانِ سیاست کا بھی شہسوار ہے، کیونکہ ان دونوں میدانوں میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔ درس گاہ کی دنیا کا مزاج، ماحول، اصطلاحات، طور طریقے الگ ہوتے ہیں اور میدانِ سیاست کی ہر چیز جُدا۔ مفتی صاحب اپنی درس گاہ میں علم اور صرف علم کے ترجمان ہوتے تھے۔

دوسری حیثیت ان کی سیاستدان کی تھی۔ میدانِ سیاست میں ان کے انداز اور طریقے درس گاہ سے مختلف تھے۔ مَیں نے طویل عرصہ ان کے ساتھ کام کیا ہے، درس گاہ اور میدانِ سیاست میں آکر ان کی زندگی میں جو نمایاں فرق نظر آتا تھا، وہ یہ تھا کہ درس گاہ کی دُنیا کے یہ خود مختار بادشاہ تھے۔ یہاں صرف ان کی اپنی آواز گونجتی تھی، کوئی اور آواز یہاں ہرگز نہ تھی، لیکن سیاست کی دنیا میں بہت سی آوازیں تھیں، وہ درس گاہ میں خاموش لوگوں میں بولتے تھے اور اس کارزارِ سیاست میں دوسرے بولنے والوں کو سُنتے تھے۔ ان کے دعوے، ان کے دلائل، ان کے مواعید، ان کی پرانی باتیں، ان کی نئی گفتگو، جب ہر بات سن کر سمجھ لیتے تھے، تو پھر خود ایک ہی بار بولتے تھے، زیادہ نہیں بہت کم، مگر جچے تُلے جُملے، دو ٹوک اور اٹل بات، سچی اور میٹھی بات۔

سچ کے بارے میں مشہور ضرب المثل ہے کہ وہ کڑوا ہوتا ہے۔ خود اپنی زبان میں ہم نے اسے ادا کیا، تو کئی کانوں میں انگلیاں ڈل گئیں، لیکن مفتی صاحب کو قدرت نے ایک خاص حکمت و تدبّر عطا فرمایا تھا کہ وہ سچ کہتے تھے، لیکن وہ سچ میٹھا ہوتا تھا، سُننے والا ان کی بات

www.tezpakistan.com

سے اختلاف کے باوجود ان کی شرافت و شائستگی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

مفتی صاحب کی تیسری حیثیت ایک صوبائی حکمران کی تھی۔ اس حیثیت میں بھی مَیں نے انہیں ایک طالب علم کی نظر سے دیکھا۔ یہاں ان میں عالم، سیاستدان، حاکم، مدرس، فقیہہ، دانشور اور امامِ قوم کی صفات یکجا ہو گئی تھیں۔ اس دَور میں مَیں نے انہیں بلاشبہہ دُور سے دیکھا، لیکن دیکھنے میں غلطی نہیں کی، وہ وزارت کے دَور میں بھی قاسم العلوم کے طلبا کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ ان کو پڑھانے کے لیے انہیں اتنی ہی بیتابی ہوتی تھی جتنی ایک ماں کو اپنے بچّوں کو دُودھ پلانے کے لیے ہوتی ہے اور قاسم العلوم کے طلبہ کو پڑھا کر وہ اتنے ہی مطمئن و مسرور ہو جاتے تھے جس قدر ایک ماں اپنے بچّے کو دودھ پلا کر ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اگر وہ مدرسے میں نہ آ سکتے، تو وہاں جانے والے علما و طلبا کو درس دیتے، وہ کبھی تو ایک مدرّس کی طرح باتیں کرتے، کبھی ایک حاکم کی طرح فیصلے صادر کرتے، کبھی ایک واعظ کی طرح قوم کی حالت پر روتے، کبھی ایک سیاستدان کی طرح دوسروں کی سُنتے اور اپنی سناتے، کبھی ایک زبردست عالم کی طرح گرجتے اور برستے۔

ان تینوں ادوار میں بحیثیت انسان ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی، ہم نے اپنے اسلاف کے بارے میں کبھی فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، نہ انہیں خدا اور رسُولؐ کا منصب دینے کی جسارت کر کے شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ مَیں تسلیم کرتا ہوں مدرّس کی حیثیت میں ان سے غلطی ہو سکتی تھی، سیاستدان کی حیثیت میں ان سے غلطی ہو سکتی تھی، وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت میں اُن سے غلطی ہو سکتی تھی، لیکن ان کی نیّت، ارادے اور خلوص میں دشمنوں نے بھی شک نہیں کیا۔ وہ ایک عالم باعمل، عارف باللہ، باضمیر سیاستدان اور باکمال انسان تھے۔ ایسے انسان جن کے اعمالِ حسنہ کو فرشتوں نے بھی رشک سے دیکھا ہے۔

مولانا منظور احمد شاہ (فیصل آباد)

مولوی محمود
رات کو بخاری کا مطالعہ شروع کرتے
تو اسی حالت میں صبح کی اذان ہو جاتی۔
سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے کہا:
"مولوی محمودؒ" ہمارے دَور کا انسان تھا"
اِس دَور میں پیدا ہو گیا۔

مفتی محمود صاحب سے میرا پہلا تعارف ۱۹۵۷ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے استاد کی حیثیت سے ہُوا۔ اس ادارہ میں اس سال وہ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہُوئے تھے، اس سے پہلے ان کے پاس فنون کی دوسری کتب تھیں، لیکن حدیث کی کوئی کتاب نہیں تھی، بعض ہمعصر علما کا خیال تھا کہ مولوی محمود صاحب استادِ حدیث کے طور پر کامیاب نہ ہو سکیں گے، کیونکہ اس سے قبل یہ منصب مولانا عبدالخالق مرحوم کے پاس تھا جن کے علم و فضل کا پُورے برّصغیر میں چرچا تھا اور مولوی محمود صاحب کو پہلی بار یہ ذمّہ دارانہ منصب سونپا گیا تھا، لیکن ان لوگوں کی رائے

www.tezpakistan.com

بڑی وزنی نظر آتی تھی جو مولانا عبدالخالق اور مولوی محمود صاحب کا موازنہ کر کے اظہارِ خیال کر رہے تھے کیونکہ مولوی محمود لاکھ ذہین سہی لیکن شیخ الحدیث بننا معمولی بات نہیں ہوتی۔ دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے کتبِ حدیث کے اس نصاب کو "دورۂ حدیث" کہتے ہیں، اس وقت تک زیرِ تعلیم رہنے اور فنون کی دیگر کتابوں کی تکمیل کرنے والے طلبا کی نظر بہت وسیع ہو چکی ہوتی ہے۔ "دورۂ حدیث" کا ہر طالب علم حدیث کا متن پڑھ کر اس کا ترجمہ کر سکتا ہے۔ اسناد کا اختلاف اور راویوں کی صحت و عدم صحت کے بارے میں اکثر باتیں کتابوں کے حواشی میں موجود ہوتی ہیں، اسی طرح مسائل کے بارے میں ائمہ کا اختلاف اور ان کے ترجیحی پہلو بھی کتابوں ہی میں موجود ہوتے ہیں، مگر روایات کے تعارض میں تطبیق، اپنے مسلک کی حقانیت پر دوسری روایات، ضمنی مباحث، امثال و نظائر، تعامل صحابہؓ اور اس قسم کی متعدد علمی مشکلات کا حل پیش کرنا شیخ الحدیث کی ذمہ داری ہوتی ہے، استاد کے سامنے بڑے بڑے ذہین و فطین اور منطقی طالب علم بیٹھے ہوتے ہیں، وہ کسی مسئلے پر اُستاد کے سکوت یا اٹکاؤ کو اس کی کم علمی پر محمول کرتے ہیں اور کوئی بھی ایسا شخص حدیث نہیں پڑھا سکتا جو اختلافِ حدیث، اختلافِ سند، اسماء الرجال اور دوسری فنی باتوں پر گہری نظر نہ رکھتا ہو" دورۂ حدیث" وہی استاد پڑھا سکتا ہے جو تمام مذاہب اور ان کے اختلافات اور ترجیحی پہلوؤں پر عبور رکھنے کے علاوہ طلبہ کی پیشانیوں پر ان کے سوالات اور اشکالات پڑھ کر ان کے معقول جوابات دے کر ان کی تشفی کر سکے، اور یہ کام مسلسل مطالعے کے بغیر ممکن نہیں، دینی مدارس میں سالہا سال سے پڑھانے والے اساتذہ بھی ہر سال مطالعہ کر کے پڑھاتے ہیں، یہی وجہ ہے دینی مدارس کے طلبا میں ایک شعر بہت مشہور ہے اور وہ اسے اکثر پڑھتے رہتے ہیں ؎

بن دیکھے جو مدارس میں پڑھاتے ہیں بخاری آتا ہے بخار ان کو بخاری نہیں آتی

ان حالات میں اگر بعض علما یہ رائے رکھتے تھے کہ مولوی محمود "دورہ حدیث" نہیں پڑھا سکیں گے تو ان کی یہ رائے کچھ غلط نہیں تھی، یہاں تو ایسے اساتذہ بھی مشکلات سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو برس ہا برس سے دورہ حدیث کی کتب پڑھاتے چلے آ رہے ہوں۔ مولوی محمود صاحب تو پہلی بار اس کوچے میں آئے تھے، لیکن جو مولوی محمود مولانا عبدالخالق جیسے مشہور زمانہ محقق اور فن حدیث کے ماہر استاد کے بعد حدیث پڑھانے بیٹھا تھا اس نے صرف چند ماہ میں اپنے تمام معاصرین کو رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ حیرت سے پکار اُٹھے "یہ وہی مولوی محمود ہے جو کئی سال چھوٹی کتابیں پڑھاتا رہا ہے" کئی طلبا نے حسرت سے کہا، کاش کہ مولوی محمود صاحب کو قاسم العلوم میں آتے ہی یہ خدمت سونپ دی جاتی۔ پھر کیا تھا کہ کبھی ایک مدرسے کے طلبا یہاں بھاگے آ رہے ہیں اور کبھی دوسرے کے، کبھی کابل و قندھار سے تشنگانِ علوم کے قافلے آتے ہیں تو کبھی ایران اور کُردستان سے اور یہی مولوی محمود ہے جو سب کو پڑھا رہا ہے، سب کو مطمئن کر رہا ہے، سب کی تسلی و تشفی کر رہا ہے۔ علما جوں جوں اسے دیکھتے تھے، ان کی حیرت بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ ان دنوں مولوی محمود صاحب کا معمول تھا کہ وہ رات کو بخاری کا مطالعہ شروع کرتے اور اسی حال میں صبح کی اذان ہو جاتی۔ نماز کے بعد ورد و وظائف میں مشغول ہو جاتے اور اس کے بعد دارالحدیث میں پہنچ کر طلبا کو کتبِ حدیث پڑھانا شروع کر دیتے، دوپہر کو آرام کے لیے جو تھوڑا بہت وقت ملتا اس میں سو لیتے۔ ان کا یہ معمول پورا سال جاری رہا۔ انہوں نے اتنی محنت کی کہ سر کے بال اُڑ گئے، لیکن یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا عبدالخالق مرحوم کے بعد ان کا کوئی معاصر ان کی جگہ پُر نہیں کر سکتا تھا، لیکن مولوی محمود صاحب نے نہ صرف جگہ پُر کی بلکہ انہوں نے طلبہ اور انتظامیہ کو مولانا عبدالخالقؒ کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دی۔ رفتہ رفتہ لوگ یہ بھول ہی گئے کہ ان سے پہلے بھی یہاں ایک قابلِ فخر ہستی موجود تھی۔ مولوی محمود صاحب کی اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے مدارس کے طلبا بھی اس طرف بڑھنے لگے لیکن اس کے بعد مفتی صاحب کو باقاعدہ طور پر کتبِ حدیث پڑھانے کے لیے وقت ہی نہیں ملا۔ ان کی سیاسی مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں کہ وہ پابندی ختم ہو گئی جو ۱۹۵۰ء میں تھی۔ اس کے بعد کبھی پڑھاتے اور کبھی ناغہ ہو جاتا لیکن پہلے سال ایامِ جمعہ کے سوا کوئی چھٹی نہیں ہوئی اور خوش قسمتی سے میں نے بھی اسی سال ان سے دورۂ حدیث کیا۔

ان دنوں مولوی محمود صاحب علمی مصروفیات کے باوجود نمازِ عصر کے بعد روزانہ ورنہ ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن امیرِ شریعت

www.tezpakistan.com

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ ایک بار میں اور میرے ساتھی بھی شاہ جی سے ملنے گئے، اس وقت ان کے پاس دوسرے لوگوں کے علاوہ مولوی محمود صاحب بھی بیٹھے تھے اور کوئی علمی موضوع چل رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد مولوی محمود صاحب نے شاہ جی سے جانے کی اجازت لی اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شاہ جی نے حاضرینِ مجلس سے پوچھا: آپ انہیں جانتے ہیں؟ ایک صاحب ان کا اشارہ سمجھ کر بولے جی ہاں! یہ مدرسہ قاسم العلوم کے استاد مولوی محمود صاحب ہیں۔ شاہ جی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا نہیں! تم اسے نہیں جانتے کہ یہ کون ہے، حاضرینِ مجلس کو گمان ہوا کہ شاہ جی مولوی محمود صاحب کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اس لیے ایک ساتھ کئی حضرات بولے کہ یہ مولوی محمود صاحب ہی ہیں، فرمائیے کیا بات ہے؟ شاہ جی نے دوبارہ سوال دُہرایا۔ تم اسے جانتے ہو؟ پھر خود ہی فرمایا نہیں! تم نہیں جانتے یہ کون ہے۔ ہائے اس قوم کی بدقسمتی اور اس شخص کی بدقسمتی! ان کی اس بات پر تمام لوگ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ سب کو یقین ہو گیا کہ مولوی محمود صاحب کے متعلق وہ کوئی بڑی اہم بات جانتے ہیں ایسی بات جسے دوسرے لوگ نہیں جانتے۔ شاہ جی ایک قلندر آدمی تھے۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر ایسی بات کہہ جاتے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتی تھی اور کچھ روز بعد ان کی کہی بات سامنے آجاتی تھی۔ ایک بار فرمایا کہ میں پیشگوئیاں نہیں کیا کرتا، لیکن اگر کوئی پیشگوئی کر دوں، تو مرزا قادیانی کی پیشگوئیوں کی طرح نقش برآب ثابت نہیں ہو گی۔ تم میری یہ پیشگوئی لکھ لو کہ مرزا غلام احمد کا فراڈ نہیں چلے گا۔ تم اپنی آنکھوں سے ایک نہ ایک دن اس خانہ ساز نبوّت کو دم توڑتے دیکھ لو گے، اس کے آقا اس کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے، اس کے پیروکار بے یار و مددگار ہو کر پناہ گاہیں تلاش کریں گے لیکن ان کے پناہ گار بھی ان کے لیے ایک وبال بن جائیں گے، وہ ان کے لیے جو کچھ کریں گے اس کا نتیجہ ان کی کوششوں سے برعکس ہو گا۔ مت بھولو کہ قدرت کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ع

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی

اس مجلس میں جب شاہ جی نے اپنے مخصوص قلندرانہ انداز میں کہا: ہائے! اس قوم کی بدقسمتی اور اس شخص کی بدقسمتی! تو حاضرین حیران شاہ جی کا مُنہ دیکھنے لگے۔ ہر شخص ایک سوالیہ نشان بن کر سوچنے لگا کہ خدا جانے شاہ جی اس کے بعد کیا فرماتے ہیں، پھر شاہ جی کے چہرے پر تفکرات کے آثار ظاہر ہونے لگے، وہ دیر تک خاموش، گم صُم اور کھوئے سے رہے۔ پھر حاضرین پر ایک نظر ڈال کر فرمایا: تم نہیں جانتے مولوی محمود کون ہے، یہ بڑا قیمتی آدمی ہے، یہ شخص ہمارے دور کا انسان تھا اس دور میں پیدا ہو گیا، یہی اس کی بدقسمتی ہے، ہم خوش قسمت تھے کہ اس دُور میں پیدا ہوئے جب اچھے لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ ہمیں اچھے ساتھی میسّر آگئے، اب جو دَور آرہا ہے اس میں اچھے لوگ مفقود ہیں ع

جو بادہ خوار پرانے تھے اُٹھتے جاتے ہیں

خدا جانے اس شخص کو اچھے رفقا میسّر آئیں نہ آئیں۔ قدرت نے اسے کسی بڑے کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ اسی سانچے میں ڈھلا ہوا انسان ہے جس میں بڑے لوگ ڈھلا کرتے تھے، مگر اب تو وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا، اب بڑے لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ نہ جانے اس شخص کے چہرے پر مجھے مستقبل کا نوشتہ کیسے نظر آرہا ہے؟ پھر شاہ جی ایک شخص کی طرف دیکھتے ہوئے مخاطب ہوئے، میرے بھائی! یہ اس دَور کا انسان نہیں، خدا اس کی حفاظت کرے، تم لوگ بھی اس شخص کا خیال رکھو، یہ محمود بھی یقیناً کوئی سومنات توڑے گا۔"

ہمارے دل میں تو پہلے ہی مولوی محمود صاحب کا احترام بدرجہ اتم موجود تھا، اب شاہ جی کی باتوں کے بعد یہ احترام مزید بڑھ گیا۔ میں ۱۹۵۰ء میں درسِ نظامی سے فارغ ہو گیا لیکن مفتی محمود صاحب سے راہ و رسم برقرار رکھی اب وہ مولوی محمود سے مفتی محمود بن چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے عروج و ترقی کی منازل طے کیں۔ میں نے فراغت کے بعد تبلیغِ دین کے محاذ پر کام شروع کر دیا تھا۔ وہ اس میدان میں میری اکثر رہنمائی فرماتے تھے۔ میں نے ان کے حریفوں اور حلیفوں کو بھی دیکھا، ان کی سیاست و علمیّت دونوں کے لیے قابلِ رشک تھی۔ قومی محاذ پر کچھ ایسے سیاستدان بھی موجود تھے جو مفتی محمود کی متانت، سنجیدگی اور مدلّل گفتگو سے یہ خطرہ محسوس کرتے

www.tezpakistan.com

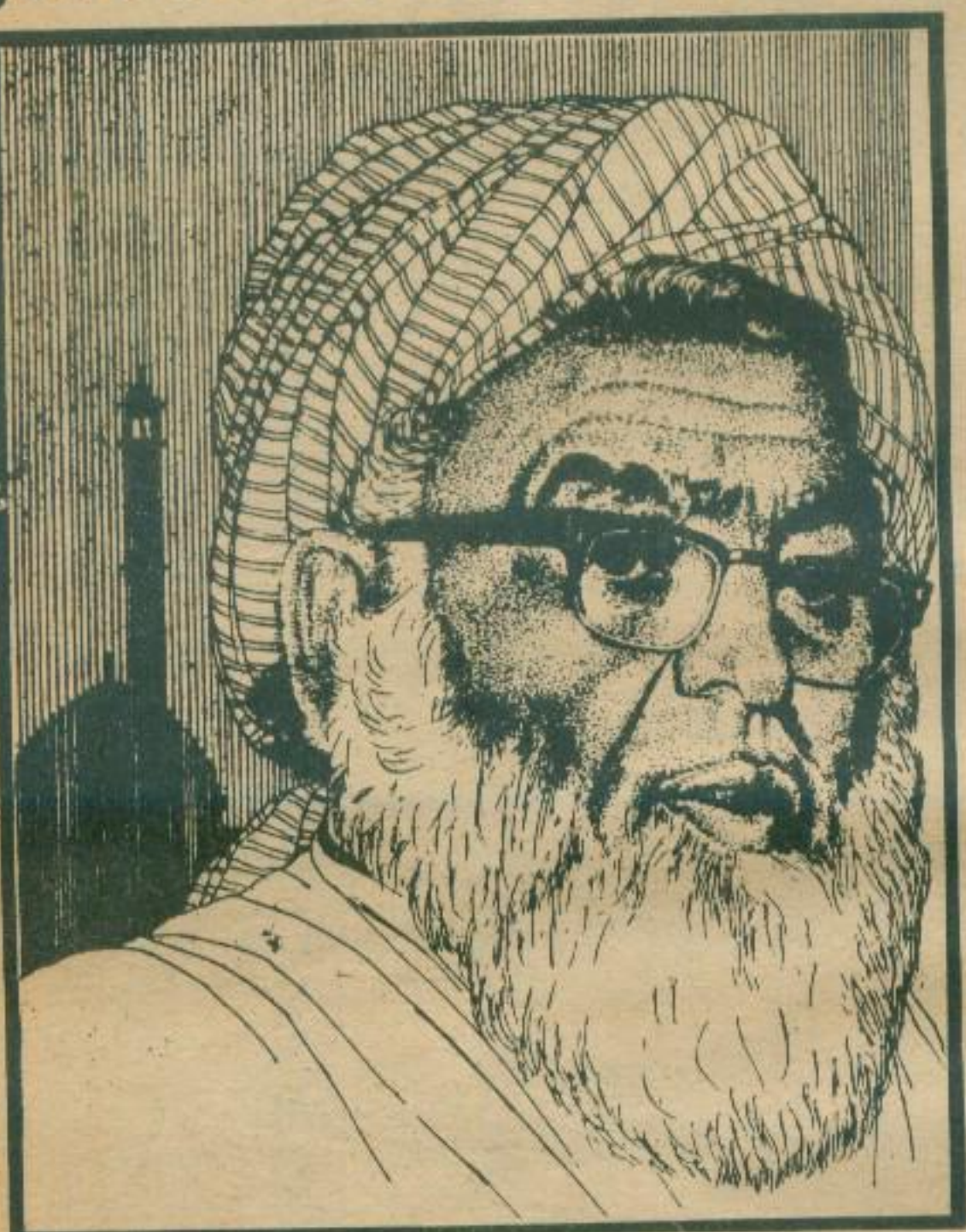

اُس
شخص کو
سلام!

جس نے

امیری میں فقیری۔ فقیری میں امیری
کی مثال قائم کی

یونین انشورنس کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ

نویں منزل (9th floor) آدم جی ہاؤس۔ آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

فون: ۲۲۲۵۷۷ — ۲۲۲۵۷۸ — ۲۲۲۵۷۹
۲۲۲۵۷۰ — ۲۲۵۱۶۹

NASIR

www.tezpakistan.com

متاثر کرے گی۔ فرد فرد کا اور خاندان خاندان کا دشمن بن جائے گا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ جو لوگ چوک میں پہنچ چکے ہیں وہ اپنی گاڑیوں سے اُتر کر پہلے اس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں کو کاٹیں، پھر اٹھا کر اسے دُور پھینک دیں۔ اس کے بعد اپنی اپنی منزلِ مقصود کی طرف چلے جائیں۔ بہتر صورت کون سی ہے، ان مسافروں کو کیا کرنا چاہیے؟ جلسہ میں موجود سامعین نے بیک آواز ہو کر جواب دیا، راستہ صاف کریں۔ مولانا جالندھری نے سوال کرنے والے سے مخاطب ہو کر کہا آپ فرماتے ہیں کہ اس متحدہ محاذ میں مختلف خیالات و عقائد کے حامل لوگ موجود ہیں، کسی کی منزل روس ہے، کسی کی امریکہ۔ بات درست ہے ان سب کی منزل اگرچہ الگ ہے، یہ لوگ جب اس چوراہے میں پہنچے تو آگے ایوب خان درخت کی صورت میں نظر آیا، انہوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس سے راستہ خالی کرائیں اس کے بعد سفر کریں۔ روس والے بھی رک گئے، امریکہ والے بھی رُک گئے، مفتی صاحب کی جماعت کے ارکان مدینہ کے مسافر تھے وہ بھی رک گئے، یہ سب مِل کر راستہ صاف کرنے لگے، بتاؤ اس میں کیا قباحت ہے، اس اتحاد کے بارے میں شرعی اور غیر شرعی بحث کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن یقین کیجیے کہ ہم نہیں جانتے ان مسافروں میں کون ہے، چوری چھپے سے غیر ممالک میں جا رہا ہے۔ جو لوگ ان کے بارے میں جانتے ہیں، وہ ان کو سرحد پر گرفتار کریں۔ جب تک وہ ملک کے اندر موجود ہیں ان پر یہ الزام درست نہیں کہ وہ اس چوراہے میں اس لیے آئے ہیں کہ یہاں سے امریکہ یا رُوس چلے جائیں گے، اس الزام کی بنا پر ملکی سرحدوں کے اندر انہیں گرفتار کرنا درست نہیں۔ سوال کرنے والے نے سر جھکا لیا اور مجمع نے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کے بعد یہ اعتراض کسی گوشے سے نہیں اُٹھا، مفتی صاحب نے یہ جواب سُنا تو فرمانے لگے اگر میں اس سوال کا جواب دیتا تو کم از کم دو روز سوچتا اور پھر جواب دیتا، لیکن مولانا جالندھری نے چٹکیاں بجاتے ہوئے جواب دے کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے بعد جب کبھی کوئی اعتراض ہوتا تو وہ مولانا محمد علی جالندھری مرحوم کو یاد کرتے۔ میرے نزدیک یہ ان کی عظمت کی دلیل تھی۔ اپنے معاصرین کی اس قدر تعریف کرنا بڑے حوصلہ کا کام ہے اور پھر یہ کہنا کہ میں فوری طور پر ایسا جواب نہیں دے سکتا۔ اس سے زیادہ حوصلہ کی بات ہے۔ مفتی صاحب مولانا جالندھری کی ذہانت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں ۷۰ء کے انتخابات میں اپنے حلقے میں بلا کر تقریریں کروائیں اور یہ تسلیم کیا کہ ان کی تقاریر ان کے ووٹروں کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئیں۔

دوسری مثال ان کے موقع و محل کے مطابق بات کرنے اور مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے سے متعلق ہے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے اپنے حلقہ میں آخری روز جو تقریر کی وہ اس کی تائید کرتی ہے۔ مفتی صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ بھٹو صاحب کی جماعت نے حلقے کے غریب ووٹروں میں پیسہ لگا کر ووٹ خریدنے کی کوشش کی ہے۔ مفتی صاحب نے انتخابی مہم کے آخری روز جلسہ کیا، کارکنوں سے کہا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ووٹروں کو جلسہ گاہ میں لے کر آئیں۔ آج میں فیصلہ کُن بات کروں گا اور اس کے بعد کوئی فراڈ نہیں چل سکے گا، ان کے حکم کے مطابق کارکنوں نے محنت کر کے بے شمار ووٹروں کو جلسہ گاہ تک لایا۔ یہ ان کے انتخابی جلسوں میں سب سے بڑا اجتماع تھا، اس سے پہلے اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں ہُوا تھا، کارکن اعلان کرتے رہے تھے کہ اس جلسہ میں مفتی صاحب اہم اعلان کریں گے، چنانچہ مخالف، موافق ہر قسم کے لوگ جوق در جوق جلسے میں پہنچے، مفتی صاحب نے ان سے دو باتیں کہیں، پہلی یہ تھی کہ میں کسی کی نیت پر حملہ نہیں کرتا، لیکن نقل واقعہ کے طور پر بتا رہا ہوں کہ یہ بات میرے علم میں لائی گئی ہے کہ میرے مدِ مقابل فریق نے یہاں دولت سے لوگوں کا ایمان خریدنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے یہ کام میرے حلقے کے غیور لوگوں کو بے ضمیر سمجھ کر کیا ہے۔ یہ دولت اس جاگیردار کے بڑوں کو انگریزی کی چاکری کے عوض ملی تھی، جو درحقیقت اس کی نہیں، بلکہ انہی غریب عوام کی ہے اس لیے میں فتویٰ دیتا ہوں کہ جس شخص سے پیسے لینے کی بھول ہوئی ہے، اس کے لیے یہ رقم حلال ہے، کیونکہ یہ اس کا اپنا مال ہے۔ اگر مالِ مودی دستِ غازی میں آگیا ہے تو اسے کھا جاؤ اور ان رشوت دینے والے لوگوں کو ووٹ ہرگز نہ دو، ووٹ اس کو دو جو اس کا مستحق ہے۔ اگر تمہارا ضمیر کہتا ہے کہ وہ مجھ

www.tezpakistan.com

تھے کہ یہ شخص ملکی سیاست پر اپنے علم و عمل کے گہرے اور دُور رس اثرات مرتّب کرے گا اور اس طرح وہ سیاسی محاذ یران سے آگے بڑھ جائے گا۔ ایسے لوگوں میں بڑے بڑے دولت مند اور جاگیر دار شامل تھے جو علاقائی سیاست پر کسی کا غلبہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں اور ملتان میں بہت سے علمائے عملی سیاست میں حصّہ لے رہے تھے، لیکن ان سے جاگیرداروں اور وڈیروں کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہیں جذباتی قرار دے کر ان کی بات کے وزن کو گھٹایا جا سکتا تھا، لیکن مفتی صاحب کی نرم، دھیمی اور مُدلّل گفتگو ہمیشہ غیر جذباتی ہوتی تھی۔ ان کی بات سننے والے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال نہیں دیتے تھے، بلکہ ان کی باتوں کو سنتے اور دل میں جگہ دیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ مفتی صاحب کے حریف بھی ان کی بے حد عزّت کرتے تھے۔ مَیں نے ایک بار چند سیاستدانوں کا نام لے کر مولانا محمد علی جالندھری سے پوچھا کہ مفتی محمود سے ان کے ڈر اور خوف کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

مفتی صاحب بلاشبہ پاکستان کے آسمانِ علم و سیاست کے مہِ کامل تھے اور دُور دُور تک ان کے علم و فضل کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، لیکن قریب سے دیکھنے کے بعد مجھے ان کی دو خوبیاں نمایاں نظر آئیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اگر ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا، ان کا ساتھ دیتا، ان کی حمایت کرتا، ان کا ساتھ دیتا ان کی حمایت کرتا، تو وہ اسے کبھی بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ موقع و محل کے مطابق بات کرنے کے بادشاہ تھے۔ ان کی ان دو خوبیوں پر مَیں دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایوب خاں مرحوم کے دور میں جب ان کے خلاف جمہوری تحریک کا آغاز ہُوا تو مختلف الخیال جماعتوں کے باہمی اتّحاد سے جمہوری مجلسِ عمل کا قیام عمل میں آیا۔ ملتان کے ایک جلسۂ عام میں مولانا محمد علی جالندھری سے اس کے بارے میں ایک شخص نے ان کی تقریر ہی میں سوال کر دیا کہ اس متحدہ محاذ کی شرعی حیثیت کیا ہے، جس میں سُنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث حتّٰی کہ روس اور امریکہ نواز جماعتوں کے لیڈر بھی موجود ہیں۔ سوال کرنے والے کا روئے سخن مفتی محمود صاحب کی طرف تھا جو جمعیت کے لیڈر تھے اور جمعیت بھی جمہوری مجلسِ عمل میں شامل تھی، لیکن اس نے یہ سوال مولانا جالندھری کی تقریر کے دوران اٹھایا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ وہ خالصتاً مذہبی آدمی ہیں، اس سیاسی سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے اور دوسرے مقرّرین آئیں گے تو ان کا روئے سخن ملکی مسائل کے بجائے اپنے ہی حلیف لیڈروں کی طرف ہو جائے گا۔ اس طرح ان جماعتوں کے کارکنوں میں ان کے لیڈر موضوعِ سخن بن جائیں گے۔ مولانا جالندھری نے سوال سن کر کہا کہ جس شخص نے یہ سوال کیا ہے وہ تقریر کے بعد مجھ سے ملے، مَیں اس کو تسلّی بخش جواب دوں گا، لیکن سوال کرنے والے صاحب نے چیخ چیخ کر اصرار کرنا شروع کر دیا کہ ان کے سوال کا جواب جلسۂ عام میں دیا جائے۔ مولانا محمد علی جالندھری نے کہا ٹھیک ہے آپ بیٹھ جائیں مَیں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ جب وہ بیٹھ گیا، تو کہنے لگے فرض کریں ایک بہت بڑا "چوراستہ" ہے، کراچی، پنڈی، پشاور، ملتان اور لاہور جانے والے لوگ اسی چوراہے سے گزر کر جاتے ہیں۔ اس چوراہے کے ایک کنارے پر بہت بڑا درخت تھا جو اچانک گر گیا اور اس نے گر کر رستہ روک دیا۔ ادھر سے کراچی جانے والے آئے تو دیکھا رستہ بند ہے، لاہور والے پہنچے تو دیکھا رستہ بند ہے، ملتان والے گزرے تو دیکھا رستہ بند ہے۔ اب تمام شہروں سے آنے والے اس چوراہے میں آ کر رُک گئے۔ ان کے پیچھے آنے والے بھی رُک گئے۔ میلوں تک ٹریفک رک گئی۔ پچھلوں کو چوراہے میں موجود اس آفت کا علم نہیں تھا، وہ ہارن دینے لگے، ہر طرف شور مچ گیا، کان پڑی آواز کا سننا مشکل ہو گیا۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ تمام لوگ شور سے بے نیاز اپنے پیچھے آنے والوں کا راستہ روک کر کھڑے رہیں۔ اس طرح ایک درخت کے گرنے سے پورے ملک کے لوگ متاثر ہوں گے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک پہنچنا سب کے لیے ناممکن ہو گا، پیچھے آنے والے لوگ آگے والوں کو کوسیں گے، آگے والے سخت سُست باتیں سُن کر پیچھے آنے والوں سے دست و گریبان ہو جائیں گے۔ ان کی یہ لڑائی پُورے ملک کے لوگوں کو

www.tezpakistan.com

سے زیادہ اس قومی امانت کا مستحق ہے تو مجھے بتا دو، مَیں تمہارے فیصلے کے احترام میں الیکشن سے دست بردار ہونے کا اعلان کرتا ہوں، تمام لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے، نہیں نہیں ہرگز نہیں کے نعرے لگا کر مفتی صاحب کو ووٹ دے کر کامیاب کرنے کا وعدہ کیا۔

مفتی صاحب نے دوسری بات یہ کی کہ سندھ کا ایک جاگیردار یہاں صرف اس لیے الیکشن لڑ رہا ہے کہ اسے اپنی دولت پر گھمنڈ ہے اور وہ اس دولت سے لوگوں کے ایمان کا سودا کرنا چاہتا ہے۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ اس حلقے کے غیور لوگ ایمان فروش یا ضمیر فروش نہیں، کیا اس نے آپ لوگوں کو بے غیرت سمجھ رکھا ہے؟ مَیں اعلان کرتا ہوں کہ سندھ کا کوئی غریب شخص یا کوئی ایمان دار آدمی میرے مقابلے میں آئے تو مَیں اسے بلا مقابلہ کامیاب کرنے کے لیے تیار ہوں، مَیں صرف ایک جاگیردار کا غرور توڑنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے اس میدان میں اُترا ہوں کہ پاکستان کی زندہ اور غیور قوم حق و انصاف کا فیصلہ کرے گی، ابھی اور اسی وقت جو بھی ایمان دار شخص مجھے بٹھانا چاہتا ہے وہ مجھے بتائے، مَیں ابھی اعلان کرنے کے لیے تیار ہوں کہ مَیں ایک غریب، شریف اور ایمان دار آدمی کے مقابلے میں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں، لیکن ایک ظالم و ڈیرے کے مقابلے سے دُنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔

مفتی صاحب کی یہ تقریر رات کے بارہ بجے ختم ہوئی۔ اس کے بعد انتخابی مہم کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ یہ ان کی آخری تقریر تھی اور حلقے کی اکثریت یہاں موجود تھی، انہوں نے یہ تقریر سن کر ہی مفتی صاحب کے حق میں فیصلہ دے دیا اور یہ واحد حلقہ تھا جس میں وہ جاگیردار کامیاب نہ ہو سکا اور اسے اعلان کرنا پڑا کہ میں مفتی محمود کے مقابلے میں آئندہ کبھی بھی الیکشن نہیں لڑوں گا۔

بعد ازاں جب مفتی صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ آپ نے ایسی زبردست تقریر پہلے کیوں نہیں کی، ہنس کر کہنے لگے، یہ آخری دن کی تقریر تھی، اس سے پہلے یہ تقریر ہوتی تو شاطر حریف کوئی اور نیا جال بچھا دیتا۔ اس تقریر کے بعد دولت کا کوئی جال بچھانے کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔

مولانا محمد یوسف (جامعہ اشرفیہ، نیلا گنبد لاہور)

وہ، علم کے علاوہ
ہر چیز بھول جاتے
سیاست، ان کی کلاس میں شجرِ ممنوعہ تھی

پہلی بات تو یہ ہے کہ مدرسے کے تمام ذہین اور باصلاحیت طالب علم ان کی نظر میں ہوتے تھے، خواہ اُن سے انہوں نے کبھی بات

www.tezpakistan.com

کی ہو یا نہ کی ہو۔ وہ ان کے پاس پڑھتے ہوں یا کسی اور استاد کے پاس۔ بہت سے استاد نا اہل لڑکوں کو پڑھانے سے جی چراتے ہیں، لیکن مفتی صاحب کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ اگر ایک کتاب پڑھنے والے بیس طالب علم ہوں اور ان میں صرف ایک لائق ہو، تو وہ اس کلاس کو پڑھانے کے لیے اپنے سیاسی پروگرام ترک کر کے مدرسے میں پہنچتے اور انہیں پڑھاتے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ اگر ایک باصلاحیت آدمی بھی موجود ہو، تو اس کا تعلیم کا حق اسے ملنا چاہیئے اور یہ حق اسے دینے کا طریقہ یہ ہے کہ اس طالب علم کو استاد ہر حالت میں پڑھائے، خواہ اسے کیسی ہی مجبوری کیوں نہ ہو۔ اس طالب علم کے اسباق کا ناغہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تو کہنے کی حد تک بات تھی۔ درحقیقت وہ چاہتے تھے کہ لائق طلبا کی کلاس میں اتنی محنت کی جائے کہ تمام طالب علم لائق اور باصلاحیت بن جائیں۔ ایک ہی کلاس کے طالب علموں کو پڑھاتے ہوئے وہ ذہین اور غبی ہر قسم کے طلبہ کے خیال رکھتے، ان کی سمجھ اور صلاحیت کے مطابق بات کرتے، کسی لائق طالب علم کو اجازت نہیں تھی کہ کسی کمزور ذہن طالب علم کا مذاق اُڑائے۔ اگر کلاس میں زیادہ طالب علم نالائق جمع ہو جائیں، تو مفتی صاحب اس کلاس کے ذہین طالب علموں کو ان کے بدلے سرزنش کرتے تھے، انہیں یہ کہہ کر غیرت دلاتے تھے کہ تم نے اپنا سبق یاد کیا، تو کیا کیا، کمال تو یہ ہے کہ تم اپنے کمزور ساتھیوں کی مدد کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے، تو کتابیں پڑھانے کی اہلیت پیدا نہیں ہو گی۔ وہی طالب علم کامیاب کتابی مدرّس بن سکتا ہے جو زمانۂ طالب علمی میں اپنے ساتھیوں کو پڑھاتا اور یاد کراتا ہے۔ اس قسم کے طلبہ پر مفتی صاحب خود بھی زیادہ توجہ دیتے تھے اور ان کے مقابلے میں ذہین طلبہ کے لیے یہ فراخدلی موجود تھی کہ وہ جب چاہیں مفتی صاحب سے کوئی سوال پوچھ سکتے ہیں۔ ان کو یہ رعایت ان کی ذہانت کی بنا پر نہیں دیتے تھے، بلکہ اس بنا پر دیتے تھے کہ کلاس میں مفتی صاحب کی زیادہ توجہ کمزور طالب علموں کی طرف ہوتی تھی۔ وہ ذہین طالب علم کو کہہ دیتے تھے کہ اس نے اپنی محنت سے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے ہوں گے۔ جبکہ کمزور طالب علموں کے ساتھ انہیں بہت دماغ سوزی سے کام لینا پڑتا اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ مفتی صاحب کی محنت کے نتیجے میں نالائق اور کمزور طالب علم اچھے نمبروں میں کامیاب ہو جاتے۔

مفتی صاحب کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی اولاد کو مدرسے کے نظام اور عمل دخل سے بہت دُور رکھا۔ ان کے لڑکوں کو ان کی زندگی میں مدرسے میں کوئی فوقیت یا برتری حاصل نہیں رہی۔ جو لڑکا جتنی دیر وہاں پڑھا اُسے اسی طرح مدرسے کے نظام کی پابندی سے گزرنا پڑا اور مفتی صاحب نے ان کے قریب سے بھی یہ خیال نہیں گزرنے دیا کہ ان کا بھی اس مدرسے سے کوئی غیر معمولی تعلق ہے۔ علاوہ ازیں مفتی صاحب نے کبھی کسی استاد کے سامنے اپنی اولاد کی سفارش نہیں کی، کسی کو خصوصی توجہ دینے کے لیے نہیں کہا۔ انہیں اس بات کا عادی بنایا کہ محنت کریں، امتحان دیں اور اچھے نمبر حاصل کریں۔ یہی وجہ تھی کہ مدرسے کے تمام اساتذہ مفتی صاحب سے ہمیشہ خوش رہتے اور مفتی صاحب کی خوش اخلاقی اور مدرسین کے ساتھ اچھے برتاؤ کے باعث ان کی اولاد پر اساتذہ نے خود بخود ہی توجہ دی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا فضل الرحمان نے زیادہ تر کتابیں اکوڑہ خٹک میں پڑھی ہیں، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ بعض اساتذہ محض مفتی صاحب کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم کا زیادہ خیال کرتے تھے، چنانچہ مفتی صاحب نے انہیں اپنے مدرسے سے دُور بھیج دیا تاکہ کوئی استاد اُسے یہاں زیادہ توجہ دے کر دوسرے طلبہ کی حق تلفی نہ کرے اور طلبہ کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ اگر ہم بھی کسی بڑے باپ کے بیٹے ہوتے، تو ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا۔

مفتی صاحب کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اتنے مشہور قومی رہنما ہونے کے باوجود اپنی درسگاہ میں وہ سب کچھ بھول جاتے تھے۔ وہ طلبہ کو سیاست سے بچانے کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مدرسے کی حدود میں سیاسی گفتگو نہیں کی۔ اتنے بڑے سیاستدان کی کلاس میں سیاست بشجرِ ممنوعہ تھی۔ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ مفتی صاحب اسلام آباد سے آکر درسِ حدیث دیتے رہے۔ وہاں پر تمام گفتگو سیاسی اور درس گاہ میں تمام گفتگو غیر سیاسی، خالصتاً علمی، ہم حیران تھے کہ یہ ایک ہی آدمی دو مقامات پر دو جداگانہ رُوپ میں کیسے نظر آتا ہے۔ اسلام آباد ہے تو خالص سیاستدان، ملتان ہے تو نرا عالم۔ یہ ممکن نہیں کہ آدمی صبح کی گفتگو شام کو بھول جاتا ہو اور شام کی بات کو صبح فراموش کر دے۔ اتنی جلدی مزاج میں تبدیلی لانا ممکن نہیں، لیکن ہم نے مفتی محمود کی شخصیت میں یہ "اجتماعِ ضدین" اپنی آنکھوں سے دیکھا

www.tezpakistan.com

ہے۔ کسی طالب علم کے پوچھنے پر کوئی بات کر لینا یا واقعہ سُنا دینا الگ بات ہے۔ ایسا تو یقیناً ہوتا رہا ہے، لیکن ایک سیاستدان کو جس طرح باتیں کرنی چاہییں، مفتی صاحب نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اگر کسی طالب علم نے بھی کوئی سوال کیا اور انہوں نے جواب دیا تو یہ عمل درسگاہ سے باہر ہوا، درسگاہ کے ساتھ ایسی باتوں کا کوئی تعلق نہیں تھا، کیونکہ مفتی صاحب درس گاہ میں کسی طالب علم کے ایسے سوال کا جواب ہی نہیں دیتے تھے۔ اگر کوئی پُوچھتا تھا تو کہہ دیتے تھے یہ "دارالحدیث" ہے۔ ان کا اتنا کہنا ہی کافی ہوتا تھا اور پھر کسی طالب علم کو کوئی مزید بات پوچھنے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔

مفتی صاحب کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سبق کا ناغہ نہیں کرتے تھے۔ ملتان سے باہر ہوں تو الگ بات ہے۔ ملتان کے اندر رہ کر بحالتِ علالت بھی سبق پڑھانا ان کا معمول تھا۔ ایک بار وہ اس قدر بیمار تھے کہ ڈاکٹروں نے کہا اگر آپ نے آرام نہ کیا، تو آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ بات بڑی اہم تھی اور طلبہ میں بھی یہ بات مشہور ہو چکی تھی؛ چنانچہ مفتی صاحب سے خود طلبا نے بھی استدعا کی کہ وہ آرام کر لیں، لیکن مفتی صاحب پڑھانے سے باز نہ آئے۔ ایک طالب علم نے دبے لفظوں میں کہہ دیا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آپ نے آرام نہ کیا، تو بہت خطرے کی بات ہو گی۔ مفتی صاحب کہنے لگے کیا میں اپنی زندگی بچانے کے لیے ان غریبوں کی زندگی تباہ کر دوں؟ بحیثیت استاد میں نے ان کے مستقبل کی ذمہ داری لی ہے۔ اگر میں انہیں نہیں پڑھاؤں گا، تو میری یہ آرام طلبی ان کے روشن مستقبل کو تاریک کرنے کے مترادف ہو گی۔ اس بیماری کی حالت میں بھی مفتی صاحب صبح سات بجے سے لے کر ایک بجے تک مسلسل پڑھاتے تھے۔ میرا خیال ہے اپنے شاگردوں کے لیے اس قدر ایثار کا مظاہرہ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

مفتی صاحب کی پانچویں خصوصیت یہ تھی کہ وہ طلبہ کو مطمئن کیے بغیر درس گاہ سے نہیں اٹھتے تھے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ کلاس کا وقت ختم ہوا تو اساتذہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی طالب علم کا کوئی سوال ہے، تو اگلے روز پر جا پڑا، دوسرے روز ضروری نہیں کہ طالب علم اپنا سوال دُہرائے یا اُسے اس کا موقع بھی ملے۔ مفتی صاحب کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ جب تک تمام سوالات کے جوابات نہیں دے دیتے تھے، اس وقت تک درس گاہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ ہر سوال کا فوری جواب دے کر یہ بات ختم کرنا چاہتے ہیں، اس معاملے میں آج کی بات کل پر ٹالنے کے روادار نہیں تھے اور نہ سوالات سے ان کی طبیعت پر کوئی اثر پڑتا تھا۔

مفتی صاحب نے ۱۹۷۶ء میں زندگی میں پہلی بار لاہور کے مدرسے قاسم العلوم میں "دورۂ تفسیر" پڑھایا۔ اس دورے کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار تفسیرِ قرآن کتابی انداز میں پڑھائی گئی۔ یہ تمام مفسرین سے مختلف انداز تھا جو مفتی صاحب نے اختیار کیا۔ کتابی اور تفسیری طریقِ تعلیم میں فرق یہ ہوتا ہے کہ تفسیری طرزِ تعلیم میں آیت کے ربط، شانِ نزول اور لغوی و معنوی مباحث کو بیان کیا جاتا ہے، جبکہ کتابی طرزِ تعلیم میں آیت کا مقصد، اس کے تحت آنے والے مسائلِ زندگی اور مستنبط ہونے والے ہر فقہی مسائل کو سمجھا جاتا ہے اور یہی چیز علم کے لیے ضروری ہے۔ تفسیری طریقِ تعلیم میں ربط اور شانِ نزول کو جو اوّلیت دی جاتی ہے، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آیات کے مقاصد پر بحث کی جائے۔ جو معلّم اور متعلّم ہی کی نہیں عام آدمی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ بات ہمیں پہلی بار مفتی صاحب سے دورۂ تفسیر پڑھ کر سمجھ آئی۔

دو باتیں

لاہور میں جناب مفتی صاحب مرحوم کے ایک عقیدت مند جناب غلام دستگیر صاحب سے قومی ڈائجسٹ کے "مفتی محمود نمبر" کے سلسلے میں رابطہ قائم کیا گیا، کیونکہ انہیں بیشتر مواقع پر مفتی صاحب کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا رہا؛ چنانچہ ان سے مفتی صاحب کے حوالے سے بہت سی باتیں معلوم ہونے کی توقع تھی، مگر افسوس کہ جناب غلام دستگیر شدید علیل تھے اور ڈاکٹر نے انہیں گفتگو سے بھی اجتناب کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے رقت انگیز لہجے میں دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ انہوں نے کہا: "مفتی صاحب مرحوم کو پاکستان کے لوگوں نے صحیح معنوں میں نہ سمجھا۔" اور پھر ذرا توقف کے بعد کہا: "میں سوچتا تھا مفتی صاحب کے انتقال کے سلسلے میں کوئی مجھ سے بھی تعزیت کرے گا، مگر افسوس، یہ توفیق کسی کو بھی نہ ہوئی۔"

www.tezpakistan.com

جُرأتِ اظہار

www.tezpakistan.com

اِک چراغِ شعلہ پرور اُٹھ گیا

مردِ حق، مردِ قلندر اُٹھ گیا
روشنی کا ایک پیکر اُٹھ گیا

قائدِ تحریکِ نامِ مصطفےٰ
ولولوں کا میرِ لشکر اُٹھ گیا

سادگی کی ایک تابندہ مثال
سوزِ حق کا ایک پیکر اُٹھ گیا

ایک دانائے شریعت چل بسا
منزلِ عرفاں کا رہبر اُٹھ گیا

عزم جس کا کوہساروں سے قوی
علم کا نقشِ منوّر اُٹھ گیا

ہائے وہ دیوانۂ حُبِّ رسولؐ
عاشقِ حُسنِ پیمبر اُٹھ گیا

سومناتِ آمریت توڑ کر
غزنوی کا ایک ہمسر اُٹھ گیا

ایک درویشِ خدا آگاہ تھا
دین کے موتی لُٹا کر اُٹھ گیا

جس نے دی ظالم خزاؤں کو شکست
بزمِ گُل کا وہ دلاور اُٹھ گیا

اتحادِ قوم کا داعی تھا وہ
آگ سینوں میں لگا کر اُٹھ گیا

مفتیٔ ملّت کی رحلت کیا ہوئی
اِک چراغِ شعلہ پرور اُٹھ گیا

غافلؔ کرنالی

www.tezpakistan.com

۷۰ء سے ۷۷ء تک

انتخابات سے پہلے
انتخابات کے بعد
تقریریں، تقریریں، تقریریں

"اسلامی طریقِ انتخاب"

پاکستان کے بارہ کروڑ عوام کا اصل دشمن سرمایہ دارانہ نظام ہے جس کے تحفظ کے لیے بعض لوگ اسلام کے نام پر "سوشلزم کے مفروضے" کے خلاف واویلا کر کے پاکستانی عوام کی توجہ اصل دشمن سے ہٹانا چاہتے ہیں ہمارا مقصد اس ملک میں اسلامی نظام کا قیام، استحکامِ پاکستان اور تمام طاقتوں کو جنہوں نے پاکستان کے مسائل کو الجھایا ہے، شکست دینا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی جدوجہد کا رُخ مغربی سامراج کی اور اینگلو امریکی بلاک کی طرف جائے، کیونکہ اس وقت عالمِ اسلام کے تمام مسائل سامراجی طاقتوں کے پیدا کردہ ہیں، ان میں کشمیر، فلسطین، مشرقِ وسطیٰ اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کے مسائل شامل ہیں، ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کا وجود جس کے تحت محنت کش طبقے اپنے حقوق سے محروم ہیں، امریکہ، زُدس اور اس کے ایجنٹوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ جب تک پاکستان میں عدل و انصاف کے مطابق لوگوں کو ضروریاتِ زندگی مہیا نہیں کی جاتیں، موجودہ بے چینی و اضطراب ختم نہیں ہو سکتا، ہماری جماعت سرمایہ دارانہ نظام کو مکمل شکست دے کر اس کی جگہ اسلام کا عادلانہ نظام نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس سے نہ صرف پاکستان کو مغربی طاقتوں بلکہ اشتراکیت کے مضر اثرات سے بھی نجات مل جائے گی۔ کچھ لوگ اس ملک میں اسلام کا نام لے کر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو تحفظ دے رہے ہیں، وہ نہ تو اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، نہ پاکستان کی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں جس قسم کا جمہوری نظام موجود ہے وہ اسلام کے منافی ہے۔ اگر پاکستان میں انتخابات جمہوری طریقے پر کرائے جائیں۔ تو عوام کے نمائندے ہرگز منتخب نہیں ہو سکیں گے اور پارلیمنٹ میں سرمایہ داروں، اوباشوں اور ریلے دینوں کی بھرمار ہو جائے گی۔ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہر قسم کی نمائندگی کے لیے شرط ہوتی ہے، لیکن ملک کے قانون ساز اداروں میں نمائندگی کے لیے ۲۵ سال کی عمر کا ہونا اور پاگل نہ ہونا شرط ہے۔ ہم انتخابات کے لیے جو اسلامی طریقہ تجویز کرتے ہیں اس میں نمائندے کے لیے خاص اہلیت کا کافی ہونا ضروری ہے۔ یعنی صرف وہی شخص انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے جو علم و عمل، دیانت و امانت اور تجربے و مہارت کے ترازو میں تل سکتا ہو، ہم سرمایہ داروں کے لیے

www.tezpakistan.com

جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک فی صد ہے، پانچ فی صد نشستیں مخصوص کرنے کے لیے تیار ہیں اور باقی پچانوے فی صد عوام کے لیے مخصوص کر دی جائیں، تو عوام اپنے دیانت دار نمائندوں کو خود منتخب کریں گے، بصورت دیگر مروجہ طریق کار میں دولتمند اپنی دولت کے بل پر پارلیمنٹ کی تمام نشستوں پر قابض ہو جائیں گے۔ ہم انتخابات کے بارے میں چیف الیکشن کمشنر کے اعلان کردہ شیڈول کو باعث اطمینان سمجھتے ہیں اور اگر اس دوران حلقہ بندی کا کام بھی جاری رہے اور انتخابات بھی قریب لائے جائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس وقت صرف چند مسائل حل طلب ہیں.....

مثلاً ون یونٹ کی تنسیخ، آبادی یا مساوات کی بنیاد پر نمائندگی اور دو ایوانی یا ایک ایوانی پارلیمنٹ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے صدر مملکت کو چاہیئے کہ وہ ایک گول میز کانفرنس طلب کریں جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو مدعو کیا جائے اور باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ مفاہمت کی کوئی صورت نکال لیں"

"ہم یحییٰ خان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ انتخابات غیر جانبدارانہ طور پر منعقد کرانے کے لیے سرمایہ داروں کی دولت کو وقتی طور پر منجمد کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر اسمبلیوں کی نشستوں پر قابض نہ ہو سکیں۔ اگر جاگیردار اور لادینی نظریات کے علمبردار ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی کوششوں کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے تو ہمہ گیر بغاوت کرا دیں گے۔ میری جماعت ملک میں دوبارہ غیر اسلامی آئین مسلط کرنے کی ہر کوشش کا مقابلہ کرے گی جس سے عوامی استحصال کیا گیا ہو، اسلام ہی کی بدولت پاکستان زندہ و سلامت ہے اور کسی اور نظام کی بدولت یہ ملک کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔"

قیام پاکستان کے وقت ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ ملک میں اسلامی قانون نافذ کیا جائے گا اور ملک ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو گا مگر بعد میں اس چیز کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ ہماری پچھلی ۲۳ سالہ تاریخ میں مایوسی، استحصال اور تشدد کا دور دورہ رہا ہے جس میں عوام کو ان کے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے، عوام اس وقت سرمایہ داری اور جاگیرداری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جبر و جور سے کراہ رہے ہیں۔ پاکستان اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا تھا مگر افسوس کا مقام ہے کہ ابھی تک ملک میں اس نظام کو نافذ کرنے کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا اور ملک ابھی تک آئین سے بھی محروم ہے اور غیر اسلامی قوانین نافذ ہیں۔ ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور عوام کی رسائی سے باہر ہیں، برطانوی سامراج کے دور میں چیزوں کی قیمتیں ایک معقول حد میں رہتی تھیں مگر اب سرمایہ دار اور جاگیردار عوام کو باعزت اور باوقار زندگی گزارنے سے محروم کر رہے ہیں۔ اب تک برسر اقتدار آنے والے لوگوں نے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دی ہے۔ اگر ہم برسر اقتدار آئے تو ہم سرمایہ داری کو ختم کر دیں گے اور ملک میں قرآن و سنت کے مطابق نظام رائج کریں گے۔"

GULF HOTEL
is far better - try it
Frere Street Saddar
KARACHI
Phone : 515830—39

www.tezpakistan.com

* صوبہ سرحد کے عوام نے حالیہ انتخابات میں ثابت کر دیا ہے کہ وہ جاگیرداری اور ملکی سیاست پر چند سیاستدانوں کی اجارہ داری کے سخت خلاف ہیں، مزید برآں انہوں نے جمعیت کو ووٹ دے کر اپنی اسلام دوستی کا بھی ثبوت دیا ہے لہٰذا میری جماعت بھی عوام کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائے گی۔ اور وہ عوام کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق اسلامی آئین بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ پاکستان میں صرف اسلام کا ہی بول بالا ہوگا۔ یہاں پر کسی غیر ملکی ازم یا نظریئے کی کوئی گنجائش نہیں، مَیں امریکی ایجنٹوں کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ پاکستان میں اپنی مذموم کارروائیوں اور ہتھکنڈوں سے باز رہیں۔ اب کوئی طاقت بھی پاکستان میں امریکی مفادات کی نگہداشت نہیں کر سکتی، ہم اس سرزمین سے امریکی اثر و نفوذ تہس نہس ہی کر کے چھوڑیں گے۔ ہم صرف ایک پاکستان پر یقین رکھتے ہیں، ایسا پاکستان جو مضبوط بھی ہو اور ناقابلِ تقسیم بھی۔ ہم صوبہ سرحد میں حکومت بنانے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔"[۵۴]

* ہم چھ نکات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ قومی اسمبلی میں جانے کا مقصد ان کو تسلیم کرنا ہے۔ ہم صرف پاکستان کی سلامتی اور پانچوں صوبوں کے مفادات کا ضامن آئین قبول کریں گے، لیکن اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اسمبلی میں پہنچ کر ایسے مؤقف کے لیے باقاعدہ لڑا جائے۔ اس لیے ہم قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کریں گے، ہاں اگر ہماری بات نہ سُنی گئی تو ہم واک آؤٹ کر سکتے ہیں، لیکن اسمبلی میں جانے سے پہلے بائیکاٹ کا کوئی جواز نہیں جس طرح چھ نکات کو پاکستان کی سلامتی کے منافی خیال کیا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ اسمبلی کے بائیکاٹ سے ملک کی تقسیم ہونے کا اندیشہ اور بڑھ جائیگا۔"[۵۵]

* "سنہ ۱۹۷۰ء میں میرا مقابلہ صرف ایک حلقہ انتخاب سے بھٹو کے ساتھ ہوا تھا اور وہ ہار گئے تھے، آج پورے ملک کے ہر حلقہ انتخابات کی گھڑی آ پہنچی ہے، ریڈیو، ٹی وی اور پریس پر حکمران ٹولے کا غاصبانہ قبضہ ہے۔ اب مطالبہ کا وقت گزر چکا ہے ہم خود اُن سے برابر کا وقت لیں گے، انھیں دینا پڑے گا، تم نے جیپیں، موٹر سائیکل اور گاڑیاں اپنی پارٹی کے کارکنوں میں تقسیم کیں، یہ پیسہ کہاں سے آیا، مَیں بتاتا ہوں، سیلاب کے نام پر اربوں ڈالر کی امداد کا حساب دو، یہ حساب تم سے لیا جائیگا۔ غارتگری کا بازار گرم ہے، دیر میں سینکڑوں آدمی قتل کر دیئے گئے ہیں جنوبی وزیرستان میں وانا کے مرکزی مقام کو توپوں سے مسمار کر کے بلڈوزر چلا دیا گیا۔ آج وانا شہر کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ پاکستان کئی ارب روپے کا مقروض ہے ان قرض دینے والوں کو مَیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم عیاشی کے قرضے ادا نہیں کریں گے، ہم صرف نفع بخش قرضے واپس کرنے کے پابند ہیں، آپ لوگ اُٹھیے اور قومی اتحاد کے امیدواروں کو کامیاب بنایئے۔"

* آج کے سورج کی طرح اقتدار کا سورج بھی غروب ہونے کو ہے، کیونکہ عوام نے انھیں مسترد کر دیا ہے۔ اور پاکستان کو توڑنے والے ہم پر، جنہوں نے تیس برس ملک کی خدمت کی، غداری کا الزام لگاتے ہیں، مجرموں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں پر الزام لگائیں۔ آپ لوگ دھاندلی کرنے والے ریٹرننگ افسر کا نام نوٹ کر لیں، اس سے پُورا پُورا حساب لیا جائے گا، آپ اس جذبے کو برقرار رکھیں اور وعدہ کریں کہ پیپلز پارٹی کے جلسوں کا رُخ نہیں کرینگے ہر رکاوٹ کو ہمت سے ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ مَیں آپ کو فتح و کامرانی کی خوشخبری دیتا ہوں۔"[۵۶]

* "آج کا یہ عظیم الشان جلسہ مسٹر بھٹو کے زوال کی دلیل ہے، مسٹر بھٹو کا اقتدار سات مارچ کو عوام کے اس سمندر میں ڈوب کر غرق ہو جائے گا جو ہر طرح کے اقتدار کے خاتمے کی تاریخ ہے، وہ غریبوں کا نام تو لیتے ہیں، لیکن کسانوں اور مزدوروں سے کوئی ہمدردی نہیں، انہوں نے اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت میں ان غریب لوگوں کے لیے کیا کیا ہے؟ صرف دُکھ دیئے ہیں، صوبہ سرحد کے اس مرکزی شہر میں آج جمع ہونے والے عوام جانتے ہیں کہ پاکستان کا قاتل کون ہے؟

www.tezpakistan.com

"اُدھر تم اِدھر ہم" کا نعرہ کس نے لگایا تھا؟ کہا جاتا ہے کہ انتخابات منصفانہ ہوں گے اور سرکاری پارٹی کا یہ عالم ہے کہ یہاں نصر اللہ خٹک کو بھی بلا مقابلہ کامیاب قرار دیا ہے۔ اخباروں میں چھپوایا گیا ہے کہ مولانا عبدالحق نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی واپس لے لیے ہیں۔ یہ قطعاً جھوٹ ہے۔

یہ وہ جگہ ہے یہاں ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو بے گناہ نوجوانوں کا خون بہایا گیا، یہاں پاکستان کے جیالوں نے جامِ شہادت نوش کیا، تین گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی، خون تھا، لاشیں تھیں، آپ نے، مَیں نے یہ بھیانک منظر برسوں پہلے دیکھا، آج دُعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ان شہیدوں کے طفیل ہمیں جنت دلائے، مَیں نوکر شاہی سے کہتا ہوں وہ بھول جائے، دھاندلیوں سے حکمرانوں کو جتوانا بھول جائے، مَیں کہتا ہوں حکمران تو شاید ملک سے چلے جائیں، لیکن اب نوکر شاہی کو یہیں رہنا ہے، ہم سزا دیں گے، بدعنوانوں کو، دھاندلی میں ہاتھ ڈالنے والوں کو۔[۵]

✺ ان کے مظالم کے تمام پہلو سامنے آچکے ہیں پُوری تنظیم کے ساتھ متحد رہیں اور ہر صورت میں قوم کو ظالم سے نجات دلائیں۔ مَیں اس سلسلے میں اعلان کرتا ہوں کہ آج سے ہفتہ نجات منایا جائیگا، پیپلز پارٹی کی آمریت سے جمہوری اصولوں کے مطابق بیلٹ پیپر کے ذریعے نجات حاصل کرنے کے لیے پوری قوم آج سے ہفتہ نجات منائے گی، آپ ہر ذریعے سے اظہار کریں کہ ہم نے لازماً ظالم سے نجات حاصل کرنا ہے۔

مسٹر بھٹو نے ہمارے نشانِ ہل کا مذاق اڑایا ہے کہ ٹریکٹروں کے زمانے میں ہل استعمال کر رہے ہیں مَیں کہتا ہوں ایٹم بم کے زمانے میں تم کیوں تلوار استعمال کر رہے ہو۔ ہل تو کسان آج بھی استعمال کرتے ہیں، تلوار متروک ہو چکی ہے۔ تلوار ہلاکت کی علامت ہے اور ہل آبادی کی نشانی ہے!....

ہمارے یہاں بھی بے یقینی اور بے دینی کے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ عوام میں غلط قسم کی سیاسی، اقتصادی و معاشی درجہ بندی ہے۔ اور ان باتوں کے نتیجہ میں ہر طرف بے چینی، بے اطمینانی اور انتشار سر اٹھائے ہوئے ہیں جب تک ہم ان سب کا ازالہ نہیں کر لیتے ایک بہتر مستقبل کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہمیں پاکستان کی نئی نسل کو بے یقینی اور بے دینی کے خطرات سے بچانا ہے۔ ہمیں سیاسی جبر و روایات کا خاتمہ کرنا ہے۔ ہمیں اقتصادی تفاوت کے ایسے جھول دُور کرنے ہیں جن سے بے چینی اور بے اطمینانی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان دونوں مقاصد کو اسلامی احکام کے ذریعہ ہی بہتر طریقہ پر حاصل کیا جا سکتا ہے جب ایک بار ملک میں اللہ کی حاکمیت کا اصول نافذ ہو جاتا ہے تو قرآن و سنت کے تمام احکام اور ارشادات دستور و قانون کی اساس قرار پا جاتے ہیں اور ملک کے تمام انتظامی محکمے عدلیہ، پولیس اور فوج وغیرہ ان احکام کی پابند بنا دی جاتی ہیں، تو اس کے بعد کسی بھی گروہ کے لیے سیاسی جبر و بالادستی کے مواقع باقی نہیں رہتے۔ اسلام کی رُو سے سربراہِ مملکت سے لے کر ایک عام شہری تک اسلامی احکام کے اجرا و نفاذ کی پابندی سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا۔ اور سب یکساں طور پر قانون کے سامنے جواب دہ بن جاتے ہیں، اس طرح تمام سیاسی بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہم ایک ایسے نظامِ حیات کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں جو ہمیں عہدِ حاضر کی تمام غیر اسلامی باتوں سے نجات دے سکے، اور رفتہ رفتہ خلافتِ راشدہ کے دَور کے نظام کی جھلک پیدا کر دے جس طرح عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز و تفاوت قائم نہیں تھا۔ حاکم و محکوم، راعی اور رعایا، خلیفہ اور عام مسلمان ایک ہی جیسی

---

[۱] یکم دسمبر ۷۰ء [۲] ۱۹ اکتوبر ۷۰ء، شمالی وزیرستان میں آئینِ شریعت کانفرنس سے خطاب [۳] ۲۸ اکتوبر، راولپنڈی میں جلسۂ عام سے خطاب [۴] ۱۵ دسمبر ۷۰ء، ڈیرہ اسماعیل خاں [۵] ۱۷ فروری، پریس کانفرنس [۶] ۲۳ جنوری، نشتر پارک کراچی، جلسۂ عام سے خطاب [۷] حیدر آباد میں جلسۂ عام سے خطاب [۸] ۴ فروری، راولپنڈی میں خطاب [۹] ۲ فروری لاہور میں خطاب۔

www.tezpakistan.com

زندگی بسر کر [illegible] اصل چیز دلوں
میں پیدا ہو جائے جیسے قرآن حکیم میں اِن لفظوں کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے : فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا۔
یعنی اللہ تعالےٰ کی مہربانی سے سب بھائی بھائی بن گئے۔ ہم پاکستان کے غریب عوام، کسانوں مزدوروں، طالب علموں اور تمام آدمیوں کو اس سطح پر لانا چاہتے ہیں جہاں پاکستان کے تمام مسلمان عملاً بھائی بھائی نظر آسکیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ بے لاگ طور پر ملک میں قرآن و سُنّت کے احکام نافذ کر دیئے جائیں۔ خاتم النبیّین اور خلفائے راشدین کے عہد کا عملی نمونہ اختیار کر لیا جائے اور ملک سے سیاسی، اقتصادی اور معاشی ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیا جائے۔

برطانوی سامراج نے ہمیں شب و روز کی چالوں اور سازشوں سے دو مختلف نظام ہائے تعلیم میں تقسیم کر دیا ہے جس کی وجہ سے یونیورسٹی اور مدرسہ دو اسلحہ ساز فیکٹریوں کی طرح اپنی اپنی پیداوار میں مسلسل و پیہم اضافہ کر رہے ہیں۔ اس کے لازمی نتیجہ میں نظریاتی جنگ جاری ہے اور پاکستان کوئی مستقل آئین بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دراصل مدارس کو یونیورسٹیوں سے علیحدہ رکھ کر دونوں نظاموں سے فارغ ہونے والے طلباء کے اذہان میں ایک تباہ کن خلا پیدا کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے دونوں میں نظریاتی جنگ بلا انقطاع جاری ہے۔ یونیورسٹیوں میں یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ علمِ دین پر دسترس حاصل کرنا چنداں سُودمند نہیں اور مدارس کے طلباء عصرِ جدید کے علوم و فنون سے بے بہرہ رہتے ہیں اور وہ اسے دین ہی نہیں سمجھتے۔ فی الحقیقت انگریز کا منشا بھی یہی تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لیے خلافت کے راستے سے بے بہرہ رہیں۔ بعض حضرات کو سکولوں اور کالجوں کی طرف بھیجا جو دین سے بالکل بے بہرہ ہیں لیکن اس کے لیے نصابِ تعلیم بھی ایسا تشکیل دیا کہ جسے پڑھ کر دین سے نفرت پیدا ہو اور کچھ لوگوں کو دنیا سے بالکل ناواقف رکھ کر دینی مدرسوں میں مقید کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلباء، تو حکومت کے محکموں میں آ نہیں سکتے کیوں کہ ان لوگوں کو دُنیاوی علوم سے واقفیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اختلاف و بحران ہے۔ اس سے بچاؤ کی ایک ہی صُورت ہے کہ جو فنی علوم پڑھتے ہیں، انھیں اُن طلباء عربیہ سے ملا دیا جائے، قرآن و حدیث سے جوڑ دیا جائے۔ اور یہ لوگ جو فرشتوں کی مانند ہیں، ان کو دُنیا والوں سے ملا دیا جائے تو اس طرح ہمارے ماہرینِ قانون مستقبل میں قوم کی بے نظیر رہنمائی کر سکیں گے۔" ۹

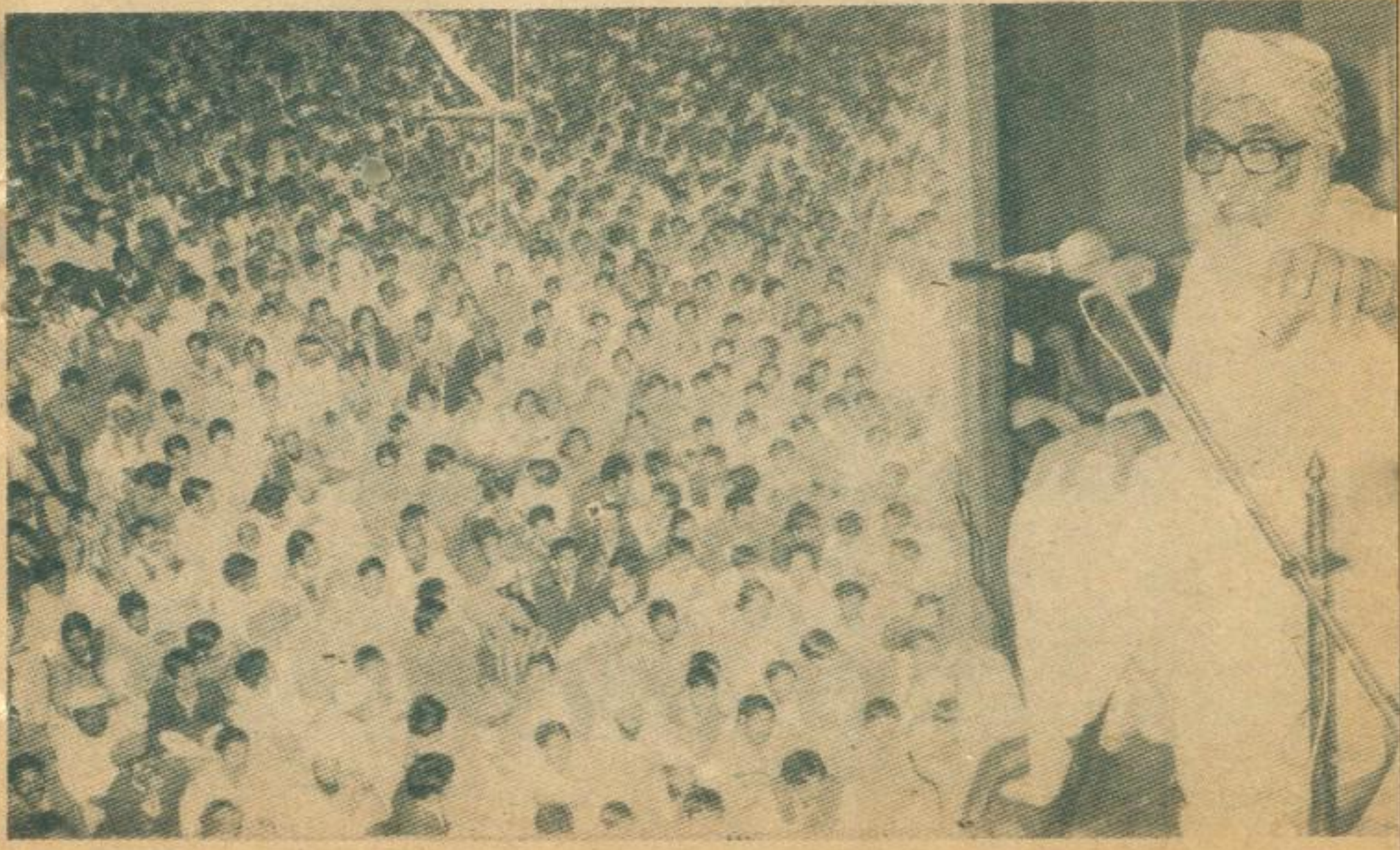

www.tezpakistan.com

مفتی صاحب، بعض جرائد کے اداریے لکھنے کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے — ذیل میں ان کے لکھے ہوئے ۱۹۷۵ء کے دوران ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کے منتخب اداریے ملاحظہ ہوں —

(۱)

جس کی خاطر
اَن گنت نوجوانوں نے خون دیا
ہزاروں بہو بیٹیوں نے عصمت قربان کر دی
لاکھوں افراد کو، آگ اور خون کا سمندر عبور کرنا پڑا —

یہ ہے اُس مُلک کا حال۔

پاکستان کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ اسے اپنی زندگی میں ایک دن بھی استحکام کی نعمت نصیب نہ ہو سکی، ہر آنے والا دن پہلے سے کہیں زیادہ اندوہناک اور پریشان کن ثابت ہوا۔ طالع آزما، مفاد پرست اور دولتِ ایثار و خلوص سے تہی دامن عناصر اس کی قسمت سے بُری طرح کھیلتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پے در پے حوادث رُونما ہوتے رہے، حتیٰ کہ ملک دولخت ہو گیا۔

مدتوں کی سردردی اور پریشان حالی کے بعد خدا خدا کر کے ایک دستور ملک کو ملا جس کی ترتیب و تدوین کے دوران ننھی منی اقلیت کو اتنا پریشان کیا گیا کہ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے، لیکن حزبِ اختلاف نے ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے جذبے کے پیشِ نظر انتہا پسندی کا نظریہ ترک کر کے مفاہمت و مصالحت کی روش اپنائی اور ایک ایسے حریف سے مذاکرات کا ڈول ڈالا جس کے لیے زبان کی پاسداری اور دوسروں کے لیے بہتر جذبات کی کوئی اہمیت نہ تھی، لیکن حزبِ اختلاف کو اپنے شخصی مسائل سے کہیں زیادہ ملک و قوم کا مفاد عزیز تھا، اس لیے انہوں نے سب کچھ برداشت کیا اور بالآخر اس خلوص و ایثار کے نتیجے میں ملک کو ایک دستور مل گیا جو بہر حال بڑی حد تک اسلامیت، وفاقیت اور جمہوریت کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا اور میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر اس کو چلانے والے مخلص و ایماندار ہوں، تو ملک و ملت کے سارے ہی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

لیکن جو عناصر نہیں، بلکہ فردِ واحد اس وقت سیاہ و سفید کا مالک ہے، اس نے جس طرح دستور کی مٹی پلید کرنے کا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے، وہ ایک دردناک حقیقت ہے۔

بنیادی حقوق معطل ہیں، ملک ایمرجنسی کا شکار ہے اور ظلم و تشدد کا ہر حربہ آزمایا جا رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں سرحد کے وزیرِ داخلہ اور بھٹو صاحب کے یارِ وفادار شیرپاؤ ایک حادثے کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں چلے گئے، تو اس کو سبھی نے محسوس کیا۔ حزبِ اختلاف کے چھوٹے بڑے تمام قائدین اور کارکنوں نے شدید اختلافات کے باوصف اس سنگین اور خطرناک حادثے کی مذمت کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ قاتلوں کو سامنے لائے اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچائے تاکہ سیاست میں تشدد کا رجحان ختم ہو۔

اس معاملے میں حزبِ اختلاف نے حکومت کو مخلصانہ تعاون کا یقین بھی دلایا، لیکن حکومت نے روایتی شوخ چشمی کا مظاہرہ کر کے

www.tezpakistan.com

بغیر کسی تحقیق اور [illegible] مخالفین [illegible] جایا۔
حکومت یا تو آئین کا احترام کرکے صاف ستھری سیاست کی داغ بیل ڈالے اور یا پھر عوامی حقوق سے گلی ڈنڈا کھیلنے کی روش چھوڑ کر مستعفی ہو جائے، بصورتِ دیگر منتقمِ حقیقی کی پکڑ کا انتظار کرے۔ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ۔

◼

ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کا نقشہ ہر چھوٹے بڑے کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ بیرونی اور اندرونی طور پر جو خطرات منہ کھولے کھڑے ہیں، دانستہ طور پر اندھا پن اختیار کر لینے والوں کے سوا سبھی انہیں محسوس کر رہے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر جو چیز باعثِ تشویش ہے، وہ مایوسی و قنوطیت کا ماحول جس کی وجہ سے مخلص کارکن تک جی ہار کر بیٹھ جایا کرتے ہیں۔

ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی ہے، کیونکہ جب مقتدر طاقتیں ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہوں، کسی شریف و باعزت انسان کی عزت و شرافت کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہو، سیکورٹی فورس کے اتھرے جوانوں کی وساطت سے جہاں ہر "کارِ عظیم" روا ہو، وہاں ایسے حالات پیدا ہو ہی جایا کرتے ہیں، لیکن نہیں، حالات کیسے ہی تند و تلخ کیوں نہ ہوں، آندھیاں کتنی ہی بے قابو کیوں نہ ہو جائیں اور گردشِ دوراں کتنی مخالفانہ روش اختیار کر لے، ایک مخلص و صادق مسلمان محمدِ عربی سلام اللہ علیہ کا ایک سچا اُمتی گھبرایا نہیں کرتا، بلکہ اس قسم کی پوزیشن اس کے لیے اور [illegible] کام دیتی ہے، کیونکہ وہ قرآنی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالتا ہے۔

خدا کی طرف سے مبعوث ہونے والے اربابِ صدق و وفا کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، تو اسے یہی کچھ نظر آتا ہے کہ داعی الی الحق اپنی زندگی کی راحت و آسائش کو قربان کرکے پوری دل سوزی اور جذبۂ خلوص کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو خالق کی طرف بلاتا ہے، لیکن جواب میں طعن و تشنیع کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ پتھر برسائے جاتے ہیں۔ راستوں میں کانٹوں کی باڑھ اذیت کا سامان مہیا کرتی ہے۔ مہاجرت و ترکِ وطن کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ کبھی جانِ عزیز کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے، لیکن وہ سب کچھ دیکھ کر، سہہ کر اور سُن کر بھی ہمت نہیں ہارتا، بلکہ پہلے سے زیادہ جرأت و استقامت کے ساتھ اور پہلے سے زیادہ جوش و شدت کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیتا ہے اور اس کی نظر میں محض یہی ہوتا ہے ؎ یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

راہِ حق کا یہ مسافر آگے چل کر جب خود پیغمبرِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے، تو اسے ایک طرف دریائے رحمت پوری روانی و جوبن پر نظر آتا ہے، تو دوسری طرف قسطائیت و ظلم کا ہر ہتھکنڈہ انسانیت و شرافت کا منہ چڑاتا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف صادق القول اور امین کی حیثیت ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف وہی عناصر جوان ناموں سے یاد کرتے ہیں، خون کے پیاسے دروازے پر ننگی تلواریں لیے نظر آتے ہیں۔ اللہ کا وہ محبوب بندہ کبھی بدر میں اپنی جبینِ نیاز کو خالقِ بے نیاز کے حضور جھکا کر ناز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، تو کبھی اُحد میں پیشانی کے زخموں سے لے کر بے ہوشی تک کے مراحل کا خود اسے شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ سراپا رحمت و شفقت نظر آتا ہے۔ اسے طائف میں اپنا زخمی وجود نظر نہیں آتا، بلکہ رحمتِ پروردگار سے محروم افراد کی بدقسمتی پر رونا آتا ہے اور وہ اس وقت بھی پوری دلسوزی اور مخلوقِ خدا کی ہمدردی کے جذبات میں ڈوب کر خدا کو پکارتا ہے۔

اس صورت کو دیکھ کر اور اس کے بعد چودہ صدیوں کے اربابِ عزیمت کی کاوش و سعی کو دیکھ کر ایک داعیٔ حق، ایک مسافرِ راہِ فطرت اور ایک مبلغِ دینِ اسلام کو حوصلہ نصیب ہوتا ہے۔ اس کی ہمت بندھ جاتی ہے اور وہ راہ کی تاریکیوں کی پروا کیے بغیر سراپا حرکت و عمل بن جاتا ہے۔

تو عزیزانِ گرامی! ہر چند کہ استبداد صفت حکمرانوں نے زر و زور کے روایتی ہتھکنڈے اپنا کر اور اخلاق و انسانیت سوزی کی نئی مثالیں قائم کرکے جینا دوبھر کر دیا ہے اور عمل و حرکت کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں۔ پھر بھی پیغمبرِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی اور خادم ہونے کی حیثیت سے ہم سب کا فرض ہے کہ حوادثِ روزگار کی پروا کیے بغیر عمل اور مسلسل عمل کا انداز اختیار کریں۔

یاد رکھیں نیتِ صحیحہ کے ساتھ سچے مقصد کے لیے حرکت و عمل اور سعی و کاوش یہ انسان کا فرض ہے، نتائج خدائے بزرگ و توانا کے ذمے ہیں لیکن اس میں جیسا کہ عرض کیا گیا، نیت خالص ہونی ضروری ہے، مقصد کا تعین ازبس ضروری ہے۔ اس کے بعد اٹھنے والا ہر قدم نیکی

www.tezpakistan.com

میں شمار کیا جائے گا۔

آج جو حالات ہیں، وہ ہم سے پہلے سے کہیں زیادہ محنت و سعی کے طالب ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ نونہالانِ وطن قریہ قریہ، بستی بستی اور گھر گھر جائیں اور ایک ایک فرد کو ملکی حالات سے آگاہ کریں، مستقبل کے خطرات بتائیں اور ہر فرد کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کی تلقین کریں۔

اگر ملک میں ہنگامی حالات ہیں، ۱۴۴ کا اندھا دھند استعمال ہے، ذرائع ابلاغ سے آپ محروم ہیں، تو یہ طریق ایسا ہے کہ اس میں کوئی رکاوٹ آپ کی راہ نہیں روک سکتی، اس لیے میں بالخصوص جمعیت علمائے اسلام کے بہادر، مخلص اور باعزم ساتھیوں سے کہوں گا کہ اٹھو اور پھیل جاؤ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، ایک چپہ زمین بھی نہ رہنے پائے جہاں تم نہ پہنچو۔ ہر جگہ جاؤ، ہر کسی کے پاس جاؤ اور اس طرح اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے عزم و عمل کی نئی ریت قائم کرو۔

★

پاکستان کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ یہاں کا حکمران طبقہ ہمیشہ ہی خلوص، رواداری اور شریفانہ طریقوں کے بجائے دھن، دھونس، دھاندلی جیسے ہتھکنڈوں کے ذریعے نظامِ حکومت چلاتا رہا، جس کے نتیجے میں ملک میں سیاسی عدم استحکام نے رواج حاصل کیا۔ گھٹن کی فضا پیدا ہوئی اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں نے چاروں طرف ڈیرہ جمالیا۔ لوگوں نے ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ اس صورتِ حال نے بالآخر تباہی و بربادی کے ایک ایسے موڑ پر ہمیں لا کھڑا کیا کہ ۱۹۴۷ء کا عظیم پاکستان "بنگلہ دیش اور نئے پاکستان" میں بدل گیا۔ جغرافیائی حدود سمٹ گئیں، فوجی سطح پر کلنک کا ایک ٹیکہ ہماری ملی تاریخ کو داغدار کرنے کا باعث ہوا۔ یہ کچھ ہونے کے بعد اگر اپنی روش تبدیل کی جاتی اور اندازِ فکر بدلا جاتا تب بھی شاید ہم لوگ ماضی کے داغ دھو ڈالنے کے قابل ہو سکتے، لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

نئے پاکستان کے حکمرانوں نے پہلے سے کہیں زیادہ افسوسناک بلکہ شرمناک طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اور اب تک ایسا ہی ہو رہا ہے۔

ایک غاصب، شرابی اور بدکار زمانہ انسان کی وساطت سے "عوامی نمائندہ" نے حکومت کا چارج سنبھالا۔ اور "عوامی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر" کا روپ دھار لیا۔ غالباً انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ عوام کے نمائندوں نے "فوجی حکمران" کا جامہ پہننے میں فخر محسوس کیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بچے کھچے ملک کے نمائندگانِ قوم نے عوامی اُمنگوں اور قومی خواہشات کا خون کر کے اس "نئے نویلے" نظام کے حق میں باقاعدہ دستخطی دستاویز تیار کر دی تاکہ آنے والی نسلیں ہماری کوتاہ فکری اور بداندیشی کا ماتم کر سکیں!

بعد از خرابیٔ بسیار جب اس مصیبت سے خلاصی نصیب ہوئی تو "عبوری آئین" کا تحفہ ملا۔ یہ تو جو کچھ تھا، امتناعی قوانین کی بھرمار اس پر مستزاد تھی۔ اس کے بعد مستقل آئین کا مرحلہ آیا اور یہ ایک المیہ ہے کہ حزبِ اختلاف کے گنے چنے ممبروں کو بھی بوجھ سمجھ لیا گیا اور ان کو ناک آؤٹ کرنے کے لیے ہر شرمناک طریق اختیار کیا گیا۔ اسی اثنا میں لیاقت باغ کا سانحہ پیش آیا جس نے انگریزی دورِ استبداد کے ایک فوجی جنرل اڈوائر کے ہاتھوں ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ امرتسر کے خونی حادثہ کو بھی مات کر دیا؛ تاہم چونکہ حزبِ اختلاف مختصر ہونے کے باوجود باکردار تھی، اس لیے اس نے اصولی جنگ جاری رکھی، بالآخر منہ زور حکمران بے بس ہو کر رہ گئے اور انہیں حزبِ اختلاف کی بعض اہم تجاویز تسلیم کرنا پڑیں جن کے نتیجے میں دستورِ پاکستان کسی حد تک اسلامیت، وفاقیت اور جمہوریت کے سانچے میں ڈھل گیا۔

میں اپنی اس سوچی سمجھی رائے کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر حکمران طبقہ مخلص ہوتا تو اس دستور سے سو فیصد نہیں تو پچانوے فیصد مسائل ضرور حل ہو جاتے، لیکن چونکہ آنے والے ایک مخصوص سوچ کے مالک ہیں جس میں یمین و یسار کی آمیزش بھی ہو سکتی ہے اس لیے وہ بالکل مست ہاتھی کی طرح "دیوانہ بکارِ خویش فرزانہ" کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

وہ دستور جس کا انہوں نے حلف اُٹھایا ہے وہ انہی کے ہاتھوں مجروح ہے اور اس کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ الامان!

باقی باتوں سے قطع نظر صرف "بنیادی حقوق" کا حصہ دیکھیں اور پھر اس پر عمل کی کیفیت دیکھیں؟ اس نقل و حرکت کی آزادی کا حسین عنوان موجود ہے، لیکن پارلیمنٹ کے ممبروں تک کے لیے ملک کے بعض علاقوں میں آمد و رفت مشکل ہے۔ اس میں اظہارِ رائے کی آزادی کا دلفریب نعرہ تو موجود ہے، لیکن اس کے ممکنہ وسائل حکمرانوں کی استبدادی پالیسی کا شکار ہیں۔ ریڈیو آن کریں تو الف سے یے تک عوامی حکومت، وزیرِ اعظم اور قائدِ عوام جیسے

www.tezpakistan.com

الفاظ کے سوا کچھ نہیں سُنائی دے گا اور ان الفاظ کی آڑ میں فرضی استحکام' نام نہاد انقلابی اصلاحات کا ڈھنڈورا ہو گا یا پھر سیاسی مخالفین کی کردار کشی کا مکروہ اور افسوسناک پروپیگنڈا۔ ٹی وی ہے تو وہ بھی ریڈیو کا جڑواں بھائی ہے۔ اخبارات کا ایک معتدبہ حصہ تو ٹرسٹ کی ملکیت ہے۔ ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ مظلمہ کے درباری شاعر حکمرانوں کی تعریف و توصیف میں مشغول ہیں اور جو اخبارات ٹرسٹ کی زلفِ گرہ گیر کا شکار ہیں، ان کے مفادات اور مخصوص ذہن قومی اور ملکی خدمت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

نیشنل سنٹر کا ایک نیا انقلابی سلسلہ ہے' لیکن یہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جن کی عوامی حیثیت صفر ہے اور وہ کسی پبلک پلیٹ فارم پر خطاب کرنے کے اہل نہیں۔ جب ایسا ہے تو ظاہر ہے انہوں نے جن کا کھانا ہے' انہی کا گانا ہے۔ لے دے کے ایک صورت رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ مخالفین اپنے محدود وسائل کے ذریعے عوامی جلسے منعقد کر کے اپنا مافی الضمیر دُنیا کے سامنے پیش کریں' لیکن اس راہ میں ۱۴۴ کی بدنام ترین دفعہ مستقل رکاوٹ ہے جو پاکستان کا مقدر بن چکی ہے۔

اوّل تو مُلک کا ہر حصہ اس کا شکار ہے' لیکن پھر بھی جہاں کہیں حزبِ اختلاف کے لوگ جاتے ہیں احتیاطی طور پر اس کی تجدید ہو جاتی ہے' حالانکہ یہ دفعہ اشد ترین ضرورت کے وقت استعمال کی جاتی ہے' جہاں کہیں حالات سنگین ہوں' فساد کا اندیشہ ہو وہاں دو چار دن کے لیے یہ دفعہ نافذ ہوتی ہے اور مدبّر' دُور اندیش اور محبِ وطن حکمران جلدی سے حالات رو بہ اصلاح کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں' کیونکہ اس دفعہ کی عمر کا دراز ہونا ان کی نالائقی کا مظہر ہوتا ہے ۔۔ لیکن یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پُورا مُلک فساد زدہ ہے' جبھی تو مشرق سے مغرب تک ہر جگہ ۱۴۴ ہی ۱۴۴ ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایسی نااہل حکومت کو فوراً مستعفی ہو جانا چاہیے۔ اسے کیا حق ہے کہ وہ اصلاح نہیں کر سکتی تو ڈنڈے سے اپنا زور قائم رکھے۔ اور اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں' بلکہ محض حکومت اپنی نااہلی' بد دیانتی اور سیاہ کارناموں کی پردہ پوشی کے لیے یہ ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے تب بھی اس کا مستعفی ہونا ازبس ضروری ہے' کیونکہ مُلک کسی کی جاگیر نہیں کہ کوئی ایک طبقہ حقِ حکمرانی کو اپنے لیے الاٹ کرا لے۔

اس لیے ازبس ضروری ہے کہ محبِ وطن عناصر اور بہی خواہانِ مُلک و ملّت مثالی اتحاد اور مخلصانہ سعی سے ان بندھنوں کو توڑ ڈالیں۔ ساتھ ہی حکمران طبقہ پر لازم ہے کہ وہ نوشتہ دیوار پڑھیں۔ رات کے بعد دن کا آنا فطری عمل ہے اور جو فطری عمل کے برعکس رویّہ اختیار کرتا ہے اس کے عبرتناک انجام سے صفحاتِ تاریخ اَٹے پڑے ہیں۔ صرف ان کو دیکھنے' سُننے اور سمجھنے کے لیے دیدۂ بینا' گوشِ ہوش اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہے۔

پروردگارِ عالم ہمیں معاملہ فہمی کی توفیق بخشے۔

★

یہ ہے اس مُلک کا حال جس کی خاطر اَن گنت نوجوانانِ اسلام نے اپنے خُون کا مقدس نذرانہ پیش کیا اور ہزاروں بہو بیٹیوں نے اپنی عصمت اور عفت قربان کر دی۔ خاک و خُون کے ایک وسیع سمندر کو عبُور کرنے کے بعد پاکستان میں آنے اور بسنے والے اپنے ساتھ کوئی اُمید نہیں لائے تھے۔ ان کے قلبِ جگر میں کوئی آرزو اور اُمنگ تھی تو محض یہ کہ مُلک اسلامی عظمت کا گہوارہ بنے گا۔ یہاں اسلامی حدود کا نفاذ ہو گا۔ اسلامی نظامِ حیات کی برکات سے خلقِ خدا فائدہ اُٹھائے گی اور یُوں ایک بار پھر خیر و فلاح کے دَور کی یاد تازہ ہو جائے گی' لیکن ۲۷، ۲۸ برس میں اس مُلک کے سیاہ و سفید پر قابض ہونے والے عناصر نے بلا تفریق جس طرح مذہب کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کیا اور عملاً منافقت و بدعہدی کی ایک طویل داستان مرتب کی اس سے ہر کہ و مہ واقف ہے۔ بالخصوص موجودہ نام نہاد عوامی حکومت جو اپنے کو "عوام کی پیداوار" قرار دیتی ہے اور جس نے اپنے پارٹی منشور میں "اسلام ہمارا دین" کا منافقانہ جھومر اب تک بھی لٹکا رکھا ہے۔

آج اس مُلک میں اسلامی اخلاق و اقدار کی کوئی چیز باقی نہیں۔ اسلامی سیرت و کردار کی جھلکیاں عنقا ہیں اور اسلام اور اہلِ اسلام مظلومیت اور کسمپرسی کے عالم میں پڑے کراہ رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ نظامِ شریعت کانفرنس سے اربابِ حکومت اتنے الرجک کیوں تھے کہ انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس مُلک میں اسلام آ گیا تو ان کی ناؤ نوش کی محفلیں اُلٹ کر رہ جائیں گی' عوام کا استحصال نہیں ہو سکے گا' شراب و کباب چھوڑنا پڑے گا اور ظلم و بدعہدی ممکن نہیں رہے گا۔

www.tezpakistan.com

اگر ان کی سوچ اور فکر یہ ہے اور انہوں نے اسی وجہ سے اس کانفرنس کو بند کیا ہے، تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے دن لد گئے؟ ان کا ظالمانہ دَور ختم ہُوا چاہتا ہے اور وہ اب زیادہ دیر اس مُلک میں عیاشی نہیں کر سکیں گے۔ مَیں مُلک بھر کے اربابِ دین و دانش سے یہ عرض کروں گا کہ وہ اس ظالمانہ کارروائی سے دِل برداشتہ نہ ہوں۔ پُوری بے خوفی، جُرأت اور ہمت کے ساتھ میدان میں آجائیں۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ اور گھر گھر جا کر ایک ایک فرد کو حقائق سے آگاہ کریں۔ اور اتنی بھرپُور قوت مہیا کریں کہ ظلم کی دیوار ڈھانا آسان ہو جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اربابِ اقتدار نے دین اور اہلِ دین سے جو ظالمانہ مذاق کیا ہے اس کی سزا سے وہ بچ نہیں سکیں گے، قدرت کی بے آواز لاٹھی انہیں یقیناً ان کے کِیے کا مزہ چکھائے گی۔

مَیں اربابِ دین کو ایک بار پھر عمل اور مسلسل عمل کی طرف توجہ دلاؤں گا، کیونکہ عمل ہی کامیابیوں کا زینہ ہے۔

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو!

هری پور جیل میں

یادگار خطاب

"یہ جیل کیا ہے دین کے لیے گولی بھی کھانی پڑی، تو تیّار ہوں گے"۔

هری پور سنٹرل جیل میں زمانۂ اسارت کے دوران حضرۃ مولانا مفتی محمود صاحبؒ نمازِ جمعہ سے قبل دو ڈھائی ہزار اسیرانِ شریعت سے پُر حکمت خطاب فرماتے۔ ۵ اپریل ۱۹۷۷ء جمعۃ المبارک کو کی گئی یہ تقریر مولانا سمیع الحق صاحبؒ مدیر ماہنامہ "الحق"، جو اُس وقت مفتی صاحب مرحوم کے ساتھ اسیرِ زندان تھے، نے اسارتِ ھری پور کے دوران قلمبند کی۔ اسے حتی الوسع حضرۃ مفتی صاحب کے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ نظامِ شریعتِ اسلامیہ کے قیام و نفاذ کے لیے یہ خطاب پوری ملّتِ مسلمہ کیلیے آج بھی دعوتِ غور و فکر اور دعوتِ عمل ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ

www.tezpakistan.com

مِنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ۔

محترم بزرگو اور بھائیو! میں نے آپ کے سامنے قرآنِ کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کر یہ حکم دیا کہ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ کہ آپ پہنچا دیں ہر وہ حکم، ہر وہ بات جو تمہارے اوپر نازل کی گئی ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے۔ اے پیغمبر! جو جو احکام پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیے گئے ہیں وحی کے ذریعہ سے، ان احکام کو لوگوں تک پہنچا دو۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔ اگر آپ نے یہ کام نہ کیا اور میرے احکام کو لوگوں تک نہ پہنچایا، تو آپ نے میری رسالت، میری پیغمبری، میرا پیغام لوگوں تک نہیں پہنچایا جو آپ کے ذمہ ایک عظیم کام ہے۔ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ۔ اللہ کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اس آیت سے اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لازم کر دیا کہ وہ اللہ کے احکام کی تبلیغ کرے۔ تبلیغِ دین اور لوگوں کو معروفات کا حکم کرنا اور برائیوں سے روکنا یہ پیغمبرانہ مشن ہے۔

میرے محترم دوستو! اگر ایک شخص یہ دیکھتا ہے کہ برائی ہو رہی ہے، لوگ غلط راستوں پر چل رہے ہیں، تو فرض ہو جاتا ہے کہ اس برائی کو روکا جائے؛ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے، جناب نبی کریم فرماتے ہیں:

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ وَاِلَّا فَبِلِسَانِهٖ وَاِلَّا فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔

جو شخص برائی کو دیکھے، تو برائی کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، قوت اور طاقت سے اس کو ختم کر دے۔ قوت سے نہیں روک سکتا، تو پھر اس کو زبان سے بدل دے اور کہے یہ برائی ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ اگر زبان سے روکنے سے بھی کمزور ہے، تو پھر دل سے اس کو برا مانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے، اور فرمایا کہ اس کے بعد دل میں بھی برا نہیں سمجھتا، تو اس کے دل میں کوئی ایمان نہیں، یعنی رائی کے برابر بھی ایمان نہیں۔ غرض یہ کہ ایک شخص برائی کرتا ہے۔ دوسرا اس کو روکے گا، تو پھر برائی ختم ہو گی اور اگر کوئی ایسا نہ کرے، تو برائی بڑھتی جائے گی۔ قرآنِ کریم میں بنی اسرائیل کا واقعہ ذکر ہے:

واسئلهم عن القرية التى كانت حاضرة البحر اذ يعدون فى السبت اذ تأتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعًا ويوم لا يسبتون لا تأتيهم۔ كذٰلك نبلوهم بما كانوا يفسقون۔

اے میرے پیغمبر! ذرا ان سے پوچھیں کہ اس بستی کے لوگوں کا کیا حال تھا جو سمندر کے کنارے پر تھی۔ یہ بنی اسرائیل کی بستی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کو ان کے دین کے مطابق ہفتہ کے دن مچھلیوں کے شکار سے روک دیا، لیکن منع کرنے کے باوجود انہوں نے خیال کیا کہ جب مچھلیاں ہیں، تو ہم شکار کیوں نہ کریں۔ حیلہ تلاش کیا کہ اس کو ہم، ہفتہ کے دن بھی کھائیں، لیکن شریعت کی اجازت نہ تھی۔ ادھر اللہ نے ان کا اس طرح امتحان لیا کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں سمندر کی سطح پر اوپر آجاتی تھیں اور باقی دنوں میں غائب ہو جاتی تھیں۔

ويوم لا يسبتون لا تأتيهم۔ جس دن وہ چھٹی نہ کرتے، تو مچھلیاں اوپر نہ آتیں، تو انہوں نے ایک حیلہ کیا کہ سمندر کے کنارے ایک تالاب بنایا اور اس کی طرف سمندر کے پانی کے لیے راستہ بنایا۔ وہ ہفتہ کے دن تالاب میں چلے جاتے تھے اور شام کو وہ سمندر کے راستہ کا پانی بند کر دیتے تھے۔ وہ واپس سمندر میں نہ جا سکتیں اور اتوار کے دن تالاب سے مچھلیاں پکڑ لیتے اور پھر چھ دن استعمال کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نے ہفتہ کے دن شکار نہیں کیا، لیکن یہ ایک مذاق تھا۔ واقعہ میں انہوں نے مچھلیوں کو بند کر کے شکار تو کر ہی لیا۔ نافرمانی کر لی، لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھے۔ یہ عمل ان کا جاری تھا کہ اس وقت ایک جماعت نے شکار کرنے والوں سے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ تم تو نافرمانی کرتے ہو۔ ان کو منع کرنے کے لیے انہیں مقابلہ میں آنا پڑا۔ اس دوران میں ایک تیسرا گروہ تھا۔ انہوں نے منع کرنے والوں سے کہا کہ تم انہیں کیوں روک رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب دے دینا ہے، یہ ہلاک ہو جائیں گے۔ تم کیوں روکتے ہو، لیکن انہوں نے جواب کہا: واذ قالت امة منهم لم تعظون قومًا ان الله مهلكهم او معذبهم عذابًا شديدًا۔ قالوا معذرةً الى ربكم ولعلهم يتقون۔ ہم اپنے پروردگار کے سامنے ایک عذر پیش کرنا چاہتے ہیں اور شاید یہ لوگ اللہ سے ڈرنے لگیں کہ قیامت میں جب پیش ہوں گے اور اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ کیوں نہ روکا، تو ہم جواب میں

www.tezpakistan.com

عذر پیش کر دیں گے اور یہ بھی امید ہے کہ یہ لوگ شاید ہمارے کہنے سے رُک جائیں، تو تین گروپ بن گئے: ۱۔ گناہ کرنے والا، ۲۔ روکنے والا، ۳۔ روکنے والوں کو منع کرنے والا، مگر یہ بھی اس بُرائی کو بُرا سمجھ رہے تھے، یعنی خاموش گروپ۔ پھر فیصلہ اللہ کا کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک گروپ کو بچایا جو روک رہے تھے۔

نافرمان گروپ اور حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں پر بھی عذاب آیا اور جو خاموش تھے درمیان میں، وہ بھی عذاب میں مبتلا ہوئے اور وہ گروہ جو اللہ کے حکم سے نافرمانی دیکھ کر مقابلہ میں آیا، ان کو بچا لیا گیا۔ ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کی مثال دی ہے دریا میں، جس کے دو درجے ہیں۔ ایک اوپر کا ایک نیچے کا۔ کچھ لوگ اوپر سوار تھے، اور قاعدہ ہے کہ کشتی میں سوار ہوں، تو دریا سے پانی لینے والے اوپر سے ایک ڈول ڈال کر دریا سے پانی لیتے ہیں، اوپر والے تو ڈول ڈال کر نکالتے، مگر اندر والے اوپر جا کر پانی کے لیے ڈول ڈالتے ہیں، تو اوپر والوں نے کہا کہ تم ہمیں ہر وقت پریشان کرتے ہو، اس لیے اوپر آنے سے انہیں روک دیا۔ نیچے والوں نے مجبوراً سوچا کہ جب یہ لوگ ہمیں اجازت نہیں دیتے، تو ہم نیچے سے کشتی میں ایک سوراخ لگا دیں گے اور اس سے پانی لیں گے۔ انہوں نے کلہاڑا دے مارا۔ تو حضورِ اقدسؐ نے فرمایا کہ اگر اوپر کے لوگ آکر ان کا ہاتھ پکڑ لیں، انہیں روک دیں، تو اوپر اور نیچے والے دونوں غرق نہیں ہوں گے، لیکن اگر وہ کہیں کہ یہ ان کا اپنا حصہ ہے، ہم کیوں روکیں اور سوراخ کرنے دیا۔ ہاتھ نہ پکڑا، تو سوراخ سے پانی آکر اوپر اور نیچے دونوں کو غرق کر دے گا۔ یہ مثال حضورؐ نے دی کہ جو لوگ گناہ اور غلطی کرتے ہیں، دوسرے لوگوں نے آکر زبردستی نہ پکڑا، بُرائی سے نہ روکا، تو جرم کرنے والے اور جو نہ پکڑیں، دونوں غرق ہو جائیں گے اور خدا کا عذاب دونوں پر یکساں آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر کتنا واضح فرما دیا کہ کسی بُرائی والے کو جب بھی دیکھو، اس پر ہاتھ ڈال کر اسے روکو۔ دونوں بچ جاؤ گے؛ ورنہ دونوں نہ بچ سکو گے، اس لیے برائیوں سے روک کر خدا کے احکام لوگوں تک پہنچانا نبوت کا پروگرام اور مشن ہے۔ جب نبی کریمؐ کی وفات کے بعد اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، تو اب نبوت کا مشن کون چلائے گا۔ چودہ سو سال تو ہو گئے۔ آگے دنیا کب تک رہے گی، تو یہ مشن ہی مسلمان چلائیں گے جن کے پاس دین ہے، علم ہے، وہ اہلِ ہیں، پیغمبر کے وارث ہیں۔ حدیث میں ہے:

ان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھمًا و لکن ورثوا العلم (الحدیث) مال، اشرفی، روپے کچھ بھی پیغمبر کے وراثت کا مال نہیں ہوتا۔ ان کی وراثت کیا ہے، علم! جو اُن کے مشن کو آگے چلائے، وہی پیغمبر کا وارث ہے۔ آج خدا کے دین میں، احکام میں حیلہ جوئی ہو رہی ہے جیسا کہ یہودیوں نے مچھلیوں کے شکار میں حیلہ بنایا، تو اللہ کا عذاب ان پر آیا۔ اس طرح اگر تم لوگ آگے بڑھ کر بُرائیوں کو نہیں روکو گے، تو یقیناً خدا کا عذاب سب کو لپیٹ میں لے گا۔

آج ہمارے ملک پاکستان میں کیا خدا کے دین کے احکام میں حیلے نہیں ڈھونڈے جا رہے، کُھلم کھلا نافرمانی نہیں ہو رہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا کا دین آج یہاں پر نافذ نہیں۔ آپ نعرے تو لگاتے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ، مگر یہ نہیں سوچتے کہ یہاں دینِ اسلام پر بننے والے ملک میں ایک بھی قانون اسلام کا نافذ نہیں۔ کیا محمد رسول اللہؐ کا ایک حکم بھی نافذ ہوا؟ ایک بتا دو تو میں مانوں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو نعرہ پاکستان کا مطلب کیا کا لگا، یہ نعرہ اصل میں ادھورا تھا۔ لا الٰہ تو کہہ دیا، مگر محمد رسول اللہ نہیں کہا، تو اللہ تو ہے، ایک ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ اسے عیسائی بھی، یہودی بھی مانتے ہیں۔ پھر پاکستان کا مطلب صرف لا الٰہ کہہ کر بات کیا ہوئی۔ جب تک محمد رسول اللہؐ کا نظام یہاں نہیں لائیں گے، تو ایمان مکمل نہیں ہوگا۔ ادھورے کلمہ سے کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ یہودی بھی لا الٰہ کہتے ہیں، مگر محمد رسول اللہؐ نہیں مانتے۔ اگر پورا کلمہ نہیں، تو پاکستان کا مطلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ انگریزوں کا قانون یہاں پر رائج ہے۔ مرزائیوں کا مسئلہ ہے، منکرینِ حدیث موجود ہیں۔ یہاں سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے کلمہ ادھورا پڑھا ہے۔ جب تک آپ قصد نہ کریں کہ ہم پاکستان میں محمد رسول اللہ کا نظام لائیں گے اور کفر و الحاد اور زندقہ کو اور اس کے نظاموں کو درہم برہم کریں گے۔ اسلام کا عادلانہ نظام لائیں گے، اس وقت تک ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ غرض یہ کہ قرآنِ کریم کی آیت یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک میں نبی کو حکم ہوا دین کے پہنچانے کا، تو جب انسان دین کے پہنچانے میں کوتاہی کرتا ہے، تو تین وجوہات سے:

www.tezpakistan.com

۱۔ دین کے احکام کو دنیا تک پہنچانے کی اہمیت اور اس کے فرض، وجوب اور لزوم کا احساس نہیں ہوتا۔ سوچتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں جسے زندگی کا مشن بنا لیا جائے۔

۲۔ کوتاہی کی دوسری وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب آپ پورے دین کو پھیلائیں گے۔ آپ کے لیے مصیبت بنے گی۔ دشواریوں اور مشکلات کے پہاڑ راستے میں حائل ہو جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے لوگوں کے محبوب تھے، ہر دلعزیز تھے، لیکن جب آپ نے اللہ کا دین پہنچانا شروع کیا اور اللہ نے حکم دیا: یاایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر۔ جب یہ بات ہوئی پھر کیا ہوا؟ اپنے بھی دشمن، گھر میں بھی دشمن، باہر بھی دشمن۔ اپنے چچا ابولہب ان کے مقابلہ میں میدان میں آئے۔ آپ اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتے۔ ابولہب کہتے تبالک الھذا دعوتنا الھذا اجمعتنا۔ ہلاکت ہو آپ کی (العیاذ باللہ) اس لیے آپ نے اکٹھا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تبت یدا ابی لھب وتب میں اس کا جواب دیا کہ ہلاک ہو گیا ابولہب۔

لوگ راستے میں کانٹے بچھا رہے ہیں، مسجد حرام میں آپ تشریف لے گئے۔ قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔ بدبختوں نے آپ کو پکڑ لیا۔ گلے میں چادر ڈال دی اور چادر کو اتنا مروڑا کہ آواز بند ہو گئی۔ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا: أتقتلون رجلا أن یقول ربی اللہ۔ ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو صرف اللہ کو اپنا رب پکارتا ہے؟ لوگ انہیں اس قدر پیٹتے کہ خون بہنے لگتا۔ اچھے خاصے خوش وخرم تھے، مگر دین کے پھیلانے میں خون بہانے کے خطرات درپیش ہوئے۔ تو ان مشکلات کے سامنے کون ٹھہرے، آدمی ہمت ہار جاتا ہے۔ جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مکہ میں تیرہ سال اور مدینہ میں دس سال جو مشکلات سامنے آئیں، اگر میں اس کی تفصیل بیان کروں، تو کلیجہ پھٹ جائے۔ آپ کے ساتھیوں، جانباز اور مخلص ساتھیوں پر جو گزری، ان مشکلات کو سن کر انسان گھبرا جاتا ہے۔ باہر نکلو دین کے لیے حق کے لیے، تو قید و بند ہے، جیل ہے، گولیاں چلتی ہیں۔ آنسو گیس کے سامنے آنا پڑتا ہے، لاٹھی چارج ہوتا ہے۔ اور گھر میں چونکہ آرام سے بیٹھنا ہوتا ہے، اس لیے لوگ دین پھیلانے کے لیے میدان میں آنے سے اور مقابلہ کرنے سے کتراتے ہیں۔

۳: تیسری وجہ یہ ہے کہ جب دین کے نافذ ہونے کی جدوجہد ہو رہی ہو، مگر کوئی مانتا نہیں۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تبلیغ کی، دین کو پھیلانے کی سعی کی، مگر کوئی آدمی مانتا نہیں اور جب بالکل نہیں مانتا، حتیٰ کہ اپنا بیٹا بھی کافر ہے، تو ایسے وقت میں مایوسی آجاتی ہے۔ انسان ہمت ہار جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی ہمت قابلِ داد ہے کہ اتنا عرصہ تبلیغ کرتے کرتے بھی مایوس نہ ہوئے آخر جب وہ قوم عذاب کی مستحق ٹھہر گئی تب دعا کی:

انی دعوت قومی لیلا ونھارا فلم یزدھم دعاءی الا فرارا۔ میں نے قوم کو رات دن بلایا۔ اتنا ہی یہ بھاگے۔ وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارا۔ جب بھی ان کو دعوت دیتا ہوں، یہ انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ منہ چھپا لیتے ہیں اور کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ نہیں مانتے۔ یا اللہ اب میں کیا کروں۔ تو اس کے بعد انہوں نے کہا۔ اے میرے پروردگار رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ یا اللہ ان سب پر عذاب بھیج دے۔ ساڑھے نو سو برس تبلیغ سے بھی یہ ٹھیک نہیں ہوئے، تو عذاب آنے لگا، مگر ایک بات اللہ نے فرمائی کہ پیغمبر کی طبیعت میں شفقت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون۔ ان ظالموں کے بارے میں سفارش نہ کرو۔ انہوں نے لازماً غرق ہو جانا ہے۔ طوفان آیا، پانی آیا۔ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے ہیں۔ اللہ نے حکم دیا تھا جو لوگ آپ کا ساتھ دے چکے ہیں، انہیں اپنے ساتھ بچانا۔ فرمایا: واصنع الفلک باعیننا ووحینا۔ ہماری وحی اور ہمارے حکم سے اسے بناؤ۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کلما مر علیہ ملأ من قومہ سخروا منہ قال ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون۔ گزرنے والے مذاق کر رہے تھے کہ اس دیوانے کو دیکھو کیا کر رہا ہے۔ حضرت نوحؑ جواب میں فرماتے کہ ایک دن ایسا آ رہا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ مذاق کریں گے۔ نوح علیہ السلام کا اپنا لڑکا کافروں میں تھا۔ پانی میں ڈوب رہا تھا، تو نوح علیہ السلام نے اس لڑکے سے کہا: یا بنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین۔ اے بیٹے ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ کافروں کا ساتھ مت دو۔ اس نے کہا: سآوی الی جبل یعصمنی

www.tezpakistan.com

من الماء۔ میں کسی اونچی چوٹی اور پہاڑ کی پناہ لے لوں گا۔ نوح علیہ السلام نے کہا: قال لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم۔ آج اللہ کے عذاب سے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر ایک لہر آئی۔ فکان من المغرقین۔ اور اسے غرق کر کے لے گئی۔ خدا نے نوح علیہ السلام کو منع کیا تھا اور فرمایا تھا کہ تو سفارش مت کر، میں تمہیں اور تمہارے اہل کو بچا لوں گا، تو نوح علیہ السلام کو تھوڑا بہت بہانہ مل گیا کہ بیٹا بھی تو میرا اہل ہے، تو اس کی سفارش کی کہ یہ بیٹا بھی میرا اہل ہے۔ ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق۔ آپ کا وعدہ سچا ہے، مگر آگے سفارش سے ڈرتے ہیں اور کہتے ہیں وانت احکم الحاکمین۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ بات تو کر ہی لی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قال یا نوح انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح فلا تسئلنی ما لیس لک بہ علم۔ فرمایا یہ تمہارا اہل نہیں۔ اس کے اعمال تیری طرح نہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ایک سید پیغمبر کی اولاد جب پیغمبر کے طریقوں پر عمل نہیں کرتی، اس کا رشتہ پیغمبر سے کٹ جاتا ہے۔ پیغمبر کی اولاد کا رشتہ اس وقت تک قائم رہے گا کہ وہ ان طریقوں پر چلتا ہے۔ غرض یہ کہ جب دین کا پھیلانے والا جب منزل پر نہیں پہنچ سکتا، تو مایوس ہو جاتا ہے۔ ہمت جواب دے جاتی ہے، تو یہ تین وجوہات ہیں تبلیغ نہ کرنے کی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب اس آیت میں دین کو پھیلانے کا حکم دیا، تو تینوں کا جواب دے دیا کہ: ۱۔ دین کی تبلیغ کی اہمیت اتنی ہے کہ اگر نہ کیا، تو فما بلغت رسالتہ۔ پیغمبرانہ مشن ناکام ہو جائے گا، تو یہ کتنا اہم مسئلہ ہوا۔ اب کیسے اہمیت کا احساس نہ ہو گا۔ ۲۔ قید و بند، قتل و شہادت کا جواب اللہ نے دیا کہ واللہ یعصمک من الناس۔ لوگ تم پر غالب نہیں ہوں گے۔ خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔ ۳۔ اور ان کی بات کا جواب یہ لوگ ساتھ نہ دیں گے، تو کہا کہ تمہارا اس سے کیا کام۔ یہ تو اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔ واللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ کوئی مانے نہ مانے یہ تمہارا کام نہیں۔ غرض یہ کہ جب آج آپ دین کو عملاً نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ شریعت کا نظام لانا چاہتے ہیں، تو اس میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ صرف پیٹ پالنا تو حیوان کا کام ہے۔ اسے اللہ تم سے زیادہ دیتا ہے۔ صبح تم بھی اور بیل بھی اکٹھے کھیت میں کام کرنے جاتے ہو۔ سارا دن تم بھی اور بیل بھی جٹ رہتا ہے۔ شام کو اکٹھے آ جاتے ہو اور گھر آ کر بیل باندھ کر اس کے چارہ پانی کا تم انتظام کرتے ہو۔ تو بیل کے ساتھ برابر کا یا اس سے زیادہ کام کرتے ہو اور کھانا اس کو پہلے ملتا ہے اور تمہیں بعد میں، تو پیٹ پالنا کوئی بڑا کام نہیں۔ انسان پر ظلم ہو رہا ہو، لوگ ظلم کی چکی میں پس رہے ہوں، تو اسلام کا نظامِ عدل نہیں آ سکتا۔ اس کے لیے دن رات ایک کر کے کام کرو گے۔ صحابہ کرامؓ نے قربانیاں دیں۔ ۲۳ برس میں دین کو پھیلایا اور اپنایا۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ آج میں نے تمہارا دین مکمل کر لیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام بحیثیت نظامِ حیات کے پسند کر لیا۔

مشکلات کے باوجود چلنا پڑتا ہے۔ یہ سیڑھیاں ہیں۔ تم کامیاب ہو گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے اللہ کے حکم کے مطابق دین پھیلانے کے لیے تمام قوتیں صرف کرنی ہیں۔ یہ جیل میں پڑا رہنا تو معمولی بات ہے۔ میں کہتا ہوں دین کے لیے گولی بھی کھانی پڑی تو آپ تیار ہوں گے (نعرہ ہائے تکبیر)

غرض یہ کہ محنت سے، قربانی سے گھبراؤ نہیں، ہمت نہ ہارو اور جو مقصد لے کر آئے ہو اسی کو سامنے رکھو۔ آپ کہیں گے کہ تیس سال سے ہم لڑ رہے ہیں۔ ایک اچھے نظام کو لانے کے لیے فرنگی نظام کو شکست دینے کے لیے، مگر وہ اسی طرح قائم ہے۔ فرق یہ ہے کہ فرنگیوں کا رنگ سفید تھا اور یہ کالے ہیں۔ قانون وہی ہے، زبان وہی ہے، تہذیب وہی ہے، طور طریقے وہی ہیں۔ سب کچھ وہی ہے۔ وہ اصلی تھے، یہ نقلی ہیں۔ بتاؤ اصل اچھا ہوتا ہے یا نقل اچھا ہوتا ہے؟ اس لیے کہتے ہیں کہ ان سے تو انگریز اچھے تھے۔ تو اصلی اور نقلی کا فرق ہوتا ہے۔ گورے اچھے ہوتے ہیں یا کالے؟ کیا فرق ہے، ان کی آنکھیں نیلی اور ان کی کالی ہیں۔ تو انگریز سے ہماری دشمنی کیوں تھی؟ اس کے قانون سے، اس کی حکومت سے، اس کے خلاف اسلام طور طریقوں سے ہماری دشمنی تھی اور وجہ یہ تھی کہ ان کی تہذیب سے، ان کے مذہب سے، ان کے ظلم و تشدد سے ہمیں نفرت تھی۔ اگر کالے چمڑے والا وہی کچھ کرے، انہی قوانین کو اپنائے، اسی تہذیب کو اختیار کرے، تو اس سے بھی ہماری دوستی نہیں ہو سکتی۔ ہم اصول سے دشمنی کرتے ہیں، اشخاص سے نہیں۔ تو تیس سال سے ہم محنت کر رہے ہیں۔ آپ شاید مایوس ہو جائیں، مگر آپ پھر بھی کامیاب ہیں۔ آپ اس راستے پر چلتے ہیں اور دین اللہ کے حکم کے مطابق نہیں آتا، تو وہ اللہ جانے گا۔ ہمارا تو فرض ہے اسی راستے پر چلتے رہنا، یہاں تک کہ خدا کا نظام قائم ہو۔ کوئی ہدایت قبول نہ کرے، تو یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تو فرمایا کہ واللہ لا یھدی القوم الکافرین۔

www.tezpakistan.com

ہم بالکل مایوس نہیں ہیں۔ جب تک جان میں جان ہے، یہ قافلہ رواں دواں رہے گا۔ مایوسی ہرگز نہیں۔ کوئی یہ بات دل میں نہ لائے کہ لوگ ساتھ نہیں دے رہے اور اب تو ساتھ بھی دے رہے ہیں، تو پھر مایوسی کی کوئی بات ہی نہیں۔ بی بی سی کی معمولی سی خبریں آتی ہیں، تو آپ کے چہرے پژمردہ ہو جاتے ہیں اور ذرا جلوسوں کی خبریں زیادہ آئیں، تو چہرے تازہ ہو جاتے ہیں۔ تو ساتھ دینے نہ دینے سے فرق پڑتا ہے، مگر یہ ظاہری چیزیں ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ انشاء اللہ قافلہ منزل پر پہنچے گا۔

لوگ پوچھتے ہیں بات چیت ہو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بات چیت اگر ہوئی بھی، تو آپ کے مطالبات کے حق پر ہوگی۔ ہم دیکھیں گے کہ کوئی سودا نہ ہو۔ قوم کی اس عظیم قربانی سے کوئی غداری نہیں کی جائے گی۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ایک اہم سوال کا
ایک اہم جواب

اسلام کا نظامِ حکومت کیا ہے؟

اسلام شورائی نظام کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں اشارہ ہوتا ہے "ان لوگوں کو مشوروں میں شریک کر لیا کرو" اور حکومت پر لازم ہے کہ وہ شورائی نظام بنا کر اس کے مطابق عمل کرے۔ رسول اللہ کا عمل خود اس سلسلے میں بڑا واضح ہے وہ بھی ایسے امور میں جہاں وحی نازل نہ ہوئی ہو، ان میں مشورہ کرتے تھے اور مشوروں سے وہ اُمور سرانجام دیتے تھے۔ یہی طریقہ خلافتِ راشدہ میں مروّج تھا۔ مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں مغرب میں عوام کی حکومت عوام کے نمایندوں کے لیے ہوتی ہے اور اس جمہوریّت کے تحت کام کرنے والی خود مختار پارلیمنٹ ہر قسم کا فیصلہ کرنے اور اسے منسوخ کرنے پر قادر ہوتی ہے وہاں اسلامی جمہوریت میں عوام کی حکومت کے بجائے خدا کی حاکمیت کا تصوّر کارفرما ہوتا ہے۔ اللہ کی حکومت کے تحت قائم کردہ اسلامی پارلیمنٹ، اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی اور اس اسلامی پارلیمنٹ میں اسلام کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں ایک واضح فرق موجود ہے۔

اسلامی طریقۂ انتخاب بالکل واضح ہے۔ اسلام میں خلیفہ عوام کی مرضی سے منتخب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بیعت کا طریقہ رائج ہے۔ درحقیقت یہ ووٹ ہے، یہ رضامندی کا اظہار ہے۔ آپ یہ اظہار ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کریں یا پرچی ڈال کر؛ تاہم اسلام نے ہمیں کسی خاص انتخابی طریقۂ کار کا پابند نہیں کیا۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں مختلف طریقۂ انتخاب اپنائے گئے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کی خلافت اور انتخاب کا طریقہ اور تھا۔ حضرت

www.tezpakistan.com

عمر فاروقؓ نے ان کا نام پیش کیا تھا۔ انصار کی طرف سے یہ تجویز بھی آئی کہ دو امیر ہونے چاہئیں، ایک مہاجرین میں سے اور دوسرا انصار میں سے لیکن یہ تجویز مسترد کر دی گئی، چنانچہ عمر فاروقؓ کی تجویز پر انتخاب ہو گیا اور اس کے بعد تمام مسلمانوں نے ان کی بیعت کی حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی، اگر بالآخر انہوں نے اعلانیہ مسجد میں بیعت کی اور آپ کا انتخاب مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد صدیق اکبرؓ نے اس اعتماد کے ساتھ جو قوم نے انہیں دیا تھا حضرت عمرؓ کو نامزد کیا۔ اس نامزدگی کی حیثیت ایک تجویز کی تھی۔ اس کے بعد لوگوں نے برضا و رغبت عمر فاروقؓ کی بیعت کی۔ عمر فاروقؓ نے شہادت سے قبل وصیت کی کہ چھ آدمیوں پر مشتمل ایک شوریٰ بنائی جائے جو خلیفہ کا انتخاب کرے، چنانچہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ بن وقاص، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ پر مشتمل شوریٰ کا قیام عمل میں آیا، یہ چھ وہ حضرات تھے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور حضور صلعم نے زندگی میں ہی انہیں جنت کی بشارت دی تھی۔ ان میں سے تین نے اپنی رائے محفوظ رکھی۔ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت سعد بن وقاصؓ باقی تین رہ گئے۔ ان میں سے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ نے کہا وہ تو امیر بننا نہیں چاہتے، آپ میں سے اگر کوئی بننا چاہتا ہے، تو بتائیے میں جس طرف رائے دوں گا اس کی اکثریت ہو جائے گی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ وہ کسی قسم کے فیصلے کی مخالفت نہیں کریں گے، اور اگر حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کیا گیا، تو انہیں تسلیم کر لیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے یہی وعدہ حضرت علیؓ سے لیا اور پھر حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی جس کے نتیجے میں تمام مسلمانوں نے بھی حضرت عثمانؓ کی بیعت کی اور انہیں خلیفہ تسلیم کیا۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے ہمیں کسی خاص طریقِ انتخاب کا پابند نہیں کیا، بلکہ حالات کے مطابق طریقِ انتخاب اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، تاہم یہ ضروری ہے کہ حکمران کو مکمل اعتماد حاصل ہو، ورنہ بغیر اس کے یہ طریقہ غیر شرعی ہو جاتا ہے۔

کسی ملک کے لیے جہاں مارشل لا نافذ ہو، جمہوریت کے حصول کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے انتخاب۔ طریقۂ انتخاب جو آئین میں موجود ہے تبدیل کرنے کا ہمیں حق حاصل نہیں اس لیے یہ بحث لاحاصل ہے۔ اس مسئلے پر بحث کا آغاز کر کے موجودہ حکمران عوام کی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔ اگر موجودہ حالات میں طریقۂ انتخاب کو تبدیل کرنا ہمارے اختیار میں ہوتا، تو ہم ہر قسم کا مشورہ قبول کر لیتے، مگر آئین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

جو علما قوم کو مروجہ طریقۂ انتخاب کے خلاف مشورہ دیتے ہیں میں انہیں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ آپس میں بیٹھ کر شرعی طریقۂ انتخاب کا فارمولا تیار کریں لیکن اس دوران ملک میں عام انتخابات کروائے جائیں۔ عوامی حکومت قائم ہوتے ہی شرعی طریقۂ انتخاب کا فارمولا پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے اور ہم آئین میں ترمیم کر کے انتخاب کا شرعی قانون بنا لیں گے، لیکن ایک بار لازماً ہمیں موجودہ طریقِ انتخاب کے تحت الیکشن کرانے ہوں گے، ورنہ مارشل لا ہمیشہ کے لیے نافذ رہے گا۔

صدارتی نظامِ حکومت اور پارلیمانی نظامِ حکومت دونوں کی بنیاد جمہوری اصولوں پر استوار ہے۔ ان کی مثالیں مختلف ممالک میں مل سکتی ہیں۔ اگر صحیح معنوں میں ان پر عمل کیا جائے، تو دونوں میں زیادہ تفاوت نہیں۔ پاکستان کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ایوب خاں مرحوم نے صدارتی طرزِ حکومت اپنایا۔ اس سے قبل ۱۹۵۶ء کے آئین میں جو پاکستان کا پہلا باقاعدہ آئین تھا، پارلیمانی نظام اپنایا گیا۔ ایوب خاں صدارتی نظام میں ایک فوجی ڈکٹیٹر تھے۔ وہ پارلیمانی نظام کے صرف اس لیے خلاف تھے کہ یہ نظام ان کے اختیارات کو محدود کر دیتا تھا۔ اگر وہ وزیرِ اعظم بننا پسند کر لیتے، تو پھر ملک کے "فرسٹ سٹیزن" نہیں بن سکتے تھے، تاہم جس انداز میں انہوں نے صدارتی نظام کو چلایا وہ جمہوری اصولوں کے مطابق نہ تھا۔ پاکستان کے عوام نے اس نظام کے خلاف فیصلہ دیا، چنانچہ ان کے خلاف تحریک چلی اور گول میز کانفرنس میں انہوں نے اس تحریک کے دو اہم مطالبات منظور کر لیے۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن اور پارلیمانی نظام۔ ان کے بعد اس ملک میں جنرل یحییٰ خاں نے مارشل لا کے تحت صدارتی نظام برقرار رکھا۔ اس نے ۱۹۷۰ء میں الیکشن کرائے، مگر اس کے نتائج کو تسلیم نہ کیا اور نتیجتاً پاکستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو صدر بنے، لیکن پارلیمنٹ نے ۱۹۷۳ء کے آئین میں متفقہ طور پر پارلیمانی نظام کے حق میں رائے دی۔ دستوری کمیٹی نے بھی اسی نظام کی سفارش کی تھی۔

انتخابی نظام کو بار بار بدلنے سے ملک میں استحکام پیدا نہیں ہوگا، اس لیے ایسے مسائل کو چھیڑنا ملک کو کمزور کرنے اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ پارلیمانی نظام جیسا بھی ہے، اسے ہی قائم رکھنا چاہیئے اور موجودہ خلا کو پُر کرنے کے لیے فوری طور پر انتخاب کرانے چاہیئں۔

(نوائے وقت، ۲۵ جون ۱۹۸۰ء)

www.tezpakistan.com

اسلوبِ گفتار

www.tezpakistan.com

مولانا مفتی محمود
صدر قومی اتحاد پاکستان

تاریخ 14.7.78

حال جناح ہسپتال کراچی
محمود

مخدوم و مکرم جناب مولانا محمد حسین صاحب زید مجدکم

سلام مسنون — مزاج گرامی —

میں الحمد للہ اب بہت اچھا ہوں — بخار ہوتا تھا۔ اب بالکل نہیں ہے۔
انگوٹھے پر کافی زخم ہے۔ وہ مندمل ہو رہا ہے — تو انشاء اللہ تعالیٰ فکر نہ کریں
اتحاد انشاء اللہ قائم رہیگا — اگر کوئی شخص یا جماعت علماء المسلمین کی قربانیوں
اور شہداء کے خون سے بیوفائی کر کے اپنی اغراض کی تحت الگ ہو جاتا ہے۔
وہ انشاء اللہ رسوا ہوگا۔ اور انجام بد کو پہنچیگا — ہماری انتہائی کوشش ہوگی
کہ اتحاد موثر ہو کر قائم رہے — اور اگر پھر بھی ٹوٹتا ہے۔ تو ہماری ذمہ داری نہیں ہوگی۔
مسلم لیگ والوں نے قومی اتحاد کے فیصلہ کے برعکس حکومت میں شمولیت کی ہے۔
میں نے ۱۳ جولائی کو کراچی میں سربراہان جماعت کا اجلاس بلایا ہے۔
اس سلسلہ میں غور ہوگا — جہاں تک جمعیۃ علماء پاکستان کا تعلق ہے۔ تو ہم تو بہت پہلے سمجھ چکے تھے
کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں چلتے — اس لئے ان کے علیحدگی کے اعلان سے ہم نے کوئی اثر نہیں لیا
آئندہ کے لائحہ عمل اور مخالفین کے اعتراضات سے محفوظ رہنے کا سوچ رہے ہیں —
اور مجھے یقین ہے۔ کہ ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس لئے ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا
خداوند قدوس کی ذات سب پر غالب ہے۔ وہ سب کچھ درست کر دیگا۔ دعاؤں کی درخواست ہے۔ تمام
دوستوں کو نام بنام سلام مسنون عرض کریں
محمود

ایک اور خط — مولانا محمد حسین ہزاروی کے نام

www.tezpakistan.com

ایک اچھوتا انٹرویو
جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوا

اختر کاشمیری

مفتی صاحب کے ہاتھ کی لکیروں سے چند مُلاقاتیں

ہر انسان دو ہاتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان ہاتھوں پر پیدائشی طور پر ہی بہت سی چھوٹی بڑی لکیریں موجود ہوتی ہیں۔ ان کے مقاصد و مطالب کے بارے میں گوتم بُدھ کے عہد سے لے کر اب تک مختلف انداز میں اظہارِ خیال ہوتا رہا ہے۔ یہ اظہارِ خیال بظاہر وہم کا خشک جھگڑا معلوم ہوتا ہے، لیکن ماہرینِ علم الید بڑے وثوق کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانی ہاتھوں پر قدرت نے لکیروں کا یہ وسیع جال بلا مقصد نہیں پھیلایا۔ ان کا کہنا ہے کہ قدرت نے ہر بشر کے ہاتھوں پر اس کی داستانِ حیات تحریر کر دی ہے۔ اس ریکارڈ میں کوئی شخص اپنی خواہش سے ردوبدل نہیں کر سکتا: البتہ قدرت اس تحریر میں حسبِ ضرورت خود ہی تغیر و تبدل کرتی رہتی ہے۔ ان مکمل، نامکمل، منتشر اور پراگندہ لکیروں سے نتائج اخذ کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر ان نتائج کے حصول اور طریقِ حصول میں بھی زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ علمائے شریعت اس گورکھ دھندے کو حیاتِ انسانی کے لیے حکمنامہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کے ہاتھ کی کسی لکیر کے بارے میں کوئی حکم لگایا اور نتیجۃً وہی بات رونما ہو گئی، تو یہ محض اتفاق سمجھا جائے گا، اس حکم کو منشائے الٰہی سمجھنا درست نہ ہوگا۔ ہاں، اندازے اور تخمینے کی بات درست ہو سکتی ہے کہ جیسے حکیم نبض دیکھ کر مریض کی کیفیت معلوم کر لیتا ہے؛ تاہم یہ ایک فکری و نظری علم ہے جسے دنیا بھر میں دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس کی کسی دلیل کو یقینی سمجھنا یقیناً درست نہیں، لیکن ظنی اور امکانی درجے کی بہت سی صداقتیں بھی اس میں موجود ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں مجھے اس فن سے گہری دلچسپی تھی۔ اس دور میں مَیں نے نہ صرف مختلف ہاتھوں کا مطالعہ کیا، بلکہ کراچی کے ایک معمر پنڈت کے علم و تجربے سے بھی استفادہ کیا۔ بعد ازاں مجرموں، قاتلوں، مجاہدوں، غازیوں، عابدوں، عالموں، عوام، خواص، قومی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم لوگوں کے ہزاروں ہاتھ دیکھے اور ان کی لکیروں سے بہت کچھ اخذ کیا۔

مفتی محمود صاحب کا ہاتھ دیکھنے کا مجھے تین بار اتفاق ہوا۔ پہلی بار ۱۹۷۰ء کے انتخابی ہنگامے کے دوران مَیں نے کوئٹہ میں ان کا ہاتھ دیکھا۔ اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مفتی صاحب کے بازو دابتے ہوئے ہاتھوں پر بھی نظر ڈال لی۔ دوسری بار ۱۹۷۶ء میں اسی طرح ان کا ہاتھ دیکھنے کی کوشش کی۔ تیسری بار اگست ۸۰ء میں لاہور میں ان کے میزبان غلام دستگیر خان کی جائے رہائش پر ان سے انٹرویو لینے گیا، تو اس وقت بھی ان کے ہاتھ کا مطالعہ کیا۔ اس مرتبہ ایک لکیر کو دیکھنے کے لیے دو بار مَیں نے ان سے قلم طلب کیا اور دونوں بار ان کے ہاتھ پر نظر جمائے رکھی۔ ہر چند کہ مَیں

www.tezpakistan.com

نے چوری چھپے ان کے ہاتھ کا مطالعہ کیا ہے، لیکن ہاتھ کی کوئی اہم لکیر میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکی۔ میں اپنے اس مطالعے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کا ہاتھ عام انسانوں سے خاصا مختلف تھا۔ اگلے صفحے پر دیے گئے خاکے پر ایک نظر ڈالیں، تو اس میں آپ کو مفتی صاحب کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا سیدھا اور بے لچک نظر آئے گا ——— جبکہ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اس کے بالکل برعکس ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرتاً یہ انتہائی نرم دل ہیں اور ساتھ ہی ارادوں میں بھی سختی نہیں، ایک سادہ دل اور سادہ مزاج انسان ہیں جو ہر ایک پر اعتبار کر لیتے ہیں اور ہر ایک کے مشورے کو صائب جانتے ہوئے اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں، لیکن فطری ہاتھ کے مقابلے میں کسبی ہاتھ کا انگوٹھا ظاہر کرتا ہے کہ حالات سے سبق سیکھنے کی ان میں بے پناہ صلاحیت ہے اور اس صلاحیت کے باعث ان کے ارادے پہاڑوں کی طرح اٹل اور عزائم ستاروں کی مانند روشن ہیں۔ مزاج کی نرمی میں سختی بھی آ سکتی ہے اور جب سختی آ جائے، تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں نرمی پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ کیفیت طبیعت کے دو ایسے متضاد پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہے جن میں مفتی صاحب منفرد ہیں۔ اس کی آسان تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ ایسے آدمی پر فطرت غالب آ جائے، تو "ریشم کی طرح نرم" اور تجربات غالب آ جائیں، تو فولاد سے سخت تر۔ مفتی صاحب کے کسی بھی ہاتھ کا انگوٹھا اور انگشتِ شہادت پکڑ کر مخالف سمتوں میں کھینچیں، تو درمیانی حلقہ ٹوٹ کر ایک سیدھی سڑک نمودار ہو جاتی ہے۔ ماہرینِ فن کہتے ہیں ایسا آدمی وسیع المشرب، وسیع المطالعہ، غیر متعصب، ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ تعصب اور تنگ نظری سے اسے طبعاً نفرت ہوتی ہے۔ مزید برآں اس سے روشن خیالی، تجسس، تفکر، خوش مزاجی اور دریا دلی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ مفتی صاحب کی انگلیاں لمبی اور نوکدار ہیں۔ ایسی انگلیوں کے مالک غیر معمولی فہم و فراست کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کو حالات کا تجزیہ کرنے اور آنے والے دنوں کے بارے میں پُرامید رہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ایسے لوگ قبل از وقت درست تجزیہ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مفتی صاحب کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کے وسط سے شروع ہو کر کلائی کے حلقے تک جاتی ہے۔ اس لکیر کے اندر حلقۂ زہرہ کے گرد دو مزید لکیریں پوری آب و تاب سے

نیا فارمولا

ہاشمی منجن (براؤن لیبل)

ہاشمی سُرمہ بنانے والوں کی ایک اور پیشکش .....

ہاشمی منجن بلو لیبل کے بعد اب ہاشمی منجن کا نیا فارمولا

ہاشمی منجن براؤن لیبل جو دانتوں سے پان، سگریٹ، کافی وغیرہ کے داغ دھبے دُور کر کے اُن کا قدرتی رنگ و چمک واپس لے آتا ہے ——— جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ ہاشمی منجن براؤن لیبل نہ صرف خوشگوار و خُوشبودار ہے بلکہ اِس کا مستقل استعمال دانتوں اور مسوڑھوں کو تمام بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

نوٹ:- اگر دانتوں میں دَرد ہو، ٹھنڈا گرم پانی لگتا ہو، مسوڑھے متورّم ہوں یا خون آتا ہو تو ہاشمی منجن بلو لیبل، بوتل پر لکھے ہوئے طریقے سے استعمال کیجئے۔

تیار کردہ:- محمّد ہاشم تاجرِ سُرمہ - ایم اے جناح روڈ - کراچی - فون: 216684

www.tezpakistan.com

چمک رہی ہیں۔ زندگی کی لکیر کے آغاز میں ایک زنجیرہ ہے جو ابتدائی زندگی میں سخت کٹھن جدوجہد اور ناسازگار حالات کو ظاہر کرتا ہے۔ جن لوگوں کی زندگی کا آغاز اس انداز میں ہوتا ہے، وہ بڑے تجربہ کار ہوتے ہیں۔ دوسروں کے کام آنا ان کی طبیعت کا لازمہ ہوتا ہے۔ زندگی کی لکیر کے آغاز میں ایک ایسی علامت بھی موجود ہے جو کسی متعدی بیماری کی نشاندہی کرتی ہے جو کسی بیمار آدمی سے چل کر آ لگتی ہے، لیکن یہ کسی علاج کے بغیر محض قوتِ ارادی کے بل پر ختم ہو جاتی ہے۔ ۲۵ سے ۵۵ سال کا عرصہ انتہائی تندرستی کا آئینہ دار ہے۔ زندگی کی لائن کے ساتھ ہی دماغ کی لکیر شروع ہوتی ہے جو ہتھیلی سے بالکل سیدھی گزرتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔ اس لکیر پر کوئی داغ دھبہ موجود نہیں۔ لکیر باریک ہے نہ موٹی۔ ایسی لکیر کو سب سے عمدہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اتنی صاف اور سیدھی لائن صرف عبقری لوگوں کے ہاتھ کا خاصہ ہے۔ ایسے لوگ اپنے دماغ کے باعث شہرت پاتے ہیں۔ ان کا دماغ قابلِ فخر ہوتا ہے اور یہ بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی کے ماتحت کام نہیں کرتے اور سربراہ کی حیثیت سے دوسروں سے آگے نکلنے اور انہیں ماتحت کی حیثیت سے چلانے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔ ٹیکنیکل لائن میں ہوں، تو موجد بن سکتے ہیں۔ اقتدار میں ہوں، تو نئے نئے کام کرتے ہیں۔ مذہب سے وابستہ ہوں، تو نکتہ آفرینی کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ قوتِ استدلال اور حاضر جوابی ان کا نمایاں وصف ہوتا ہے۔ البتہ دماغ کی لکیر کے آخر میں ایک باریک سی شاخ میدانِ مریخ کا رُخ کرتی ہے۔ اس پر بعض اہلِ فن نے یہ حکم لگایا ہے کہ ایسے آدمی کو جو شخص بلاوجہ تنگ کرے، اس کو جب غصہ آئے گا، تو بدلہ لیے بغیر ٹل نہیں سکے گا، خواہ اس کے لیے اسے تمام عمر انتظار کرنا پڑے؛ تاہم اس سے دیگر نتائج بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ باقاعدہ شاخ بن جائے، تو اس سے قوتِ تحریر بھی مراد لی جا سکتی ہے۔

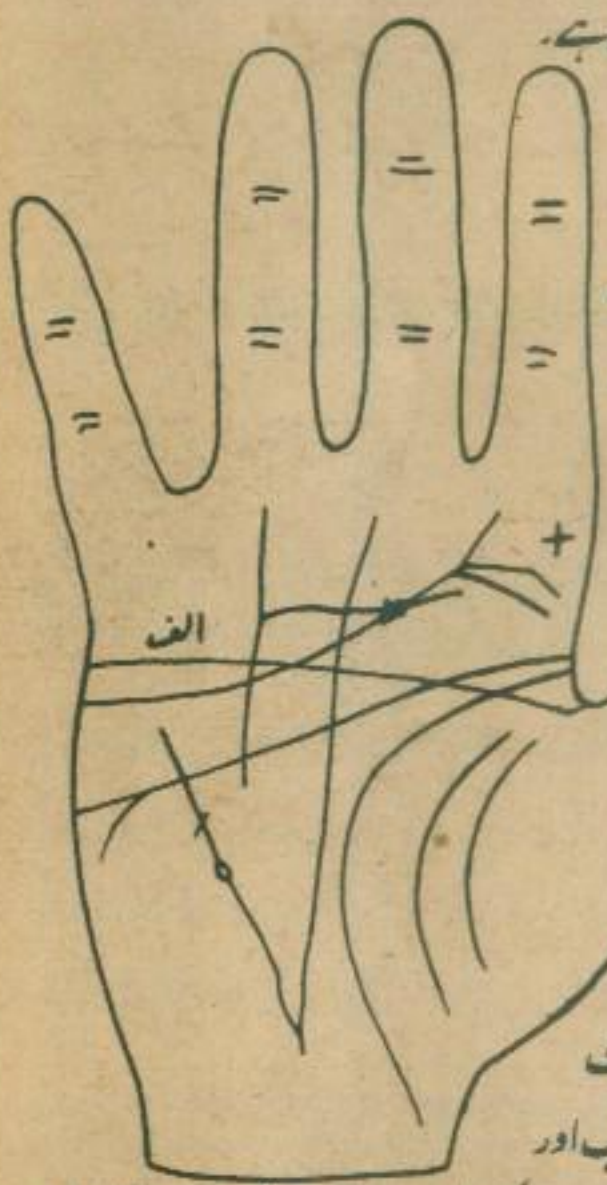

مفتی صاحب کے ہاتھ پر دل کی لکیر بھی انتہائی پائیدار تھی اور وہ تمام خوبیاں جو دماغ کی لکیر سے ظاہر ہیں، اس لکیر سے بھی ظاہر ہوتی تھیں، لیکن اس لکیر پر آخر میں کچھ علامات قلبی امراض کی بھی نشاندہی کرتی تھیں۔ جن دنوں میں نے یہ لکیر آخری بار دیکھی، اس وقت خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ دل کی لکیر سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ مفتی صاحب اعلیٰ اور نفیس ذوق کے مالک ہیں۔ اچھی چیزیں نہ صرف ان کے دل کو بھاتی ہیں، بلکہ ایسا اوقات دل کی تقویت کا باعث بھی ہوتی ہیں۔

مفتی صاحب کی صحت کی لکیر اگرچہ واضح اور مضبوط تھی، لیکن اس پر جا بجا باریک جزیرے، زنجیرے اور نشانات تھے جو صحت کی ناپائیداری کو ظاہر کرتے تھے؛ تاہم دوسری بعض لکیریں ظاہر کرتی تھیں کہ صحت کو آخر دم تک سہارا ملتا رہے گا اور صحت کی کمزوری جان لیوا ثابت نہیں ہوگی۔

ان کی شمسی لائن اس قدر واضح تھی کہ اتنی واضح لکیر کسی ہاتھ پر نظر نہیں آتی۔ مشاہیر کے ہاتھ پر یہ لکیر ضرور موجود ہوتی ہے، لیکن اتنی طویل لکیر شاید ہی کسی ہاتھ پر موجود ہو، ایسی لکیر کے حامل افراد شہرت کے آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ لکیر عموماً خطِ قلب تک ہوتی ہے اور اتنی لکیر ہی بہت زیادہ شہرت اور خوش بختی کی علامت سمجھی جاتی ہے، لیکن مفتی صاحب کے ہاتھ پر یہ لکیر خطِ قلب اور خطِ دماغ سے گزر کر بہت آگے تک بڑھی ہوئی تھی۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل افراد میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ہاتھ پر اتنی طویل اور واضح لکیر نظر آئے گی۔ ایسے لوگوں کے ہاں شہرت اچانک آتی ہے اور وہ اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کی بدولت اسے برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شمسی لکیر سے مفتی صاحب کے ہاتھ پر ایک منفرد لکیر نکل کر ابھارِ مشتری کی طرف جاتی ہے جو اچانک اقتدار حاصل کرنے کی علامت ہے، لیکن یہ لکیر ابھارِ مشتری سے دُور ہے۔ اگر یہی لکیر ابھارِ مشتری کو چھو لے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو اقتدار سے مالی فوائد حاصل ہوں گے اور جب یہ لکیر دُور رہ جائے، تو اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ ایسا شخص اقتدار سے منفعت حاصل نہیں کرے گا۔ اس لکیر کا آگے کو بڑھا ہوا رُخ اپنے اُوپر ایک ایسا اشارہ لیے ہوئے ہے جو اقتدار سے اچانک بے دخلی کو ظاہر کرتا ہے، لیکن لکیر اس اشارے سے آگے جا چکی ہے جو اس امر کی ضمانت ہے کہ اس شخص کے اقتدار میں جانے کے مزید مواقع موجود ہیں، لیکن عین اسی مقام پر یہ لکیر دل کی لائن کو کراس کرتی ہوئی آگے بڑھتی

www.tezpakistan.com

ہے اور اسی مقام پر قلب کی لکیر پہ وہ خطرناک اور جان لیوا نشان دکھائی دیتا ہے جو زندگی کا سلسلہ قطع کرنے اقتدار میں جانے کے مواقع ختم کر دیتا ہے۔ یہ مجموعی طور پر ایک رُوحانی پیشوا، قومی قائد، خوش مزاج اور دولتِ دنیا سے بے نیاز انسان کا ہاتھ ہے، لیکن مفتی صاحب کے اس ہاتھ پر ایک انوکھی اور منفرد لکیر ایسی بھی ہے جس کے بارے میں میری معلومات صفر ہیں۔ مَیں نے ایسی لکیر نہ تو کسی ہاتھ پر دیکھی ہے اور نہ کسی کتاب میں اس کے بارے میں کچھ پڑھا ہے۔ یہ لکیر خطِ زندگی سے ذرا اوپر انگوٹھے کی طرف سے نکلتی ہے، دماغ اور دل کی لکیروں سے گزرتی ہوئی ہتھیلی کے آخری حصے تک چلی جاتی ہے۔ یہ لکیر ان کے دونوں ہاتھوں پر اسی صورت میں موجود ہے اور ہاتھ کی دیگر تمام لکیروں سے نمایاں ہے (جسے خاکے میں الف سے ظاہر کیا گیا ہے)۔۔۔ یہ لکیر غیر معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ شاید کوئی صاحب فن اس پر روشنی ڈال سکیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مَیں نے اسی لکیر کے لیے تین بار مفتی صاحب کے ہاتھ دیکھے تھے۔

✺

کہتے ہیں کہ زندگی پر نام کا بڑا اثر ہوتا ہے، نام کی ظاہری کشش اور باطنی اثرات پوری زندگی پر محیط ہوتے ہیں اور یہی اثرات انسان کو عروج واقبال سے ہمکنار کرتے ہیں۔ اسی اصول کے تحت ہم مفتی صاحب کے نام محمود احمد کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ظاہری طور پر یہ نام بہت اچھا ہے، لیکن اس میں انفرادیت نہیں۔ متعدد لوگ اس نام کے حامل ہو سکتے ہیں، لیکن اس نام کے ساتھ جب صاحبِ نام کی ایک ذاتی صفت مفتی کا اضافہ ہوا، تو یہ نام منفرد ہو گیا، لیکن سہ لفظی طوالت اس کی ظاہری کشش کو متاثر کرتی تھی؛ چنانچہ یہی نام جب زبانِ خلق پر آیا، تو مختصر ہو کر مفتی محمود رہ گیا۔ مفتی محمود اپنے اندر ظاہری حُسن کے علاوہ اپنی انفرادیت بھی لیے ہوئے ہے اور یہی انفرادیت اس کی زندگی پر بھی اثر انداز ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس نام کی ظاہری کشش، صوتی حُسن اور انفرادیت زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوئی، اس وقت ہم اپنی گفتگو اس نام کے باطنی اثرات تک محدود رکھتے ہیں۔ ہر نام کے جملہ حروف کے اعداد سے ایک حاصل نمبر ملتا ہے جسے اس نام کا "مونو" کہا جا سکتا ہے۔ اسمِ ذات کا یہی نمبر اس کے حامل کی خوشی ناخوشی اور کامیابی و ناکامی کا پتہ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مفتی محمود کے نام کے مفرد اعداد یہ ہوں گے: م ف ت ی (۴ ۸ ۴ ۱) ۱۷ مفرد عدد ۷، ۱ ہوا جن کا حاصل نمبر ۸ ہے۔ م ح م و د (۴ ۸ ۴ ۶ ۴) ۲۶، مفرد عدد ۶ اور ۲ ہوا۔ ان کا حاصل بھی ۸ ہے۔ ۸ اور ۸ — ۱۶ — ۶ اور ۱ — ۷، مفتی محمود کا حاصل نمبر یہی ہے۔ علاوہ ازیں مفتی صاحب کی تاریخِ پیدائش ۶، ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تاریخ پیدائش ۴، جنوری ۱۹۱۹ء بنتی ہے۔ اس کا حاصل بھی ۷ ہے۔ سات کا عدد روزِ اوّل سے پُراسرار مانا گیا ہے۔ یہ عدد رُوحانی شخصیات کا لازمہ ہوتا ہے۔ اہلِ فن اسے آفاقی عدد بھی کہتے ہیں اور زمین و آسمان میں اس کے اثرات کو موجود مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ عدد قدرت کا پسندیدہ ہے۔ اس نے بہت سی اہم تخلیقات میں اس عدد کو شامل کیا ہے۔ مثلاً زمینیں سات، آسمان سات، ہفتے کے ایام سات، قوسِ قزح کے رنگ سات، ایک روایت کے مطابق اصحابِ کہف بھی سات، جنت کے دروازے سات، مشہور کواکب بھی سات ہیں۔ اسی سبع مثانی کی اپنی شہرت ہے۔ سات کا عدد بطورِ تعویذ بھی استعمال ہوتا ہے۔ بہت سے ممالک میں ماہرینِ عملیات بچوں کے گلے میں ڈالنے کے لیے یہی تعویذ دیتے ہیں۔ سات کے عدد کے حامل کے بارے میں ماہرینِ علم الاعداد حسبِ ذیل رائے دیتے ہیں:

یہ نمبر فہم و فراست کا نشان ہے۔ قابل اور سلجھے ہوئے خیالات کا آئینہ دار ہے۔ اس نمبر کا حامل فلسفیانہ فکر کا مالک ہوتا ہے۔ ستاروں کے لحاظ سے اس کا تعلق یورنس سے ہے۔ جو لوگ اس نمبر کے زیرِ اثر ہوتے ہیں، وہ باریک بین، دُور اندیش اور تجسس پسند ہوتے ہیں۔ فلسفیوں کا یہی نمبر ہوتا ہے۔ اس کے حامل افراد ہر وقت دوسرے نمبروں کے زیرِ اثر یا پھر خود اختیاری طور پر مصروفِ عمل رہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ نمبر دنیا کے معاملات میں توجہ اور رزِ جویانہ تفضّل کا مالک ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی بیشتر زندگی سفر میں گزرتی ہے۔ وہ نئے مقامات دیکھنے کے بے حد شائق ہوتے ہیں۔ یہ نمبر ایک ایسے لیڈر کی علامت ہے جو فطری خوبیوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اپنی رائے پر قائم رہتا ہے اور اکثریت کی رائے کے خلاف اپنی رائے کو بامقصد سمجھتا ہے۔ ایسا شخص سادگی پسند ہوتا ہے، کیونکہ وہ سب سے الگ تھلگ رہنے کا عادی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے سات نمبر بہت موزوں ہوتا ہے۔ مثال کے لیے ۷، دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۷، مارچ ۱۹۷۷ء کو ذہن میں رکھیے۔

✺

www.tezpakistan.com

مزارعت

امام ابوحنیفہؒ

امام مالکؒ اور

امام شافعیؒ

تینوں کے نزدیک ناجائز ہے

ضرورت پڑے، تو——

حکومت، مزارعت کا نظام ختم کر دے

سر پر ایک سلکی رومال، عمامے کا منصب ادا کرتا ہوا، گھنی ڈاڑھی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتی ہوئی، آنکھوں میں تدبّر کی گہرائیاں، چہرے پر ماہ و سال کے نقوش، کھلا کرتا اور شلوار جسے دیکھ کر کراچی میں پنجاب یاد آجائے۔ آواز میں سنجیدگی اور متانت کا آہنگ، نیچے دری پر آلتی پالتی مارے، گاؤ تکیے کا سہارا لیے، مولانا مفتی محمود صاحب کو معتقدین کے سامنے سیاست و مذہب کے اسرار و رموز کھولتے ہوئے دیکھا، تو مجھے پہلے کوئی ایسا سیاسی رہنما یاد نہ پڑا جسے اس درویشی کی حالت میں ایک مسجد کے حجرے میں دیکھا ہو؛ البتہ میرے ذہن کے گوشوں میں تاریخ کے بعض اوراق انگڑائیاں لے کر اٹھے اور میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے، جب مذہب و سیاست یک جا تھے اور مسجد سیاست کا بھی مرکز تھی، صرف عبادت گاہ ہی نہیں تھی۔

"پاکستان کا سب سے بنیادی مسئلہ پاکستان میں اس نظام کو قائم کرنا ہے جس کے لیے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔" مفتی صاحب میرے پہلے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ ان کی آواز میں اعتماد اور تیقّن تھا۔ معتقدین ہمہ تن گوش تھے۔ میں گردن جھکائے ان کے خیالات قلم بند کرنے میں محو تھا۔ کنکھیوں سے دیکھا، تو ریاض کیمرے کو سنبھالے نشانہ لینے میں مصروف تھا۔ اس کی حالت پتلی تھی۔ ارد گرد ایسے لوگ تھے جن سے کسی بھی لمحے خطرہ تھا کہ وہ اس گستاخی پر کمرہ ہی نہ چھین لیں۔

میرا قلم پہلے فقرے سے پیوستہ یہ جملہ لکھ رہا تھا: "اس لیے کہ پاکستان کا وجود، پاکستان کی سلامتی اور استحکام اسلامی نظام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کہا یہ گیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان میں اسلامی محاکم قائم ہوں گے اور پاکستان کا معاشرہ اسلام کی بنیادوں پر استوار ہوگا۔ یہاں کے مسلمان باشندوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے تمام مواقع فراہم کیے جائیں گے، لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے اندر سیاسی قوت ۲۲ سال تک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جنہوں نے آج تک مسلمانوں کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک اسلامی ملک کے آزاد شہری ہیں۔ مسلمان سب سے زیادہ اپنے مذہب سے پیار کرتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کے لوگوں کے مزاج کے خلاف اگر کوئی نظام وہاں قائم ہوگا، تو وہ اس ملک کے ضعف و کمزوری کا سبب ہوگا، اس لیے پاکستان میں استحکام کے لیے ضروری ہے کہ یہاں سب سے پہلے اسلامی نظام قائم کرنے کی حقیقی معنوں میں کوشش کی جائے۔"

www.tezpakistan.com

مفتی صاحب نے ذرا سا سانس لینے کی کوشش کی، تو میں نے فوراً یہ سوال کر دیا: "لیکن اسلامی نظام نافذ کیسے کیا جائے؟"

کہنے لگے: "یہ واقعی خاصا مشکل سوال ہے کہ (اس ملک میں) اسلامی نظام کیسے نافذ کیا جائے؟ اسلامی نظام کے قیام کے لیے سب سے مقدم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی اور ملی شعور بیدار کر کے انہیں پوری آزادی کے ساتھ اپنے نمائندے منتخب کرنے کا احساس دلایا جائے اور پھر ملک میں ہر قسم کے دباؤ اور اثرات سے آزاد انتخابات کا باقاعدہ انتظام ہو تاکہ پاکستان کا ہر مسلمان شہری لالچ، غرض اور کسی خارجی اثر سے بے نیاز ہو کر نیک و بد کی تمیز کرتے ہوئے اپنے نمائندے منتخب کرے۔ وہ لوگ جن کی اپنی زندگیاں اسلام کے منافی ہوتی ہیں، وہ اسلامی مشورے کر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم اسلام کے نظام کو قائم کریں گے۔ ان لوگوں سے مایوس ہو جانا چاہیے، کیونکہ جو حضرات اپنے چھوٹے سے ملک (یعنی سر سے پاؤں تک جو کہ قریباً ۶ فٹ طویل ہے) میں اسلام کو نافذ نہیں کر سکتے، اور جو اپنے گھر پر مشتمل صرف چند مرلوں کے ملک میں اسلام کے نظام کو نافذ نہیں کر سکتے؛ حالانکہ وہاں ان کی مرضی چلتی ہے، وہ اتنے بڑے وسیع و عریض پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے روادار کیسے ہو سکتے ہیں۔"

ہمارا دوسرا سوال تھا: "پاکستان کے لیے کونسا نظامِ حکومت بہتر ہے؟" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی نظام کا قیام برحق، مگر ہمیں آج کے دور کی اصطلاحات پارلیمانی نظام اور صدارتی نظام کے مطابق بتائیے، نظامِ حکومت کی کیا شکل ہو گی؟

مفتی صاحب نے فرمایا: "اصل بات سربراہِ حکومت کی اہلیت ہے۔ اسلام اس میں خود کوئی اصول وضع نہیں کرتا، بلکہ مسلمانوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے مطابق بہتر صورت خود تجویز کریں۔ ایک دلچسپ بات میں آپ کو بتاؤں کہ اسلام میں کسی سربراہ کو معزول کرنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن سربراہ کے انتخاب کی بہت کڑی شرطیں ہیں کہ وہ علمی، عملی، دینی اور فکری اعتبار سے بہتر ہو۔ ان سب اصولوں کے پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر سربراہ منتخب کیا جائے، تو اسے معزول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے سربراہ اگر اب تک یعنی چودہ سو سال زندہ رہتے، تو انہیں کون معزول کرتا، لیکن ایوب خاں جیسے آمر کو تو پہلے دن منتخب کرنا ہی غلطی ہے، کیونکہ ہمارے ہاں موجودہ حالات کے تحت ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ کسی ایسے شخص میں بہت سے اختیارات اکٹھے کر لیے جائیں جو اس طرح ملک کے لیے مفید ہو سکے۔ ہمارے سامنے ایوب خاں کی دس سالہ آمریت کی مثال ہے۔ اس لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ ان حالات کے تحت وہی انتظام بہتر ہو گا کہ جس میں سربراہ کے اختیارات تھوڑے ہوں اور زیادہ اختیارات عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہوں۔"

مفتی صاحب نے اپنے اس موقف کی مزید وضاحت فرمائی: "ہم محدود جمہوریت کے قائل ہیں جو علی الاطلاق جمہوریت ہے حاکمیتِ عوام اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حاکمیت کا حق صرف اللہ رب العزت کو حاصل ہے؛ البتہ عوام کے نمائندوں کا وہ فیصلہ صحیح اور جائز ہو گا جہاں پر اللہ نے ان کو ان معاملات میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہو گا، لیکن جہاں عوامی نمائندوں کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلوں سے متصادم ہو، وہاں عوامی نمائندوں کا فیصلہ حقیقت نہیں رکھے گا۔"

اس مرحلے پر میں نے عرض کیا کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ عوامی نمائندوں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے متصادم ہے؟

"اس کے لیے کسی کورٹ سے فیصلہ لیا جائے گا۔" مفتی صاحب نے فوراً جواب دیا۔ "اور یہ وہ کورٹ ہے جو اسلامی نظام کے تحت قائم کی گئی ہو۔ ایک ایسا بورڈ بھی ہونا چاہیے جو کہ ملک کے جید علماء فقیہ النفس فضلاء پر مشتمل ہو اور جسے اسلام کی تعبیر کے بارے میں آخری اختیارات حاصل ہوں۔"

میں نے عرض کیا: "خارجہ پالیسی کن خطوط پر پاکستان کے حق میں بہتر رہ سکتی ہے؟" جواب تھا: "آزاد اور غیر جانبدار پالیسی ہی پاکستان کے حق میں بہتر ہو سکتی ہے۔ پاکستان کو اپنے مفاد کے پیشِ نظر اور اسلام کے اصولوں کی روشنی میں ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے جس سے پاکستان اسلامی ملکوں کی قیادت کی اہلیت بھی اپنے اندر پیدا کرے اور بین الاقوامی دنیا میں بھی اسے مستحکم پوزیشن حاصل ہو۔ بلاوجہ دوسروں کی جنگ میں کسی ایک کا آلۂ کار بن کر دوسروں سے مخاصمت کرنا ملک کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ پاکستان کو مغربی ممالک کے ساتھ کیے ہوئے

www.tezpakistan.com

تمام فوجی معاہدوں سے فوراً دستبردار ہو جانا چاہیے اور عرب ممالک کو یقین دلانا چاہیے کہ پاکستان ان کے بھائی کی حیثیت سے ہر وقت ان کے ساتھ ہے۔ اسی طرح پاکستان کو اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ بھی اچھے روابط قائم کرنے چاہئیں تاکہ خارجی خطرات سے محفوظ رہ کر پاکستان اندرونی ترقی کے لیے آزادی کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔"

میں نے اس ضمن میں ان سے اسلامی ملکوں کے درمیان ایک فوجی معاہدے کے امکان کے بارے میں دریافت کیا، تو انہوں نے فرمایا:

"اسلامی ملکوں کا بلاک ضرور بننا چاہیے، لیکن یہ نہیں کہ یہ امریکہ وغیرہ کا آلۂ کار بن جائے۔ آج کل اس سلسلے میں جو نعرے لگ رہے ہیں ان میں سے بیشتر اسی قسم کے بلاک کے لیے ہیں، لیکن اگر مسلمان ممالک مغربی سامراج کو شکست دینے کے لیے یا امریکی استحصالی طاقت کو مسلم ممالک سے مار بھگانے کے لیے متحد ہو جائیں، اسی طرح اشتراکیت کے اثرات سے تمام مسلمان ممالک کو محفوظ رکھنے کے لیے اسلامی ممالک کا اتحاد ہو، تو یہ یقیناً ایک نیک فال ہو گی۔"

اب مسئلہ تھا عوام کی اقتصادی الجھنوں کا۔ ہمارا استفسار تھا کہ عوام کی اقتصادی پریشانی کا فوری اور واقعی حل چند خاندانوں میں سمٹی ہوئی دولت پورے ملک کے عوام کی خوش حالی کا ذریعہ کیسے بن سکتی ہے؟ وہ جواب دینے لگے: "اس میں کوئی شک نہیں اس وقت ملک میں سب سے اہم ملک کی ۹۰ فیصد آبادی یعنی غریب آبادی کے طبقے کے مسائل ہیں جو ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں جنہیں اپنے وطن میں نہ مکان، نہ خوراک نہ لباس اور نہ زندگی کی ضرورتیں مہیا ہیں اور وہ یقیناً حیوانات سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ جب تک ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک پاکستان میں کسی کو امن و سکون حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک عام مسلمان تو پاکستان میں محنت کرنے کے باوجود اپنے بچوں کا پیٹ نہ پال سکے اور بھوک اور فاقے کی زندگی گزارتا رہے جب کہ چند انسان یہاں پر خرمستیاں کرتے پھریں۔ خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

مات الکلب جوعًا علی شط الفرات لکان عمر مسئولاً عن یوم القیامۃ۔

"اگر ایک کتا دریائے فرات کے کنارے بھوک سے مر جاتا ہے، تو قیامت کے دن عمر سے اس کا بھی سوال کیا جائے گا۔" اسلام کی تو یہ روح ہے۔

جہاں تک سوال کے دوسرے جزو کا تعلق ہے، اس کے بارے میں عرض کروں گا کہ اس کے لیے بنیادی طور پر زمینداریوں اور کارخانوں کے مسائل کا حل کرنا ضروری ہے۔ اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا شرعاً اس کا مالک ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق تمام وہ زمینیں جو عنقریب آباد ہوئی ہیں، موجودہ آبادکار مزارعین ان زمینوں کے مالک قرار دیے جائیں اور قدیم آباد زمینوں سے متعلق یہ تحقیقات کی جائے کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تھیں یا انگریز نے بطور جاگیر کے حق الخدمت میں کسی کو عطا کی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ایسی اراضی کو لازماً واپس لے کر بے زمین لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر مزارعین کی مظلومیت اس کے باوجود محسوس ہو، تو کوئی بھی اسلامی حکومت ضرورت و معاملت کے تحت مزارعت کے سسٹم کو ناجائز قرار دے سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ تینوں امام اس پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاملہ جائز نہیں ہے۔ چونکہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور آئمہ میں اختلاف رہا ہے، اس لیے ضرورت کے تحت اس کو ممنوع قرار دینا کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا بڑے بڑے صنعت کاروں کے متعلق، تو سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ حکومت لازمی طور پر مزدوروں کی تنخواہوں کو اس حد تک بڑھا دے کہ مزدور کو اپنی محنت کا پورا صلہ مل سکے جس سے ان کی گھریلو ضروریات، بچوں کی تعلیم اور علاج وغیرہ کی حسن و خوبی کے ساتھ کفالت ہو سکے۔ اس طرح یہ مسئلہ آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ جو لوگ دس کروڑ پاکستانی بھوکے عوام کے مسائل کو حل کیے بغیر یہ سمجھتے ہیں کہ چند سرمایہ داروں سے پاکستان میں امن قائم ہو سکتا ہے، وہ جنت الحمقاء میں بستے ہیں۔ غریبوں کے مسائل حل کیے بغیر نہ پاکستان ترقی کر سکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

مفتی صاحب شاید کچھ تھکن محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے تکیہ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ پھر اگلے سوال کے لیے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اپنا چھٹا سوال پوچھ رہا تھا: "بنیادی طور پر زرعی ملک پاکستان میں زراعت کو ملکی خوش حالی کا سرچشمہ بنانے اور ترقی یافتہ زرعی ملکوں کے برابر لے

www.tezpakistan.com

[illegible]

مفتی محمود کی اعتماد سے بھرپور آواز آئی: "زراعت کو عام کیا جائے، غیر آباد علاقوں کو آباد کیا جائے۔ زمینیں بے زمین لوگوں کو الاٹ ہوں۔ آبپاشی کے ذرائع کی توسیع ہو، مشینی آلات کے ذریعے سے بھی ملکی زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہے بشرطیکہ مشینی آلات کے تمام ذرائع اجتماعی طور پر استعمال ہوں۔ ایک شخص کو یہ اختیارات حاصل نہ ہوں۔ اس طرح مزدور اور کسان بے کار ہو جائیں گے۔"

میرے سوال کی نسبت جواب مختصر تھا۔ میں نے بھی ضمنی سوال پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ عصر کا وقت قریب تھا۔ مجھے انٹرویو نامکمل رہ جانے کا ڈر تھا۔ اس لیے فوراً میں نے ساتواں سوال کر ڈالا: "صرف بڑے بڑے شہروں میں صنعتی تنصیبات نے کیا چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہات کو اقتصادی پسماندگی کا شکار نہیں کر دیا؟ اور ترقی معکوس کو جنم نہیں دیا؟"

مفتی صاحب شاید اس سلسلے میں پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ فوراً بول اٹھے: "بڑے شہروں میں کارخانوں کے قیام نے دیہات کی ترقی کیا، وجود ہی کو ختم کر دیا ہے۔ غریب لوگ دیہات سے بھاگ رہے ہیں۔ شہروں میں کارخانوں میں ملازمت کرتے ہیں۔ شہروں کے مسائل بھی اس طرح بڑھ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ دیہی ترقیاتی سکیم پر زور دیا جائے، اس لیے کہ ہمارے ملک کی غالب اکثریت دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس کے بغیر ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا اور اس روش سے ملک کی زرعی معیشت بھی بہت متاثر ہوتی ہے۔"

اب بادشِ بخیر ذکر چھڑ گیا بیوروکریسی کا۔ مفتی صاحب نے فرمایا: "اس ملک کا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو بُرا حال ہو رہا ہے وہ بیوروکریسی اور نوکر شاہی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس کا واحد حل عوام کی حکومت کا قیام ہے۔ عوامی حکومت جب حقیقی معنوں میں کسی ملک میں قائم ہوتی ہے، تو اس میں نوکر شاہی خود بخود کم ہو جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے یوم تاسیس سے لے کر آج تک ایک مرتبہ بھی ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کوئی عوامی حکومت قائم نہیں ہو سکی ہے اور شاید اس میں بھی بیوروکریسی کا ہاتھ کام کر رہا ہے، اس لیے جتنی جلد ممکن ہو، عوامی حکومت قائم کی جائے تاکہ چند غلط کار افسروں کے مظالم سے قوم کو نجات مل سکے۔" . . . (ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی، ۲۴ ستمبر ۱۹۶۹ء)

میں نے ایوب خاں کی ترمیم کے حق میں ووٹ کیوں دیا تھا؟

سوال: آپ پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ آپ مسلم لیگ کی مخالف صفوں میں شامل تھے اور اس طرح تحریک پاکستان کی مخالفت

www.tezpakistan.com

میں پیش پیش رہے۔ آپ کے اس رویے سے پاکستان کی تحریک کو نقصان پہنچا۔ یہ الزام کس حد تک درست ہے؟

جواب: کسی بھی شخص پر نظریۂ پاکستان کی مخالفت کا الزام لگا کر اسے مطعون کرنا دراصل فیشن بن چکا ہے اور مخالف سیاسی جماعتیں اس الزام کو ایک دوسرے کے خلاف "مؤثر ہتھیار" کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رجحان درست نہیں اور اس قسم کے الزامات سے قوم اور ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، کیونکہ ملک کے اندر سیاسی انارکی پیدا ہوتی ہے۔ کوئی شخص مطعون اس وقت کیا جا سکتا ہے جب اس کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے برِصغیر کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی میں برطانوی سامراج یا مسلم کُش طاقتوں کا ساتھ دیا ہو اور قیامِ پاکستان کے بعد اس مملکت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہو۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ برِصغیر میں مسلمانوں کی فعال سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کے حقوق اور اسلامی اقدار کے احیا کے لیے کسی نہ کسی صورت میں جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ ان جماعتوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس خطّے سے برطانوی سامراج کو نکالا جائے اور ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس میں خدا کے دین اور اُمتِ محمدیہؐ کا بول بالا ہو اور مسلمانوں کے حقوق محفوظ رہیں۔ ان سیاسی جماعتوں کے پروگرام مختلف ہو سکتے ہیں، مگر مقصد ایک ہی تھا اور وہ مقصد تھا اسلامی مملکت کا قیام اور اسلامی اقدار کا احیا۔ اگر اس وقت ہم نے مسلم لیگ کے پروگرام سے اختلاف کیا اور اس کے نظریات کی تائید نہ کی، تو یقیناً یہ جُرم نہیں ہے اور اس بات پر کسی کو پاکستان کے دشمنوں کی صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ ملک سے غداری یا ملک کی دشمنی کا الزام قیامِ پاکستان کے بعد تو تراشا جا سکتا ہے، اس سے قبل اگر کوئی لیڈر مسلم لیگ کی صفوں اور اس کی جدوجہد میں شریک نہیں رہا، مگر دیانت داری سے مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑتا رہا ہے، تو اسے غدار یا پاکستان کا دشمن نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اور میرے رفقا گزشتہ ۲۲ سال سے پاکستان کے بنیادی نظریہ یعنی اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں اور پاکستان کی سالمیت، تحفظ اور بقا کے لیے زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ اب بھی اگر کوئی ہمیں نظریۂ پاکستان کا مخالف سمجھتا ہے، تو اس کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ جو لوگ اس قسم کی بحث چھیڑ رہے ہیں، وہ قومی سیاست میں الجھاؤ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ انداز بہت غلط ہے۔

سوال: آپ جمعیت العلمائے اسلام کے اہم رُکن اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پیروکار تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ جماعت، جمعیت العلمائے اسلام کے نام سے دوبارہ منظم کی گئی، ماضی میں اس تنظیم کے کردار اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی عقائد کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کی جماعت جمعیت العلمائے ہند کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور اسلامی اقدار کے احیا کے لیے یہ ضروری ہے کہ برِصغیر کو انگریزوں کے تسلّط سے نجات دلا کر متحدہ ہندوستان کا قیام عمل میں لایا جائے۔ آزاد ہندوستان کے تمام صوبے خود مختار ہوں اور مرکز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب برابر ہو۔ یعنی یہ کہ ۴۵ فیصد ہندو، ۴۵ فیصد مسلمان اور ۱۰ فیصد اقلیتی نمائندے مرکز میں ہوں۔ ہمارے پروگرام کے مطابق صوبوں کے خود مختار ہونے کے بعد ہندوستان کے چھ صوبوں پنجاب (دہلی سمیت)، پورا بنگال، آسام، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں مسلمانوں کی حکومت ہوتی اور باقی سات صوبوں میں ہندو نمائندے وزارتیں بناتے۔ چونکہ مرکز میں مسلمانوں کو ہندو نمائندوں کے مساوی حیثیت حاصل ہوتی، اس لیے مسلمانوں کے حقوق محفوظ رہتے اور خود مختار مسلم حکومتوں کے معاملات میں مرکز مداخلت نہ کر سکتا۔ متحدہ ہندوستان کی یہ صورت بین الاقوامی سیاست میں نہ صرف اہم کردار ادا کرتی، بلکہ ہندوستان ایشیا کی ایک بڑی قوت بن کر مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک اور دوسری ایشیائی قوموں کی آزادی اور حقوق کے لیے بھرپور جنگ لڑتا اور استعماری اور سامراجی قوتوں کو یہاں سے باہر نکال دیتا۔ جمعیت علمائے ہند کو یقین تھا کہ طاقتور اور متحدہ ہندوستان کے معرضِ وجود میں آنے سے طاقت کا توازن یورپ سے ایشیا کی طرف منتقل ہو جاتا۔ ہماری جماعت خلوص اور نیک نیتی سے مسلمانوں کا بھلا چاہتی تھی اور اسلام کی خدمت میں مصروف تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ برِصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نے ہمارے پروگرام کو رد کر دیا اور مسلمانوں نے دو قومی نظریے کی حمایت میں قیامِ پاکستان کے مطالبے کا ساتھ دیا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھی اور جمعیت کے وہ رُکن جو مملکتِ پاکستان کی حدود میں شامل ہونے والے علاقے میں رہائش پذیر تھے، انہوں نے پاکستان کے وجود کو نہ صرف تسلیم کر لیا، بلکہ اس کے استحکام کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیں...

www.tezpakistan.com

سوال : کیا یہ درست ہے کہ آپ نے اس ملک میں آمریت کو سنبھالا دینے کے لیے سابق صدر ایوب کے ہاتھ مضبوط کیے اور ایوب خاں کے دوسرے صدارتی انتخابات میں ان کی کامیابی کے لیے راہ ہموار کی؟ میرا اشارہ ۱۹۶۲ء کے دستور میں اس ترمیم کی طرف ہے جو ایوب خاں کے ایما پر کی گئی اور آپ نے اس ترمیم کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

جواب : ۱۹۶۲ء کے دستور میں یہ دفعہ شامل تھی کہ پانچ سال کے بعد صدارتی انتخاب ہوگا اور اگر موجودہ صدر انتخابات میں حصہ لینا چاہیں، تو انہیں انتخابات سے چار ماہ قبل صدارت سے مستعفی ہو کر قومی اسمبلی کے سپیکر کو صدر کا عہدہ سونپنا ہوگا اور انتخابات کے عبوری دور میں سپیکر ہی ملک کے اس اعلیٰ منصب پر فائز رہے گا۔ اب آئین میں یہ ترمیم کرنی تھی کہ ایوب خاں ملک کے بدستور صدر رہیں اور چار ماہ کے لیے سپیکر کو قائم مقام صدر نامزد نہ کریں۔ اپوزیشن پارٹیوں کا موقف یہ تھا کہ ایوب خاں عبوری دور میں صدر رہے، تو وہ سرکاری مشینری کو استعمال کر کے ووٹروں پر اثر انداز ہوں گے اور الیکشن غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکیں گے۔ مجھے قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے اس ترمیمی بل کے حق یا مخالفت میں ووٹ دینا تھا۔ میں نے اپنی جماعت کا اجلاس طلب کیا اور ذمہ دار عہدیداروں کو بل کے مندرجات پر غور کرنے کے لیے کہا۔ جماعت نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ بل کے حق میں ووٹ دیا جائے۔ اس فیصلے کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ ایک مذہبی اور دوسری سیاسی۔ دستور میں صدر کی طرح سپیکر کے لیے مسلمان ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی۔ اس طرح دستور کی متذکرہ بالا دفعہ کے تحت غیر مسلم سپیکر عبوری طور پر پاکستان کا صدر بن سکتا تھا جو ہمارے نزدیک مذہبی اعتبار سے کسی صورت مناسب نہیں تھا۔ اس فیصلے کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ جب ہم اسی ہزار بی، ڈی ممبروں کے منتخب نمائندے کو ملک کا جائز صدر تسلیم نہیں کرتے، تو قومی اسمبلی کے ڈیڑھ سو ممبروں کے منتخب سپیکر کو یہ حق کیسے دے سکتے تھے کہ وہ (عبوری دور کے لیے سہی) کرسیٔ صدارت پر متمکن ہو جائے اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دستور میں کہیں شرط نہیں تھی کہ سپیکر قائم مقام صدر ہونے کے بعد صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ظاہر ہے کوئی سپیکر جسے چار ماہ کے لیے صدر نامزد کیا گیا ہو، اگر وہ

وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر جامعہ الازہر کے شیخ کا استقبال کر رہے ہیں

www.tezpakistan.com

صدارتی انتخاب لڑنا چاہے، تو قائم مقام صدر کی حیثیت سے سرکاری مشینری کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا۔ ان حالات میں موجودہ صدر کے لیے آئندہ صدارتی الیکشن کے پیشِ نظر چار ماہ قبل مستعفی ہو جانا محض تکلف تھا؛ لہٰذا میں نے ترمیم کے حق میں ووٹ دے دیا۔ اگر میں نے ایسا کیا، تو یقیناً کوئی گناہ نہیں کیا اور میرے اس اقدام سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں نے ایوب خاں کی آمریت کو سنبھالا دیا تھا۔

سوال: کیا آپ قرآن کو مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں؟ آپ کے نزدیک اس مکمل ضابطۂ حیات کی موجودگی میں سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کی گنجائش باقی رہتی ہے؟

جواب: ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا یہ عقیدہ ہے کہ میں اسلام کو ہمہ گیر اور جامع نظامِ زندگی سمجھتا ہوں۔ اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ قرآن زندگی کے تمام شعبوں میں انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے اور قرآن کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لیے کسی نظریہ، کسی ازم اور کسی دوسرے عقیدے کا سہارا لینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، لیکن میں یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کہ ان دنوں اسلام اور سوشلزم کی جو بحث چھڑی ہوئی ہے، وہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ میرے نزدیک یہ سیاسی اقتدار کی لڑائی ہے۔

سوال: آپ کے نزدیک اسلام اور سوشلزم میں کیا فرق ہے؟

جواب: نُور اور ظلمت میں کیا فرق ہوتا ہے؟

(روزنامہ مشرق لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۷۰ء)

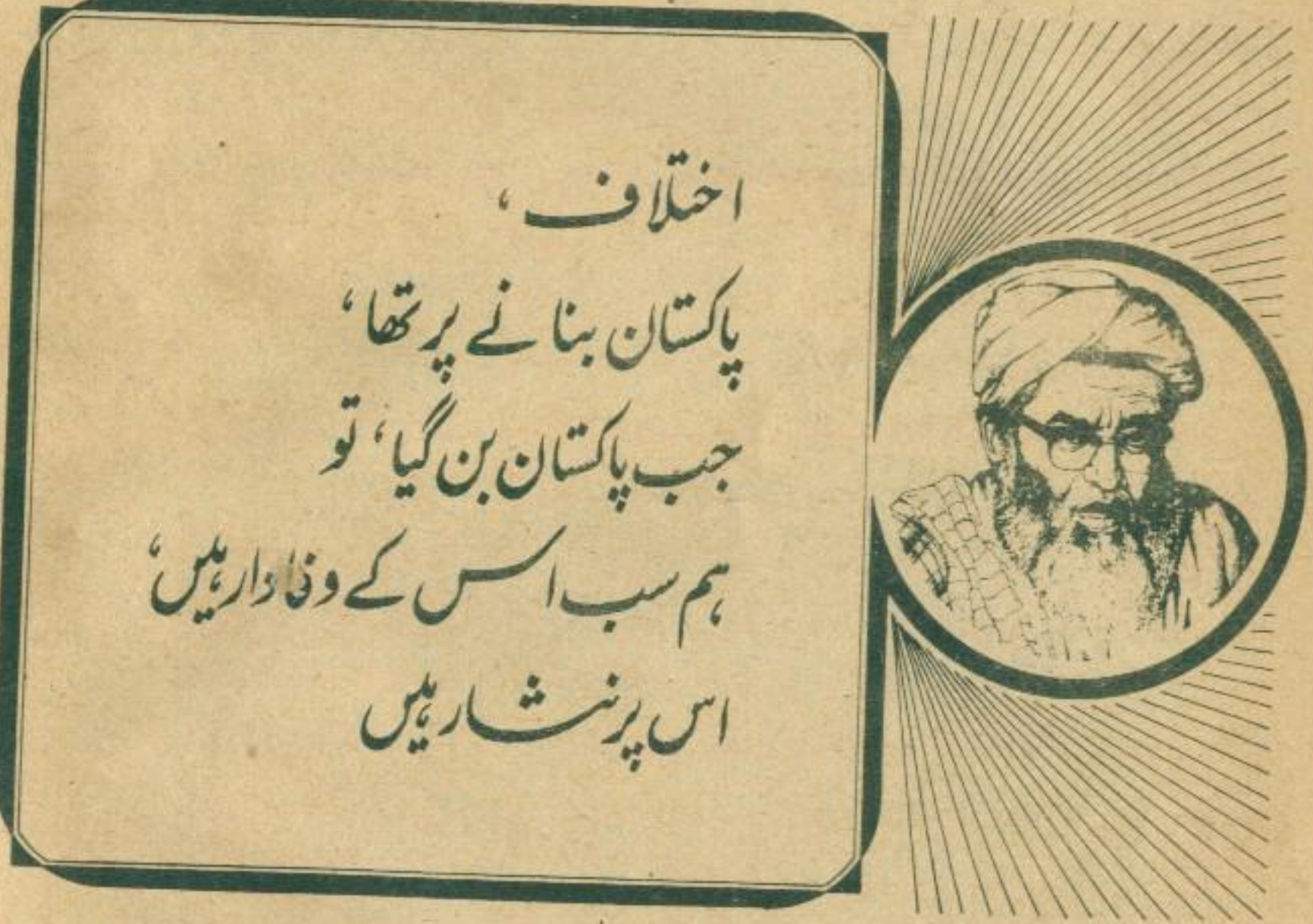

میں ۲ مئی کی شب کو نو بجے پشاور کے سرکٹ ہاؤس میں داخل ہُوا تو صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ مولانا مفتی محمود دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ دسترخوان پر بیٹھنے کو میں نے محاورۃً استعمال نہیں کیا، بلکہ اس سے حقیقتِ حال کا اظہار مقصود ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے ایک کمرے کے فرش پر بچھے ہُوئے دسترخوان نے اُسے ڈائننگ روم بنا دیا تھا اور کھانے کا اہتمام یُوں تھا کہ نہ تو چوب داروں کا ہجوم تھا اور نہ باوردی بیروں اور خانساماؤں کی بھاگ دوڑ۔ جمعیت کے کچھ کارکن میزبان بنے ہُوئے تھے۔ اس ڈنر پر نہ تو صوبے کا کوئی صنعت کار مدعو تھا اور نہ کوئی دوسرا "صاحبِ فن"۔ لے دے کے ایک مولانا عبدالحکم ایم این اے تھے جو اپنے ٹخنوں تک کُرتے اور طویل حدود اربعہ کی بدولت لاکھوں میں ایک ہیں اور دُور سے پہچانے جا سکتے ہیں۔

www.tezpakistan.com

کھانے سے فراغت کے بعد جب مولانا نمازِ عشاء ادا کر چکے تو میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ شب خوابی کے اس کمرے میں چٹائی کی جائے نماز، دو کرسیاں اور ایک صوفہ سیٹ پڑا ہوا تھا جو غالباً اب اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ چکا ہے ۔۔۔ اس کمرے میں مجھے پاکستان کے اس انتہائی اہم صوبے کے غیر متوقع وزیرِ اعلیٰ سے ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ غیر متوقع اس لیے کہ مفتی صاحب نے جب تک حلف نہیں اٹھایا اس وقت تک بہت سے لوگوں کو یہ یقین نہ آتا تھا کہ مولانا وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے کسی صوبے کے انتظامی سربراہ بھی ہو سکتے ہیں۔ انگریزی کی مسلسل غلامی اور اس غلامی کی یادگاروں پر فخر کے اندوہناک احساس نے ہماری رُوح سے آزادی کی وہ رمق بھی سلب کر لی ہے جو اپنی قومی زبان پر سربلندی کے احساس کو جلا بخشتی ہے۔ کچھ لوگوں کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ مولانا مفتی محمود جنہیں انگریزی نہیں آتی صوبائی وزیرِ اعلیٰ کے منصب کے لائق نہیں ہو سکتے۔ گویا ان لوگوں کے لیے انگریزی کا جاننا ایک اچھے ناظم کی بنیادی شرط تھی اور غالباً وہ تمام ملک نظم و نسق سے عاری ہیں جو انگریزی سے قطعی نابلد ہونے کے باوجود آج دنیا کی عظیم طاقتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

مولانا مفتی محمود دوسروں کی طرح میرے لیے بھی اجنبی نہیں ہیں۔ انہیں ہم نے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک قومی اسمبلی کے رُکن کی حیثیت سے دیکھا، پھر وہ ملکی سیاست میں ایک بے حد اہم شخصیت بن کر اُبھرے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کو شکست دے کر فاتح بھٹو کہلائے۔ ان کی فہم و فراست نے نہ صرف انہیں درجہ اوّل کے سیاست دانوں کی صف میں لا کھڑا کیا، بلکہ ان کی ذات ہی تھی جس نے جمعیت علمائے اسلام کو ایک انتہائی فعّال سیاسی تنظیم اور مُلک کی اہم جماعت بنا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے بعد مغربی پاکستان میں سب سے زیادہ ووٹ جمعیت علمائے اسلام نے حاصل کیے۔ ۱۹۶۲ء سے پہلے بھی مفتی محمود صاحب اپنا منفرد مقام رکھتے تھے۔

مولانا اپنے ابتدائی حالاتِ زندگی یُوں بیان کرتے ہیں: "میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے ایک چھوٹے سے گاؤں پنیالہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم میں نے اپنے گاؤں ہی کے ہائی اسکول میں پائی جہاں میں ہر جماعت میں اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کرتا رہا۔ میرے والد نامور مذہبی عالم، شیخ طریقت اور چاروں سلسلوں میں مجاز تھے۔ گاؤں میں ہمارا ایک کچا مکان تھا جو آج بھی ہے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا جو اس وقت چھوٹے بھائی مولانا محمد ذیردی کے سپرد ہے۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں ہندوستان چلا گیا جہاں دیوبند، سہارن پُور اور مراد آباد کے مدارس میں میں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ زمانہ طالب علمی میں مجھے مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا سید فخر الدین ایسے بزرگوں کا شرف نیاز حاصل رہا (مولانا سید فخر الدینؒ حال ہی میں وفات پا چکے ہیں) اور یہی وہ لوگ تھے جن سے میں متاثر ہوا، میری سیاسی تربیت اور میرا سیاسی شعور انہی بزرگوں کا مرہونِ منت ہے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں میں نے طالب علم کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب پورے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بائیکاٹ کی مہم چلائی گئی تو ہم نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ میں اس وقت جمعیت علمائے ہند کی آل انڈیا کونسل کا رُکن اور سرحد کی جمعیت علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا۔

مفتی صاحب اب اس مقام پر آ گئے تھے جو ان کی جماعت کا کمزور پہلو شمار ہوتا ہے۔ یہ وہی دَور ہے جس دَور میں جمعیت پر پاکستان کی مخالفت کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس مرحلہ پر جب میں مولانا سے اس کا ذکر کروں گا تو وہ سختی کے ساتھ اس کی تردید کریں گے، لیکن خلافِ توقع مفتی صاحب کا جواب میرے اندازوں کے قطعی برعکس تھا۔ انہوں نے فرمایا:

"ہم تقسیم ہند کے حامی نہیں تھے، تاہم جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقسیم ہند کی مخالفت کرنے والوں کا پاکستان کے بنانے میں کوئی حصّہ نہیں ہے، میں سمجھتا ہُوں کہ یہ بالکل درست بات نہیں، اس لیے کہ پاکستان جنگِ آزادی کی کامیابی کا نتیجہ تھا اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے آزادی کی جنگ لڑ کر ایک آزاد مُلک کی حیثیت سے قیامِ پاکستان کا راستہ ہموار کیا۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں ہماری ایک مستقل رائے تھی۔ جمعیت علمائے ہند کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان پُورا ایک رہے جب کہ اس کے تمام صوبوں کو مکمل خود مختاری حاصل رہے، مرکز کے پاس صرف دفاع، کرنسی اور امورِ خارجہ کے محکمے رہیں جبکہ بقیہ تمام امُور میں سب صوبے مکمل خود مختاری کے حامل ہوں۔ اس وقت ہندوستان کے تیرہ صوبے تھے۔ ان میں سے چھ صوبوں میں مسلمان اور سات صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس طرح پُورے بنگال، پُورے

www.tezpakistan.com

آسام، متحدہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں مسلمان حکومتیں بنیں گی اور ان صوبوں میں کم از کم مسلمان بالکل محفوظ ہوں گے۔

مرکزی حکومت سے متعلق بھی جمعیت علمائے ہند کا ایک فارمولا تھا جس کے مطابق ہمارا مطالبہ تھا کہ مرکزی حکومت میں ہندو اور مسلمانوں کو دو بڑی اکثریتیں تسلیم کیا جائے اور ان دونوں کو ۴۵، ۴۵ فیصد نمائندگی دی جائے جبکہ بقیہ دس فیصد نمائندگی دوسری اقلیتوں کو حاصل ہو۔ اس طرح ہم سمجھتے تھے کہ ہندو کی عددی اکثریت بھی قابو میں آجائے گی اور مرکز میں بھی مسلمانوں کے حقوق غصب ہونے کے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ کانگریس نے جمعیت علمائے ہند کے اس فارمولے کو تسلیم کر لیا تھا۔ ہم متحدہ ہندوستان میں صوبائی خود مختاری کے ساتھ رہنے کے لیے اس لیے بھی حامی تھے کہ اس طرح ہم غیر ملکی طاقتوں کی سازشوں سے محفوظ رہ سکتے تھے، بہرحال یہ دیانت داری کے ساتھ ایک رائے کا اختلاف تھا اور جب مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا تو ہم نے بھی خوشی کے ساتھ اسے تسلیم کر لیا اور ۱۹۴۷ء میں ہم نے حکومتِ پاکستان کو یہ یقین دلا دیا کہ پاکستان کی ترقی اور اس میں اسلامی نظام کی ترویج کے لیے ہم غیر مشروط طور پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔

اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی کا واضح ارشاد تھا: ہم میں پاکستان بنانے پر اختلافِ رائے تھا۔ جب پاکستان نہیں تھا تو پاکستان بنانے یا نہ بنانے کا اختلاف، رائے کا اختلاف تھا۔ اب جب پاکستان بن گیا ہے تو ہم سب پاکستان کے وفادار ہیں اور مل جل کر اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔

مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد کا زمانہ جمعیت علمائے اسلام کے رہنماؤں کے لیے بہت سخت تھا۔ خاص طور پر صوبہ سرحد میں ان کے لیے رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں چوبیس گھنٹے ہماری سخت نگرانی کی جاتی تھی، حتیٰ کہ ہمارا چلنا پھرنا اور رہنا سہنا ہر کام نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ حکومت کی ان سختیوں کی وجہ سے جمعیت علمائے اسلام پورے سات سال تک منظم نہ ہو سکی۔ گو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ملتان میں علمائے کرام کا ایک اجلاس طلب کر کے جمعیت کی داغ بیل ڈال دی تھی، لیکن جماعت کا باقاعدہ کنونشن دو برس بعد ہو سکا۔ یہ کنونشن مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیرِ قیادت ۱۹۴۹ء میں طلب کیا گیا، لیکن جمعیت کی تنظیم ممکن نہ ہو سکی۔ اس کے بعد کے حالات بیان کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے بتایا:

"آخر دسمبر ۵۲ء میں ہم نے جمعیت کا ایک کنونشن ملتان میں طلب کیا جس میں سارے پاکستان سے علماءِ دین اکٹھے ہوئے۔ اس میں جمعیت کی از سرِ نو تنظیم کی گئی اور مولانا احمد علی لاہوریؒ جمعیت کے صدر اور مولانا احتشام الحق تھانوی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے لیکن اس کے محض دو ماہ بعد جب فروری ۵۳ء میں تحریک ختمِ نبوت شروع ہوئی تو جمعیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مجھے تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں ایک سال کی سزا ہوئی اور جب ہم لوگ جیلوں سے واپس آئے تو پوری جماعت مضمحل ہو چکی تھی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی تحریکِ ختمِ نبوت سے اختلاف کی بنا پر ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ آخر دو سال کی تگ و دو کے بعد جب ہم نے ۵۴ء میں خود کو دوبارہ منظم کیا تو مفتی محمد حسنؒ کو جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا۔ مفتی صاحب بیمار اور معذور تھے، اس لیے انہوں نے مفتی محمد شفیع صاحب کو قائم مقام صدر نامزد کر دیا، لیکن قیادت کی کمزوری کی وجہ سے ہم لوگ جو اب آگے بڑھ کر کام کرنا چاہتے تھے، ایسا نہ کر سکے، چنانچہ دو سال بعد اکتوبر ۵۶ء میں جب دوبارہ کنونشن ہوا تو مولانا احمد علیؒ لاہوری کو صدر منتخب کیا گیا اور مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی جنرل سیکرٹری منتخب کیے گئے۔ اس کنونشن میں ہم نے مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی اور مفتی محمد شفیع صاحب کو بھی شرکت کی دعوت دی، لیکن یہ دونوں حضرات شریک نہ ہوئے، تاہم اب ہماری یہ تنظیم ایک فعال جماعت بن چکی تھی۔ مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی کی پُرجوش سرگرمیوں کی بدولت مغربی پاکستان میں جمعیت کے دو ہزار مدرسے اور اتنی ہی شاخیں قائم ہوئیں۔

ہم نے ۵۸ء کے عام انتخابات میں جماعتی بنیادوں پر حصہ لینے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں کہ ملک میں جمہوریت کے خلاف پھر سازش ہوئی۔ اکتوبر ۵۸ء میں سکندر مرزا نے مارشل لاء لگایا اور ایوب خاں اقتدار پر قابض ہو گئے۔"

سیاسی جماعتوں پر پابندی کی وجہ سے ملک میں سیاسی سرگرمیاں ختم ہو گئیں اور یوں اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک جمعیت کے رہنما درس اور تدریس کے کاموں میں مصروف رہے۔ مولانا مفتی محمود جو ۱۹۵۱ء میں ملتان منتقل ہو چکے تھے۔ مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں شیخ الحدیث، صدر مدرس، ناظم تعلیمات اور مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی اثنا میں انہوں نے وفاق المدارس عربیہ کے نام سے ایک یونین بنائی۔ وہ یوم تاسیس سے لے کر آج تک اس وفاق کے جنرل سیکرٹری چلے آ رہے ہیں۔ مغربی پاکستان کے پونے دو سو مدرسے اس وفاق سے منسلک ہیں۔ ان مدرسوں

www.tezpakistan.com

"برِّصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں علمائے دین کا ہمیشہ سے یہی مقصود رہا ہے کہ اس سرزمین پر اسلام کا صحیح اور مکمل نظام قائم ہو۔ اس سلسلہ میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی علمی اور عملی خدمات اس جدوجُہد کے سنہری ابواب ہیں اور شہیدانِ بالاکوٹ نے اپنے خون کی قربانی دے کر ان ابواب کو مداومت بخش دی ہے۔

جس دن بھی پاکستان میں قرآن و سُنّت کا حقیقی نظام نافذ ہوگا، وہ برِصغیر میں داخل ہونے والے پہلے مجاہدین اسلام کی رُوح سے لے کر حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ، شہدائے بالاکوٹ اور شہدائے تحریکِ آزادی کی رُوحوں کیلیے مسرّت اور اطمینان کا دن ہوگا اور عالمِ بالا میں ان کی دُعائیں اہلِ پاکستان کا ساتھ دے رہی ہوں گی میری جماعت ماضی کی تاریخ کے اس تیرہ سو سالہ مشن کی تکمیل میں مصروف ہے۔"

○ مولانا مفتی محمودؒ کی نشری تقریر سے اقتباس ○

منجانب
شمسی کلاتھ اینڈ جنرل ملز لمیٹڈ

مینوفیکچررز / ایکسپورٹرز
کینوس، ٹینٹس، تارپولنگ، و فلٹر کلاتھ

ہیڈ آفس ۳۔ ادریس چیمبرس۔ تالپور روڈ۔ کراچی فیکٹری ۵۰/اے، سائٹ کراچی
کیبل: کینوس —— ٹیلیکس: ۲۴۴۴۶ زہرا پاک
ٹیلیفون: آفس: ۲۲۱۹۴۱ — ۲۳۸۰۸۱ فیکٹری: ۲۹۰۴۴۳-۴ — ۲۹۴۵۷۳

www.tezpakistan.com

کے امتحان کے لیے یہ وفاق یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

ایوب خاں نے سیاست دانوں کی زبان بندی کر کے اور عوام کا گلا گھونٹ کر اپنی آمریت قائم کرنے کی کوشش کی تھی، جبکہ ان کے جانشین یحییٰ خاں اور ان کے ساتھیوں نے سیاست دانوں کو آپس میں لڑا کر اپنی آمریت کو یوں دوام بخشنے کی کوشش کی کہ عوام از خود سیاسی جماعتوں سے دل برداشتہ ہو کر مستقل حاکموں کی حیثیت سے انہیں قبول کر لیں۔ یحییٰ خاں کو اُمید تھی کہ 'سیاست دانوں کو آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر انہیں کامیابی حاصل ہو جائے گی، لیکن ان انتخابات میں عوام نے جس شعور اور جس ہوش مندی کا ثبوت دیا اس نے پوری بساط اُلٹ کر رکھ دی۔

مفتی صاحب نے اس دور کا ذکر کرتے ہوئے بتایا: یحییٰ خاں نے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت جنوری ۷۰ء تا دسمبر ۷۰ء کو انتخابات کا سال قرار دیا۔ جمعیت علماءِ اسلام نے بھی دوسری جماعتوں کی طرح اپنی انتخابی مہم شروع کی — ہم نے باقاعدہ اپنا ایک منشور قوم کے سامنے پیش کیا۔ ہم صحیح معنیٰ میں اسلامی نظام لانا چاہتے تھے۔ ایسا نظام جو خلافتِ راشدہ کے عہد میں رائج تھا۔ ہم اسلام کو سرمایہ داری کا آلہ کار نہیں بلکہ اسے غریبوں اور مظلوموں کے تحفظ کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سرمایہ داری کی حفاظت نہیں کرتا، بلکہ غریبوں اور مظلوموں کی دستگیری کرتا ہے۔ بچپن ہی سے ہمارے ذہن کی تربیت مغربی سامراج دشمنی پر ہوئی تھی، اس لیے ہم طبعاً امریکہ، برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتوں کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ اس طرح انتخابات میں سرمایہ دار ہمارے خلاف رہے۔ انہوں نے بدترین استحصال کے ذریعے غریبوں کا خون چوسا تھا۔ ان لوگوں نے ہمارے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کیا۔ ان کے علاوہ ان لوگوں نے جو سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے یا امریکی سامراج کے آلہ کار بنے ہوئے تھے انہوں نے بھی ہماری سخت مخالفت کی۔ اسلام اور سوشلزم کا تقابل اسلام اور کفر کی شکل میں کیا۔ انہوں نے نہ صرف ہمیں بلکہ ہر اس جماعت کو کافر ٹھہرایا جو اس مُلک میں معاشی انصاف کا پرچم لے کر اُٹھی تھی۔ بہرحال ہم نے اس فتویٰ کفر کا بھی مقابلہ کیا۔

میں سمجھتا ہوں ان انتخابات میں قوم نے بحیثیتِ مجموعی ہمارے پروگرام کو سب سے زیادہ قبول کیا۔ سرحد میں سب سے زیادہ ووٹ قومی اسمبلی کے لیے جمعیت علماءِ اسلام کو ملے۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کے بعد سب سے زیادہ ووٹ ہمیں ملے۔ اسی طرح بلوچستان میں بھی سب سے زیادہ ووٹ ہم نے حاصل کیے۔ یہ اس صورت میں تھا کہ ہمارے پاس وسائل موجود نہ تھے۔ بیرونی طاقتیں ہمارے خلاف تھیں۔ علماء، مشائخ، پیروں اور سیاسی لیڈروں کو منظم کر کے ہمارے خلاف محاذ آرائی کی گئی تھی۔ سرمایہ داروں نے ہمارے خلاف ان جماعتوں کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے جو ان کے نزدیک 'اسلام پسند' تھیں۔ ہم نے جس غربت اور افلاس کے عالم میں الیکشن لڑا اس پر شاید ہی کوئی یقین کر سکے؛ تاہم میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہم نے ایک روپے سے ایک لاکھ روپے کا مقابلہ کیا۔

مفتی محمود ایک صوبائی وزیرِ اعلیٰ کے عہدے کی اہمیت اور اپنے فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے ذہن میں صوبوں اور مرکز کے درمیان باہمی تعاون کا ایک ایسا خاکہ موجود ہے جو ایک مضبوط مُلک اور قوم کی تعمیر کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں ایسی صورت حال ہو کہ مرکز میں اس پارٹی کو اقتدار حاصل ہو جو صوبہ میں حزبِ مخالف کی بنچوں پر بیٹھتی ہو تو مرکز سے صوبوں کے تعلقات کی واحد بنیاد باہمی اعتماد اور باہمی تعاون ہوا کرتی ہے۔ ہمیں ایک انتہائی پس ماندہ صوبہ ملا ہے۔ ہماری آمدنی کے بڑے بڑے وسائل بجلی اور معدنیات ہیں جن پر مرکز کا قبضہ ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ مرکزی حکومت ہمیں اپنے ترقیاتی منصوبوں پر عملدرآمد کے لیے فراخ دلی کے ساتھ سرمایہ مہیا کرے گی۔ مولانا نے بتایا کہ انہوں نے صدر بھٹو کو جب صوبہ سرحد کے ان علاقوں کی داستانیں سنائیں جہاں پینے کے پانی کے لیے بھی عوام کو ترسنا پڑتا ہے تو صدر بھٹو بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ صوبہ میں پینے کے پانی کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے جس قدر رقم کی بھی ضرورت ہو گی مرکزی حکومت فراہم کرے گی۔

مفتی محمود دریائے سندھ کے پانی پر بھی سرحد کا کچھ حق مانگتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آخر یہ دریا جب ہمارے علاقوں سے گزرتا ہے تو ہم اس کی نعمتوں سے کیوں محروم رہیں۔ ہم کاشت کاری کے لیے اس کا پانی استعمال میں لائیں گے۔ ہم اپنے صوبے کو ایک ایسا فلاحی خطہ بنا دینا چاہتے ہیں جہاں لوگوں کی عزتِ نفس محفوظ ہو، انہیں دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہ ہو، ان کے بچوں کو تعلیم اور طبی امداد مہیا ہو اور ان کے لیے روزگار کی ضمانت حاصل ہو۔ ان کاموں کے لیے ہمیں جہاں سرمایہ کی ضرورت ہے وہاں مکمل امن و امان اور قانون کی بالادستی کی بھی ضرورت

www.tezpakistan.com

ہے جسم [illegible]

اس وقت ساڑھے گیارہ بج چکے تھے میں نے مولانا سے اجازت چاہی میرا خیال تھا کہ اب مولانا آرام کریں گے کیونکہ وہ صبح چار بجے سے اس وقت تک بیحد مصروف رہے تھے لیکن اس وقت بھی ایک وفد مولانا سے ملاقات کا منتظر تھا۔ میں وہاں سے نکلا تو مولانا اس وفد سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

(روزنامہ حریت کراچی، ۱۵ مئی ۱۹۷۲ء)

ہمیں مزدوروں اور
کسانوں سے بے پناہ ہمدردی ہے
مگر — ہم کسی کو قانون ہاتھ میں
نہیں لینے دیں گے۔

جناب مولانا مفتی محمود صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کتنے کامیاب ہیں؟ کیا جمعیت صرف دکھاوے کے لیے ہے اور اصل میں تمام کام نیشنل عوامی پارٹی کر رہی ہے۔ کیا مولانا مفتی محمود صاحب سرحد کے عوام کے مسائل اور مشکلات سے بالکل بے خبر ہیں —— ان سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے مفتی صاحب سے ملاقات کی ٹھانی لیکن سرحد اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران ان کی مصروفیات کے پیش نظر مجھے اپنے اس ارادے کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کرنا پڑا جب تک کہ صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس ملتوی نہیں ہو گیا۔ ۲۹ جون کو بجٹ سیشن ہوا۔ میں یکم جولائی کی شام کو وزیر اعلیٰ صاحب کی رہائش گاہ تک پہنچ گیا۔ لان میں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری اور چند دوسرے مہمان تشریف فرما تھے —— سیکرٹری صاحب سے اپنا مدعا بیان کیا تو جواب ملا کہ وہ اس وقت چند وزراء کے ساتھ اہم امور پر تبادلہ خیال کر رہے ہیں اس لیے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں بھی دوسرے مہمانوں کی طرح لان میں انتظار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں مغرب کی اذان ہوئی اور باہر لان میں نماز کا انتظام ہونے لگا۔ اب مجھے سو فیصدی امید ہو گئی کہ مفتی صاحب ضرور باہر آئیں گے اور میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انٹرویو کا وقت مقرر کروں گا۔ چند ہی لمحوں بعد صوبائی وزیر اطلاعات محمد افضل خاں اور مولانا مفتی محمود صاحب نماز کے لیے دوسرے مہمانوں کے ہمراہ باہر آئے اور مفتی صاحب نے امامت کے فرائض انجام دیے۔ پچھلی صف میں وزیر اطلاعات اور دوسرے لوگ کھڑے تھے۔ مجھے بھی پہلی بار یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر ان ہی کی امامت میں نماز پڑھی۔ آج اس شعر کی عملی تصویر میرے سامنے تھی ؎ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نماز کے فوراً بعد مفتی صاحب کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔ دوسرے روز صبح ساڑھے آٹھ بجے کا وقت مقرر ہوا۔

اتوار کو صبح ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے فوٹو گرافر کے ہمراہ مہمان خانے پہنچ گیا لیکن ہمارے مقررہ وقت پر انجینئرنگ کالج کے طلباء کا ایک وفد مفتی

www.tezpakistan.com

صاحب کے کمرے میں چلا گیا' اس لیے مجھے نصف گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ اسی دوران وزیر اعلیٰ صاحب کے افسر تعلقات عامہ جو اکثر کوٹ پتلون میں نظر آتے تھے کھدر کی شلوار قمیص پہنے دکھائی دیے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے مفتی صاحب کے اس حکم پر فوری طور پر عمل شروع کر دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شلوار قمیص سرکاری لباس ہوگا۔ عامر صاحب سے باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ مفتی صاحب نے اندر بلوا بھیجا۔

میں نے پہلا سوال کیا کہ "آپ کی حکومت کو پورے دو ماہ ہو چکے ہیں اب تک عوام کے کون سے اہم مسائل آپ کے سامنے آئے ہیں اور انہیں حل کرنے کے لیے آپ کی حکومت نے کیا اقدامات کیے ہیں یا کر رہی ہے؟"

مفتی صاحب نے جواب دیا: "ان دو مہینوں میں عوام کے کئی مسائل سامنے آئے ہیں لیکن میری نظر میں سب سے اہم مسئلہ پانی کا ہے۔ صوبہ سرحد میں کئی اضلاع ایسے ہیں جہاں پینے کے پانی کی شدید قلت ہے۔ چونکہ پانی انسانی ضروریات کا اہم جزو ہے اس لیے ہماری حکومت اس مسئلہ کو باقی تمام مسائل پر اہمیت دے رہی ہے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ صوبہ سرحد میں کوئی علاقہ ایسا نہ رہ جائے جہاں پینے کے پانی کی قلت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آبپاشی کی اسکیموں کے لیے بجٹ میں قریباً پونے پانچ کروڑ کی رقم مخصوص کی ہے۔ ہم اس رقم میں مزید اضافہ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔

اب سرحد اسمبلی نے بجٹ کی منظوری دے دی۔ دراصل ہماری حکومت اب شروع ہوئی ہے اور اب سرحد کے عوام کی ترقی فلاح و بہبود کے لیے جتنے منصوبے بنائے گئے میں انہیں عملی جامہ پہنانے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کی جائے گی۔"

مولانا مفتی محمود صاحب سے پوچھا گیا کہ صوبہ سرحد میں امن و امان کا مسئلہ کن مراحل میں پہنچ چکا ہے مفتی صاحب نے اس سوال کا جواب نہایت پُراعتماد طریقے سے دیتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں امن و امان کی بگڑی ہوئی صورتِ حال پچھلی حکومتوں سے ورثہ میں ملی ہے' لیکن میں یہ بات نہایت اعتماد سے کہہ رہا ہوں کہ ہم نے دو ماہ میں اس مسئلہ پر پچاس فی صد قابو پا لیا ہے اور مزید حالات پر دو ماہ سے بھی کم مدت میں قابو پا لیا جائے گا۔ میں نے اسی سوال سے متعلق ضمنی سوال کیا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ امن و امان کی حالت خراب کرنے میں کچھ سیاسی عوامل کا ہاتھ ہوتا ہے؟

جواب ملا' یقیناً! مزدوروں اور کسانوں کو اُکسانے میں کچھ سیاسی ہاتھ کارفرما ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مزدوروں اور کسانوں کو استعمال کرتے ہیں۔

مفتی صاحب نے کہا جہاں تک مزدوروں اور کسانوں کا تعلق ہے' ان سے ہمیں بے پناہ ہمدردی ہے اور اگر ہم یہ فیصلہ کرنے بیٹھیں کہ کہاں ان کے حقوق غصب کیے جا رہے ہیں اور کون حقوق غصب کر رہا ہے' تو شاید ہمارا فیصلہ مزدوروں اور کسانوں کے حق میں ہوگا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم ان پر یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ انہیں یا کسی دوسرے شخص کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی۔ صوبے میں قانون کی بالادستی کو ہر حال میں قائم رکھا جائے گا۔

آپ نے کہا مزدوروں اور کسانوں کو چاہیے کہ وہ قانون کو ہاتھ میں لینے سے پہلے ان پیشہ ور لیڈروں کو پرکھیں جو اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے انہیں داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ پیشہ ور لیڈر نہ مزدور ہوتے ہیں' نہ کسانوں میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ پیشہ ور لیڈر چند سیاسی جماعتوں کے ایما پر مزدوروں اور کسانوں کو گھیراؤ جلاؤ کرنے کے لیے اُکساتے ہیں۔

آپ نے پچھلی حکومت کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ جب صوبہ سرحد کے گورنر حیات محمد خاں شیر پاؤ تھے' اس وقت ایک پیشہ ور مزدور کسان لیڈر کو جب جیل سے رہا کیا گیا تو سیدھا اسے گورنر ہاؤس لے جایا گیا' جہاں اس پیشہ ور لیڈر نے چند قاتلوں کی ایک فہرست پیش کی جنہیں بعد میں رہا کر دیا گیا۔

"کیا آپ کے خیال میں امن و امان بحال رکھنے کے لیے پولیس کی تعداد کافی ہے؟" میں نے نیا سوال کیا۔

"جی نہیں! یہی وجہ ہے کہ ہماری حکومت ایڈیشنل پولیس رکھنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔" یکایک مفتی صاحب کا خیال پولیس والوں کی ہڑتال کی دھمکی کی طرف چلا گیا۔ کہنے لگے "یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ پولیس والے جو قانون کے رکھوالے ہوتے ہیں' خود ہی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ہماری حکومت نے ان کی ایسوسی ایشن کو تسلیم کر لیا ہے' جس کے لیے ایک آئین بھی بنا دیا گیا ہے۔ اگر ایسوسی ایشن آئین کے مطابق کام کرے گی تو ٹھیک ہے' لیکن آئین کی حدود سے باہر اگر کوئی مطالبہ پیش کیا گیا تو حکومت اسے ہرگز تسلیم نہیں کرے گی

www.tezpakistan.com

— ہم نے الیکشن کو اس لیے منظور کیا ہے کہ مرکزی وزراء نے ان سے وعدہ کر لیا تھا جسے ہر حال میں پورا کرنا ضروری تھا۔"

مرکزی وزراء کے وعدوں کی بات آئی تو مَیں نے سوال کر ڈالا کہ صوبہ سرحد کی حکومت اور مرکز کے درمیان اب بھی کوئی اختلافات پلتے جاتے ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ کوئی صوبہ مرکز کے تعاون کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی طرح مرکز کو بھی صوبوں کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا صوبہ مرکز سے ہر ممکن تعاون کر رہا ہے، اس کے جواب میں مرکز بھی ہم سے پورا پورا تعاون کر رہا ہے لیکن مستقبل قریب میں ہو سکتا ہے کہ صوبائی خود مختاری اور تقسیمِ اختیارات کے مسئلوں پر مرکز اور صوبوں کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہو جائیں۔ جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں مرکز کی طرف سے ہر صوبے کو اس کا حق دیا جائے گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو صوبے اور مرکز کے درمیان کسی قسم کے اختلافات کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔

"کیا آپ صوبائی خود مختاری اور تقسیمِ اختیارات کی وضاحت فرمائیں گے"؟ مَیں نے پوچھا۔

مفتی صاحب نے چند لمحے توقف کیا، پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "ہم یہ بات بارہا کہہ چکے ہیں کہ صوبے خود مختار ہوں اور مرکز کے پاس صرف وہ محکمے ہوں، جو چاروں صوبوں میں مشترک ہوں۔ لیکن جن محکموں کا تعلق علیحدہ علیحدہ صوبوں سے ہو، وہ صوبہ کے دائرۂ اختیار میں ہونے چاہئیں۔ اسی طرح صوبوں کے ذرائع آمدن صوبوں کے حوالے کیے جانے چاہئیں، جس صوبہ میں جو چیز پیدا ہو، اسی کی ملکیت قرار دی جانی چاہیے۔

(ہفت روزہ پیمان کراچی، ۲۴ جولائی ۱۹۷۲ء)

مجھے سیاسی رہنماؤں سے ملنے اور ان کی تقاریر سننے کا لڑکپن سے شوق رہا ہے۔ سکول اور کالج کے دور میں بہاول پور میں شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہو جس میں مَیں نہ گیا ہوں۔ اس دوران متعدد بار مولانا مفتی محمود کی تقاریر بھی سُنیں، مگر ان سے ملاقات اور گفتگو کا شرف صرف ایک بار حاصل ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں بعض اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آ رہا تھا اور قومی اتحاد مرکز میں شریکِ اقتدار تھا۔ انہی دنوں قومی اتحاد کے رہنماؤں نے بہاول پور کا دورہ کیا۔ اس موقع پر جامع مسجد الصادق بہاولپور میں ۱۰ مارچ ۱۹۷۹ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا۔ یہ غالباً بہاولپور میں مولانا مفتی محمود کی آخری تشریف آوری تھی۔ اگرچہ ان کا قیام نہایت ہی مختصر تھا، تاہم انہوں نے کمال شفقت سے ملاقات کے لیے وقت مرحمت فرمایا اور میرے بعض سوالوں کے جواب دیے۔ ان سے گفتگو کے وقت میرے ذہن میں ایوب خاں کی قومی اسمبلی سے لے کر بھٹو سے مذاکرات کے آخری دور تک کے بہت سے واقعات ابھرنے لگے۔ مَیں اُس شخص کے سامنے بیٹھا تھا جس کا ہر قدم تاریخ کے ابواب کا عنوان تھا۔ یہ وہ بوریا نشین تھا جس کی للکار اقتدار کے ایوانوں میں لرزہ پیدا کر دیتی تھی۔ یہ وہ رہنما تھا جو قوم کے دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ یہ وہ مسجد کا مولوی تھا جس کے سامنے بہت بڑا آمر اپنے تمام تر ہتھکنڈوں کے باوجود بھی نہ ٹھہر سکا تھا۔

گفتگو کا آغاز قومی اتحاد کی اقتدار میں شمولیت سے ہوا۔ اس وقت صرف ایک سوال کا جواب نذرِ قارئین ہے۔ مَیں نے پوچھا: قومی اتحاد جمہوریت کا علمبردار ہے، مگر مارشل لا کے دوران اس کا شریکِ اقتدار ہونا کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ مولانا متبسم ہوئے اور فرمایا کہ وزارت میں ہماری شمولیت جمہوریت اور اسلام کے لیے ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر قومی اتحاد اپنے وزراء حکومت میں نہ بھیجتا، تو شاید اسلامی نظام کے نفاذ کا آغاز اس قدر جلدی نہ ہوتا، پھر ہمارے وزیر جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں ایک قابلِ اعتماد ضمانت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ایک انتہائی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، اس لیے اس کی بقا و سالمیت کی ضمانت بھی اسلام کو خوش دلی سے اپنانے ہی سے مل سکتی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ گزشتہ تیس سال کے عرصے میں ہم اسلام کے قریب ہونے کے بجائے دُور ہوتے چلے گئے ہیں۔ اگر اس پس منظر میں موجودہ اقدامات کا جائزہ لیا جائے، تو یہ اطمینان کا باعث بنتے ہیں، تاہم مَیں بیوروکریسی کی طرف سے قطعی مطمئن نہیں ہوں۔ بعض افسر قدم قدم پر مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری بہر حال دلی آرزو یہ ہے کہ پاکستان حقیقی معنوں میں ایک اسلامی اور فلاحی مملکت بن جائے۔

سعید احمد، روزنامہ سیادت، بہاولپور

www.tezpakistan.com

بسوئے عالمِ پائیدار

www.tezpakistan.com

آخری آرام گاہ

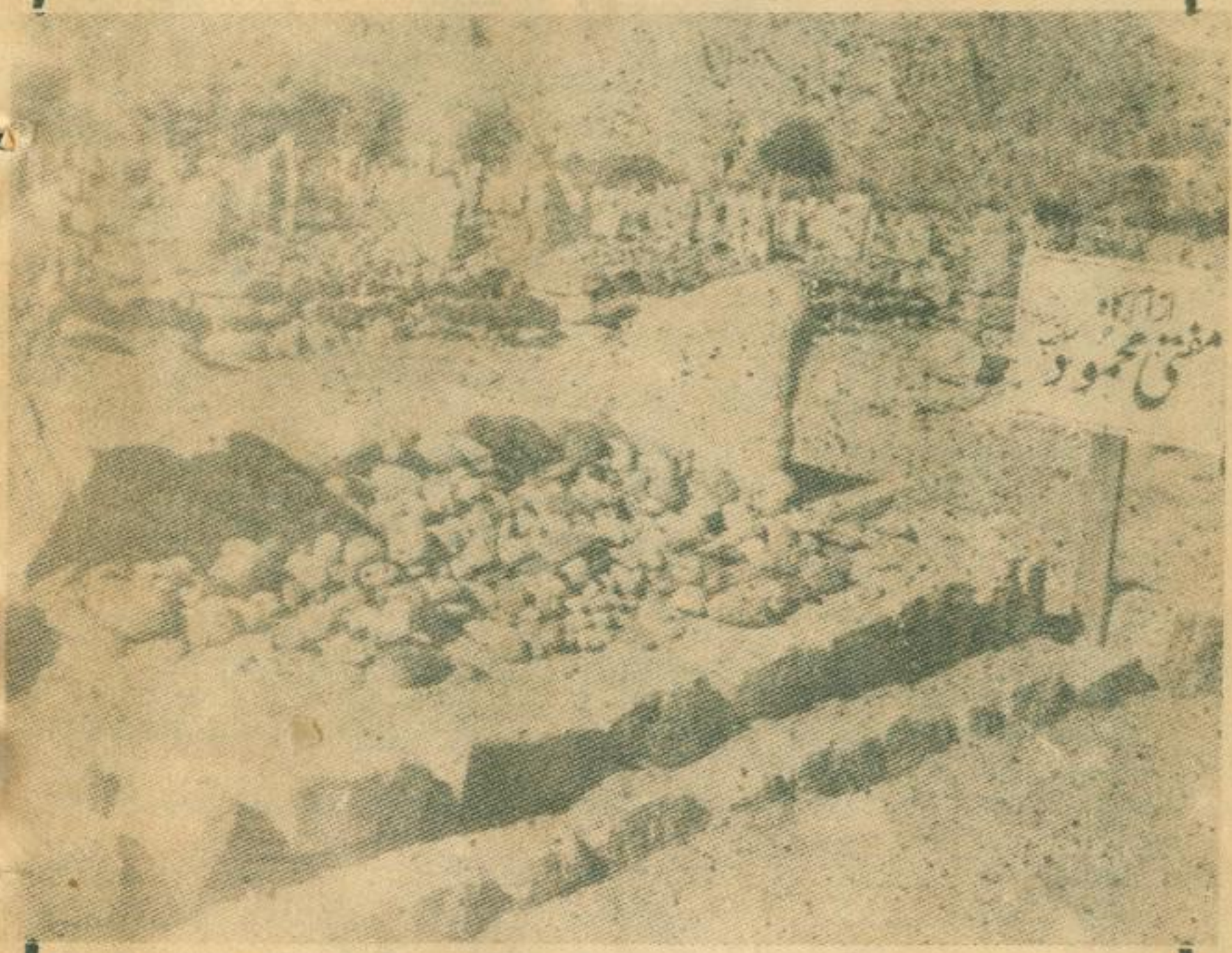

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمّت ہے لحد تیری

www.tezpakistan.com

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ملک شوکت حسن (ڈائریکٹر آف سرجری)

مَیں نے اُن کے انگوٹھے کا آپریشن کیا — وہ دوسرے مریضوں کی نسبت کہیں سادہ اور بردبار تھے۔

مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں۔ شاید ۸۰ء کے دنوں کی بات ہے مفتی محمود صاحب نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ سرکاری یا حکومت کی وساطت سے مجھ تک نہیں پہنچے تھے بلکہ میری شہرت سُن کر از خود اپنے علاج کے لیے آئے تھے۔ مَیں ان دنوں CMH پنڈی میں ہوتا تھا۔ وہ تقریباً اسّی دن یہاں زیرِ علاج رہے۔ مُلک کی ایک اہم سیاسی شخصیت تھے اس لیے ہم نے VIP کی طرح ان کی دیکھ بھال کی اور علاج معالجے پر جتنا خرچ بھی اُٹھا وہ حکومت نے برداشت کیا۔

مفتی صاحب کے ایک پاؤں کے انگوٹھے سے پیپ رِستی رہتی تھی۔ CMH پنڈی آنے سے پہلے وہ کراچی میں علاج کراتے رہے تھے۔ ڈاکٹر بیرونی طور پر دوائیں لگا کر اور مفتی صاحب کو انٹی بائیوٹک استعمال کرا کر زخم کا علاج کرتے۔ اس سے وقتی طور پر انہیں کچھ آرام آجاتا لیکن چونکہ تکلیف اور فساد کی اصل جڑ اپنی جگہ بدستور موجود رہتی اس لیے کچھ عرصے بعد ان کی تکلیف دوبارہ عود کر آتی۔

ہم نے CMH میں مفتی صاحب کے ایکسرے لیے اور خون پیشاب کے ٹسٹ لیے تو انکشاف ہُوا انہیں شوگر کے علاوہ بلڈ پریشر اور شریانوں میں کیلشیم کی تکلیف بھی ہے۔ ایک چیز ہوتی ہے کولیسٹرول۔ چربی، شاید آپ نے اس کا نام کبھی سُنا ہو۔ یہ خون کی نالیوں میں زیادہ عرصے تک موجود رہے تو پھر کیلشیم آتی ہے، اور یہ تکلیف یا شکایت جسم کے مختلف حصّوں میں ہو سکتی ہے۔ مثلاً ٹانگوں میں، دل میں یا دماغ میں۔ یہ ایک ایسا مرض ہے کہ ڈاکٹر اسے دواؤں کے ذریعے کنٹرول تو کر سکتے ہیں، لیکن ایک بار اگر یہ صورت پیدا ہو جائے تو پھر اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس کے برعکس اس کی زیادتی اور بڑھنے کے احتمالات زیادہ ہوتے ہیں۔

میرا کام بحیثیت سرجن مفتی صاحب کے انگوٹھے کے زخم کا علاج کرنا تھا۔ باقی امراض اور تکالیف کی دیکھ بھال اور علاج فزیشن کی ذمّہ داری تھی، لیکن ہم لوگ یعنی سرجن اور فزیشن دونوں مِل کر سوچتے، کیونکہ آپریشن بہرحال ٹوٹل علاج کا ایک جزو تھا۔ ایکسرے اور لیبارٹری رپورٹوں کی روشنی میں مَیں نے مفتی صاحب کے انگوٹھے کے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ مجھے پیر کا بڑھا ہوا حصّہ کاٹنا تھا۔ شوگر کے مرض کی ایک پیچیدہ صورت تھی۔ اس مرض میں یوں ہوتا ہے کہ اگر ٹھیک کر باقاعدگی سے علاج نہ کرایا جائے اور مریض کو مناسب آرام اور سکون میسّر نہ ہو تو اعصاب اور ریشے سُن ہو کر آہستہ آہستہ بالکل مُردہ ہو جاتے ہیں اور متاثرہ حصّے میں زندگی کا احساس ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ مفتی صاحب کے انگوٹھے کے زخم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ شوگر کی وجہ

www.tezpakistan.com

سے ان کے انگوٹھے کی مردہ اعصاب اور ریشوں کا ایک لچھا سا بن گیا تھا اور اس سے پیپ بہتی رہتی تھی۔ طبی اصطلاح میں ہم اسے سلف کہتے ہیں۔ مَیں نے زخم کھول کر اس سلف کو کاٹ کر نکال دیا اور صحت مند ریشے اور اعصاب باقی رہنے دیے۔

مفتی صاحب کے پَیر کا آپریشن تھا' اس لیے یہ کوئی خطرناک آپریشن نہیں تھا۔ آپریشن کو چھوٹا یا بڑا کے خانوں میں تقسیم کرنا دُرست نہیں۔ آپریشن چھوٹا ہو یا بڑا، سرجن کو بہرحال پُوری توجہ اور دھیان سے کرنا پڑتا ہے۔ مجھے مفتی صاحب کے انگوٹھے کے آپریشن میں تقریباً آدھ گھنٹہ لگا۔

آپریشن کامیاب رہا۔ زخم تیزی سے مندمل ہونے لگا اور ان کا پَیر بڑی حد تک ٹھیک ہو گیا۔ اس دوران باقی امراض کا علاج بھی ہوتا رہا۔ کچھ دواؤں سے کچھ ڈائٹ (خوراک) کنٹرول سے۔ مختلف سیاسی لیڈر جو اِن کی مُلاقات یا عیادت کو آتے پھلوں کے بڑے بڑے ٹوکرے لاتے۔ مٹھائیاں لانے پر ہم نے بہرحال سختی سے پابندی عاید کر رکھی تھی کہ شوگر کی وجہ سے ان کا استعمال مفتی صاحب کے لیے منع تھا۔

مَیں تقریباً چالیس سال سے طِب کے پیشے سے منسلک ہُوں۔ اس دوران سینکڑوں مریضوں کا علاج کیا۔ کئی آئے' کئی گئے۔ مفتی صاحب بھی میرے ایک مریض تھے۔ مَیں نے اپنے دوسرے مریضوں کی نسبت انہیں کہیں زیادہ سادہ' بُردبار اور متحمل مزاج پایا۔ انہیں اپنے آپ پر حیرت انگیز کنٹرول تھا۔ جب تک ہسپتال میں رہے' انہوں نے مجھے یا میرے دوسرے ڈاکٹر ساتھیوں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا، بلکہ علاج معالجے کے سلسلے میں ہر مرحلے پر ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ خاصی مضبُوط قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ گوناگوں امراض اور پَیر کے انگوٹھے کی تکلیف کے باوجود ہمیشہ سرگرمِ عمل رہے۔ دن رات سیاست کی مشقت اور صعوبتیں برداشت کیں اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ میرا خیال ہے اگر وہ آرام اور سکون کی زندگی بسر کرتے' تو شاید نسبتاً لمبی عمر پاتے۔

✺

مفتی صاحب نرے "خُشک مولوی" نہیں تھے' بلکہ ان میں مزاح کی حِس بھی بڑی تھی۔ اکثر خوشگوار اور دِلچسپ فقروں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ لگ بھگ اسّی دن میرے زیرِ علاج رہے۔ چالیس دن ہُوئے' تو ہنس کر کہنے لگے: مَیں نے چلّا کاٹ لیا۔ جب اسّی دِن پُورے ہُوئے' تو مَیں نے کہا مفتی صاحب! آپ نے دو چلّے کاٹنے تھے' سو وہ آپ نے کاٹ لیے' اب آپ کو ہسپتال سے چُھٹی۔

میرے اسسٹنٹ بھی اتفاق سے بارلیش صاحب تھے۔ ایک دن مفتی صاحب اور ان کے درمیان بحث چل نکلی کہ جنت میں داخل ہونے والے مَردوں کے لیے ڈاڑھی کا ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ جنت میں جانے کے لیے ڈاڑھی کا ہونا ضروری ہے۔ میرے اسسٹنٹ کی رائے اس کے برعکس تھی۔ مفتی صاحب نے اسے قائل کرنے کے لیے اپنا پُورا زورِ بیان صَرف کیا اور آخرِ کار اُسے قائل کر کے چھوڑا کہ واقعی جنت میں جانے کے لیے ڈاڑھی کا ہونا ضروری ہے۔

✺

ان کی ایک اور بات جو مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے' وہ ان کا ایک تحفہ ہے جو انہوں نے ہسپتال سے جانے سے ایک آدھ دن پہلے مجھے دیا تھا۔ یہ ایک کتاب تھی..... "موت کا منظر مع مرنے کے بعد کیا ہوگا؟"۔ اس کے عنوان پر نظر پڑی اور کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا' تو مَیں نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا اور کہا: مفتی صاحب' کیوں ڈراتے ہیں، ابھی تو مَیں صرف زندگی ہی کے بارے میں سوچ رہا ہُوں۔ مفتی صاحب نے متبسم ہو کر آہستہ سے گردن ہلائی' مگر مُنہ سے کچھ نہ بولے۔

مفتی صاحب' ہسپتال سے رخصت ہُوئے' تو ان کی صحت بدرجہا بہتر تھی۔ بلڈ پریشر اور شوگر کو کنٹرول کر لیا گیا تھا۔ انگوٹھے کا زخم بھی ٹھیک ہو چلا تھا۔ ہسپتال سے جانے کے بعد پھر ان سے کبھی مُلاقات نہیں ہُوئی۔ رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے کہا تو تھا کہ چیک اَپ کے لیے وقتاً فوقتاً آتا رہوں گا' لیکن حالات نے انہیں پھر کبھی لَوٹ کر CMH آنے کی اجازت نہ دی یا شاید کبھی آئے ہوں' لیکن بہرحال مجھ سے مُلاقات نہیں ہُوئی۔

✺✺

www.tezpakistan.com

شیخ محمد حنیف (کراچی)

موت کے مہمان بننے سے عین پہلے وہ میرے مہمان تھے

کوئی پندرہ بیس برس قبل کی بات ہے چنیوٹ میں مجلسِ ختمِ نبوت کا سالانہ جلسہ مولانا منظور احمد چنیوٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ایک بھرپور شخصیت موجود تھی۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ مولانا مفتی محمود صاحب ہیں — اس جلسے کے دوران اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُن کی تقریر سادگی کا مُرقع تھی، لیکن اتنی مدلل کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد مجھے جس نے متاثر کیا وہ مفتی صاحب کی تقریر تھی۔

مفتی صاحب کی شخصیت ویسے تو ہمہ گیر تھی، لیکن سادگی اور درویشانہ رنگ اُن کی عظمت کی نمایاں علامات تھیں۔ دوسرے لفظوں میں اس مسلم مذہبی شخصیت اور حق پرست سیاستدان کی زندگی کا قلندرانہ رنگ ہر شخص کو اُن کی طرف کھینچتا تھا۔ ان کی خلوت اور جلوت میں کوئی فرق نہ تھا۔ تنہائی بھی وہی تھی جو اُن کی مجلسی زندگی میں تھی۔ دوسرے لفظوں میں ان کے ظاہر و باطن میں مکمل یکسانیت تھی، لیکن مَیں جس رنگ سے متاثر تھا وہ ان کی شخصیت کا یہ پہلو تھا کہ وہ آج کے تنگ نظر مولویوں اور مُلّاؤں سے یکسر مختلف تھے۔ وہ وسیع النظر اور تعصّب کے مرض سے بالا تھے۔ علاوہ ازیں مرنجاں مرنج بھی تھے۔ ان کی محفل میں کبھی گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی خشک مزاج کٹّر مولوی کی محفل میں ہیں۔

وہ سیاست کو دین کا جزو سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا خصوصاً دین کے اندر رہ کر سیاست کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے ان سیاسی احوال سے کبھی مفاہمت نہیں کی جو مذہب کے منافی ہوں یا مذہب اور دین کے لیے تحقیر کا سبب بنیں۔ وہ بہرحال دین کو اوّلیت دیتے تھے اور اگر سیاست کو اس سے باہر نکالنے کی کوشش ہوتی، تو وہ چٹان کی طرح اپنے موقف پر ڈٹ جاتے اور کسی دباؤ کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے ہر قوّت سے ٹکرا جاتے تھے۔ انہوں نے سیاست کو کاروبار کبھی نہیں بنایا نہ اس سے منفعت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

عبدالخیل (مفتی صاحب کا آبائی گاؤں) میں حضرت مفتی صاحب کا آبائی مکان آج بھی اسی طرح کچّا ہے جس طرح انہیں ورثے میں ملا تھا۔ مفتی محمود مرحوم بلاشبہہ خارزارِ سیاست میں طویل عرصہ رہے، لیکن عوام کی خدمت بے لوث کرتے رہے۔ انہوں نے پارلیمنٹ کی رکنیت اور صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ کے دوران کبھی کوئی مفادات حاصل کرنے کا خیال تک نہیں کیا۔

مفتی صاحب مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مہتمم بھی تھے۔ انہیں مدرسے سے خدمات کا معاوضہ چودہ سَو روپے ماہوار ملتا تھا۔ اسی سے

www.tezpakistan.com

گزرا وقات کرتے تھے۔ جب رکنِ پارلیمنٹ منتخب ہو جاتے، تو مدرسے سے تنخواہ لینا بند کر دیتے تھے۔ ایک بار مدرسے کی انتظامیہ نے ان کی تنخواہ بڑھانے کا ارادہ کیا، تو مفتی صاحب نے ناظمِ مدرسہ مولانا محمد یٰسین سے سوال کیا کہ آیا مدرسہ اخراجات کے سلسلے میں خود کفیل ہو چکا ہے؟ نفی میں جواب ملنے پر مفتی صاحب مرحوم نے تنخواہ میں اضافے کی تجویز مسترد کر دی۔ آخری لمحات تک اُن کی تنخواہ وہی چودہ سَو روپے ماہوار تھی۔

بڑے خوش طبع اور بذلہ سنج تھے۔ کبھی کبھی تو گھنٹوں محفل کشتِ زعفران بنی رہتی۔ ایک روز مَیں نے سوال کیا مفتی صاحب، آپ لوگ تو جنّت میں چلے جائیں گے، کیونکہ دین کی خدمت اور اعمالِ صالحہ آپ کا شعار ہے، لیکن ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟ مسکراتے ہوئے کہا، اگر اعمال کے حساب کتاب پر بخشش کا دارومدار سمجھا جائے، تو کوئی بھی اپنے بخشے جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ مَیں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ جنّت میں جاؤں گا۔ ہاں جب بھی بخشے گا، تو وہ اپنے غفور الرحیم ہونے کے ناطے بخشے گا، چنانچہ ہمارے لیے اوّلین امر یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اوامرِ الٰہی کی اطاعت کریں اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوں۔ ایک بار ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد اپنی نظر بندی کا ایک واقعہ سُنایا کہ مَیں ذیابیطس کا مریض ہوں اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ذیابیطس کا مریض اکثر ذہنی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ سہالہ میں نظر بندی کے دوران بھٹو مرحوم نے مجھ سے پوچھا کہ مفتی صاحب آپ بتائیں کہ آپ کو کیا پریشانی ہے؟ اس کے جواب میں مَیں نے انہیں کہا کہ میری سب سے بڑی پریشانی آپ ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے اور کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟ غرض ایسے دل چسپ واقعات ہیں جن کے لیے طویل وقت اور ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

اگرچہ ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ سفر میں گزرا، لیکن وہ ہر حال میں گھر سے رابطہ رکھتے تھے۔ تمام مصروفیات کے باوجود انہوں نے اپنے بچّوں کی تربیت اپنے ہاتھوں سے کی ہے اور آج بفضلہٖ تعالیٰ اُن کی اولاد اُن کی خواہشات کے مطابق دین کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ جب کبھی وہ گھر سے باہر ہوں، اُن کا رابطہ بدستور گھر کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ مَیں نے انہیں ایک شفیق باپ اور گھر کا ذمّہ دار کفیل اور سرپرست پایا۔

جس روز انتقال ہُوا ہے، اُس سے پہلی رات پیر صاحب پگاڑا کے ہاں گئے تھے۔ رات سوا دس بجے لوٹے اور گیارہ بجے تک مفتی صاحب میرے اور بچّوں کے ہمراہ رہے، ہمیں نصیحتیں کرتے رہے۔ سونے کے لیے اٹھنے سے قبل مجھے کہا کہ کل صبح دلی خان مزاری اور عابد زبیری آئیں گے، ان سے بات کرنی ہے، چنانچہ کل مَیں فجر کی نماز کے بعد آرام نہیں کروں گا، دراصل مفتی محمود صبح تہجّد کے لیے اُٹھتے تھے۔ پھر فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر آرام کرتے تھے، لیکن وفات کے دن وہ جاگتے رہے۔ اس دوران مَیں ان کے پاس گیا، تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، بھئی حنیف میرے غسل کا اہتمام کرو۔ مولانا کے حکم پر مَیں حیران ہُوا، کیونکہ اُن کے کمرے کے ساتھ باتھ رُوم تھا جس میں ٹھنڈے اور گرم پانی کا انتظام تھا، پھر انہوں نے مجھ سے یہ بات کیوں کہی۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مسکرائے اور کہا: "چلو چھوڑو بھئی، تم میری بات نہیں سمجھو گے۔" اس کے بعد اہتمام سے غسل کیا اور کپڑے بدلے، حالانکہ وہ عام طور پر جمعہ کے روز کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ خوشبو لگائی اور تیار ہو گئے۔ اسی دوران قاری شیر افضل ان سے ملنے آ گئے۔ اُن کے بعد دلی خان مزاری اور عابد زبیری سے بھی ملاقات کی اور پروگرام کے مطابق بنوری ٹاؤن جامع مسجد کے لیے روانہ ہو گئے جہاں انہیں ایک گفتگو میں شرکت کرنی تھی جو زکوٰۃ کے مسئلے پر ہونے والی تھی۔ جاتے وقت چھڑی ساتھ نہیں لی جو وہ ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، چنانچہ میرے بیٹے نے چھڑی یاد دلائی۔ اس پر "اسے یہیں رکھیں، اب اس کی ضرورت نہیں رہی" کہا اور اجلاس میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دو بجے اُن کو ساتھ لیتا آؤں۔ اس کے بعد مَیں دفتر پہنچا۔ ایک بج کر پانچ منٹ پر بنوری ٹاؤن کی جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے مہتمم مولانا مفتی احمد الرحمان کا ٹیلی فون آ گیا کہ مفتی صاحب داغِ مفارقت دے گئے ہیں۔ مَیں غم و اندوہ میں ڈوب گیا اور پھر اُن واقعات کو یاد کرنے لگا جو صبح سے پیش آئے تھے۔ مَیں سمجھ گیا کہ مولانا نے صبح ہی سے سفرِ آخرت کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

www.tezpakistan.com

مولانا محمد یوسف (مدیر بینات، کراچی)

وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے خالقِ حقیقی سے ملنے روانہ ہو گئے۔

حق تعالیٰ شانہٗ کے لُطف و کرم اور اس کی قدرتِ کاملہ کا تماشا دیکھو کہ تھانہ بھون کے ایک شیخ زادے کو اُٹھاتے ہیں اور اسے عرب و عجم کا شیخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بنا دیتے ہیں۔ گنگوہ کے ایک انصاری خاندان کے ایک فرد پر نظرِ عنایت ہوتی ہے، اسے قطبیتِ کبریٰ کے مقام پر فائز کر کے امامِ ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی بنا دیا جاتا ہے۔ کشمیر کی سنگلاخ زمین سے ایک گمنام خاندان کے ایک فرد کو لایا جاتا ہے اور علومِ نبوت کا پُورا کُتب خانہ اس کے سینے میں انڈیل کر اسے امام العصر مولانا محمد انور شاہ بنا دیا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایک گاؤں سے ایک نومسلم کو لاتے ہیں اور اسے ولایتِ کبریٰ اور مقامِ صدیقیت پر فائز کر کے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری بنا دیتے ہیں۔ اور ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک غیر معروف قصبے سے ایک فرد کو کھینچتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے عالم، حافظ، قاری، فقیہ، مفتی، محدث، متکلم اور پھر وزیرِ اعلیٰ سے لے کر قائدِ حزبِ اختلاف تک بنا دیتے ہیں۔ اس صدی (اور گزشتہ صدیوں) کے اکابر کے ابتدائی حالات کا مشاہدہ کیجیے تو بظاہرِ اسباب کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نونہال کا سایہ ایک عالم پر محیط ہو گا۔ اس سے واضح ہے کہ مشیّتِ الٰہی حفظِ دین اور پاسبانیٔ ملّت کا انتظام ظاہری اسباب سے بالاتر کرتی ہے، اور لُطفِ الٰہی خود ایسے افراد انتخاب کرتا ہے جن سے دینِ قیم کی خدمت کا کام لیا جائے۔

حضرت اقدس مفتی محمود صاحبؒ، حرمین شریفین کے لیے عازمِ سفر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی علالت اور ضعف و ناتوانی کے علی الرغم چودھویں صدی کے آخری حج میں شرکت کریں۔ اور خانۂ کعبہ جا کر بارگاہِ ذوالجلال میں بصد عجز و نیاز یہ التجا کریں کہ پُوری صدی میں اُمّت سے جو کوتاہیاں، جو لغزشیں اور جو تقصیریں ہُوئی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنی رحمتِ بے پایاں اور اپنے محبوب رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اُمّت کے پُوری صدی کے گناہوں کو معاف کر دیں ـــ لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی مشیّتِ تکوین شاید یہ چاہتی تھی کہ مفتی محمود کے اُس حُسنِ اخلاص اور حُسنِ نیّت کی وجہ سے اس صدی کا خاتمہ ہی "محمود" پر کر دیا جائے۔ ؏ الٰہی عاقبت "محمود" گرداں۔

اس لیے حرمین شریفین کے لیے پرواز سے ٹھیک ۲۳ گھنٹے پہلے ان کی بے تاب و بے چین رُوح اس صدی کے مُسلمانوں کی سفارش لے کر سیدھی بارگاہِ ذوالجلال میں پہنچ گئی۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً

www.tezpakistan.com

فَادْخُلِی فِی عِبَادِی وَادْخُلِی جَنَّتِی -

حضرت مفتی صاحبؒ ۱۱ اکتوبر، یکم ذوالحجہ کو بروز ہفتہ کراچی پہنچے۔ ۱۵ اکتوبر، ۵ ذوالحجہ کی پرواز میں ان کی نشست مخصوص ہو چکی تھی۔ دن کو بیشتر قیام یہاں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مہمان خانہ میں رہتا تھا اور رات کو اپنے مخلص دوست جناب حاجی محمد حنیف صاحب کے یہاں پی، ای، سی، ایچ سوسائٹی تشریف لے جاتے تھے۔

۱۴ اکتوبر، ۴ ذوالحجہ کو بروز دوشنبہ صبح غسل فرمایا۔ اور مکان پر بعض سیاسی رفقاء سے ملاقات فرمائی۔ ۱۱ بجے کے قریب مدرسہ تشریف لائے۔ آج حضرت مفتی صاحبؒ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کے یاد فرمانے پر جناب مولانا محمد رفیع عثمانی، مہتمم دارالعلوم کراچی اور جناب مولانا محمد تقی عثمانی قانونِ زکوٰۃ کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے لیے تشریف لائے۔ قریباً ساڑھے بارہ بجے رفیقِ محترم جناب مولانا محمد جمیل خان صاحب راقم الحروف کو باصرار مفتی صاحبؒ کی خدمت میں لے گئے ___ اس ناکارہ کو ان حضرات کی تشریف آوری کا علم نہیں تھا، اور نہ موضوعِ گفتگو کے بارے میں کچھ خبر تھی ___ اس وقت مجلس میں یہ حضرات موجود تھے: جناب مولانا طاسین صاحب مجلس علمی کراچی، مولانا مفتی احمد الرحمٰن، مولانا محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، صاحبزادہ مولوی محمد بنوری اور مولانا محمد جمیل خان۔ تھوڑی دیر میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر بھی تشریف لے آئے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ نے بطورِ خاص یاد فرمایا تھا) کوئی پندرہ بیس منٹ تک لطفِ مزاج کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران چائے آئی تو صاحبزادہ مولانا محمد رفیع عثمانی اور صاحبزادہ مولانا محمد تقی عثمانی نے چائے سے معذرت کی اور ٹھنڈا مشروب نوش کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ گو میں خود چائے پیتا ہوں، مگر جو حضرات نہیں پیتے ان کو بہت اچھا سمجھتا ہوں۔ جناب مولانا محمد تقی صاحب نے پان کے بٹوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! ہمارے ساتھ یہ علت لگی ہوئی ہے، فرمایا یہ اس سے بھی بدتر ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے چائے کی پیالی نوش فرمائی تو مولانا محمد تقی صاحب نے پان پیش کیا، حضرت مفتی صاحبؒ نے قبول فرمایا۔ ادھر مولانا محمد طاسین صاحب نے دریافت کیا کہ نماز کس وقت ہوگی۔ ڈیڑھ بجے کا وقت بتایا گیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "پھر میرا خیال ہے کہ تھوڑی سی گفتگو نماز سے پہلے ہو جائے۔" پان بمشکل ایک دو منٹ منہ میں رہا ہوگا کہ اگالدان میں ڈال دیا۔ خوب کلی کی، اور فرمایا: "اس وقت ہماری گفتگو خالص شرعی نقطۂ نظر سے ہے۔ کوئی سیاسی ذہن یا تعصب اس میں کارفرما نہیں ہونا چاہیے اور میں اپنی ذات کے بارے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے اپنی غلطی معلوم ہوگئی تو میں اس سے رجوع کر لوں گا۔" یہ کہہ کر فرمایا کہ آپ حضرات نے میرے فتوے کا جواب لکھا ہے گو اس میں صراحۃً میری تردید نہیں کی گئی، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے فتوے کا جواب ہے، مجھے آپ حضرات پر تین اعتراض ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے پہلے نکتے کی تشریح بیان فرمانی شروع کی۔ ان کی تقریر بڑے ربط و تسلسل سے جاری تھی، اس ناکارہ کو حضرت مفتی صاحبؒ کی گفتگو سننے کا موقع پہلے بھی کئی بار ملا، لیکن جس حاضر دماغی، جس ربط و سلیقہ اور جس حسنِ استدلال سے وہ آج اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر رہے تھے، اس کا تجربہ پہلے نہیں ہوا تھا۔ قریباً دس منٹ وہ اس نکتہ پر تقریر فرماتے رہے۔ درمیان میں نہ کوئی حشو و زائد لفظ آیا، نہ کسی لفظ پر اٹکن یا لکنت محسوس ہوئی۔ خدا جانے وہ پہلے نکتے کی تشریح مکمل کر چکے تھے، یا اس سلسلے میں ابھی کچھ اور وضاحت فرمانا چاہتے تھے کہ فقرہ مکمل کر کے ایک لحظہ کے لیے خاموش ہوئے۔ بایاں ہاتھ پیشانی پر رکھا اور یکایک بائیں پہلو کی طرف مائل پیچھے کو گر گئے۔ اس جانب جناب صاحبزادہ مولوی محمد بنوری بیٹھے تھے، ان کی گود میں آ رہے۔ آج تک کسی کو اتنی آسانی سے مرتے نہیں دیکھا تھا، اس لیے کسی کو وہم بھی نہ ہوا کہ حضرت مفتی صاحبؒ زبانِ حال سے لستُ علیٰ صحبتکم بحریصٍ[1] کہتے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں۔ ہم سب یہی سمجھے کہ دل کے دورہ کی وجہ سے سکتہ کی سی

---

[1] سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے تاریخی فقرے کی طرف اشارہ ہے۔ اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے گورنروں اور فوجی حکام کے نام ایک گشتی فرمان لکھا تھا کہ اسلام کے کچھ شرائط اور ارکان ہیں۔ زندہ رہا تو تمہارے سامنے ان کی تشریح کروں گا، لیکن اگر میرا وقت موعود آپہنچا تو میں تمہارے پاس رہنے کا خواہشمند بھی نہیں ہوں۔

www.tezpakistan.com

بیہوشی ہوگئی ہے، اس لیے مولانا محمد طاسین صاحب نے مُنہ میں پانی ڈالا۔ راقم الحروف نے زور سے مقامِ قلب کو مَسلنا شروع کیا۔ ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب اور مفتی احمدالرحمٰن صاحب نے پاؤں کی مالش شروع کردی۔ مولانا محمد رفیع عثمانی نے زبان کے نیچے وہ دوائی رکھی جو شدید دورۂ قلب میں دی جاتی ہے۔ مولانا تقی عثمانی، مولانا محمد بنوری اور مولانا محمد جمیل خان ڈاکٹروں کی طرف دوڑے، مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے دقفہ وقفہ سے دو چار ہچکیاں لیں اور ابدی نیند سو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ راقم الحروف نے مصنوعی دانت اپنے ہاتھ سے نکالے، اور آنکھوں پر سے چشمہ اُتارا۔ زندگی کی تمام علامتیں ختم ہو چکی تھیں اور یقین آچکا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی رُوح پرواز کر چکی ہے، لیکن ان کے معالج ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ انہیں ہسپتال ضرور لایا جائے؛ چنانچہ ہسپتال لے گئے اور آدھ گھنٹے تک نظام تنفس جاری کرنے کی کوشش کی گئی، بالآخر اشکبار آنکھوں سے جناب ڈاکٹر اسلم صاحب اور ان کے رفقاء نے موت کی تصدیق کردی۔

✺

یوں تو موت سنّتِ بنی آدم ہے، اور اس سے کسی کو مفر نہیں، یہاں جو بھی آیا، جانے کے لیے ہی آیا، لیکن بعض حضرات کی زندگی کی طرح ان کی موت بھی لائقِ رشک ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی موت کئی لحاظ سے حُسنِ خاتمہ کی علامت ہے۔ ایک تو وہ سفر میں تھے، اور سفر میں مومن کی موت معنوی شہادت ہے۔ پھر یہ سفر بھی سفرِ حج تھا۔ گویا یہ موت فی سبیل اللہ تھی۔ پھر ایک دینی و شرعی مسئلے کی وضاحت و تشریح کرتے ہُوئے وہ دُنیا سے رخصت ہُوئے۔ دینی مسائل کا مذاکرہ ذکرِ الٰہی کی ایک فرد ہے۔ پس ان کا خاتمہ ذکرِ الٰہی پر ہُوا، اور مفتی کی حیثیت سے جو خدمت حق تعالیٰ نے ان کو تفویض فرمائی آخری لمحہ تک اس میں مشغول رہے، پھر ان کے طائرِ رُوح نے جس سُرعت سے پرواز کی وہ بجائے خود ایک حیرت انگیز امر ہے۔ راقم الحروف کا احساس یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ جب فقرہ پُورا کر کے خاموش ہُوئے اسی لمحہ بیٹھے بیٹھے ان کی رُوح پرواز کر گئی۔ اتنی آسانی سے رُوح کا قبض ہو جانا اس ناکارہ کے لیے بالکل ہی نیا مشاہدہ تھا کہ نہ موت سے پہلے کسی تکلیف کی شکایت، نہ کسی دَرد و کرب کا اظہار۔ شیخ عطارؒ کے درویش کا واقعہ کتابوں میں پڑھا سُنا تھا کہ ان کی دہلیز پر سر رکھ کر لیٹ گئے اور کہا کہ ہماری رُوح تو قبض ہو جائے گی، مگر اس کا چشم دید مشاہدہ حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال سے ہُوا کہ مرنے والے یُوں بھی مَر کر دکھا دیا کرتے ہیں۔

✺

حق تعالیٰ شانہٗ نے کسی کی موت کے لیے جو وقت مقدر فرما رکھا ہے، موت ٹھیک اسی وقت مقرر پر آتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کی تقدیم اور تاخیر نہیں ہو سکتی، اور یہ حق تعالیٰ شانہٗ کے علم میں ہے کہ کسی کی موت کے لیے کون سا وقت موزوں ہے، اس لیے کسی کی موت کو "بے وقت کی موت" کہنا بڑا ہی غلط اور جاہلانہ محاورہ ہے، اور یہ گویا حق تعالیٰ شانہٗ کے فعل پر اعتراض ہے۔ مومن کی شان تو وہ ہونی چاہیے جس کی تعلیم ایک دُعا کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو فرمائی ہے: "اے اللہ! مجھے زندہ رکھ جب تک آپ کے علم میں زندگی میرے لیے بہتر ہو، اور مجھے وفات دے جب آپ کے علم میں وفات بہتر ہے۔"

اس لیے عقلی و ایمانی حیثیت سے مومن کو اس بات کا پُورا اطمینان ہونا چاہیے کہ جس شخص کے حق میں موت کا جو وقت مقرر ہے وہی اس کے لیے خیر ہے، اور بلاشبہ بحالتِ ایمان کسی شخص کا اس دُنیا سے رخصت ہو جانا اس کے حق میں بڑی نعمت ہے، اور دُنیا کی ساری لذّتیں اور نعمتیں اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں ـــــ تاہم دُنیا سے جانے والے حضرات کی جُدائی سے جو خلا پیدا ہو جاتا ہے، اس پر رنج و غم اور حسرت و قلق کا ہونا ایک طبعی چیز ہے۔ خصوصاً اگر رخصت ہونے والے حضرات کا وجود دُنیا کے لیے باعثِ رحمت ہو اور ان کی ذات سے دینی خدمات وابستہ ہوں تو ان کا سدمہ ایک عالم کی بے کسی و محرومی اور یتیمی کا موجب بن جاتا ہے۔

✺

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ ۹۵ھ میں حجاجؒ کے دستِ جفا سے شہید ہُوئے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں ان کے بارے میں حضرت میمون بن مہران کا قول نقل کیا ہے: "سعید بن جبیرؒ کا انتقال اس وقت ہُوا جبکہ رُوئے زمین پر کوئی ایسا شخص

www.tezpakistan.com

نہیں تھا جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو۔"

نیز امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد نقل کیا ہے، "سعید بن جبیرؒ اس وقت شہید ہوئے جبکہ روئے زمین کا کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو۔"

پاکستان کی حد تک یہ فقرہ حضرت مفتی صاحبؒ پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ وہ دنیا سے اس وقت رخصت ہوئے جب اہلِ علم ان کے علم و فقہ کے محتاج تھے۔ اہلِ دانش کو ان کے فہم و تدبّر کی احتیاج تھی اور اہلِ سیاست ان کی قیادت و زعامت کے حاجتمند تھے۔ اس لیے ان کی وفات بیک وقت علم و دانش، فقہ و حدیث، سیاست و قیادت، حلم و تدبّر، شجاعت و بسالت اور شہامت و زعامت کا ماتم ہے۔ ان کی تنہا ذات سے دین اور خیر کے اتنے شعبے چل رہے تھے کہ ایک جماعت بھی ان کے خلاء کو پُر کرنے سے قاصر رہے گی۔

فکر و عزیمت کی بلندی حق تعالیٰ شانہٗ کی بہت بڑی نعمت ہے، لیکن جو حضرات اس نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ قوتِ برداشت اور صبر و تحمل کے باوجود یہ ان کے لیے امتحان و آزمائش اور عظیم ترین مجاہدہ بن جاتی ہے۔ ابنائے زمانہ ان کی اس بلندی کا ساتھ دینے سے قاصر رہتے ہیں اور ان حضرات کے لیے ابنائے زمانہ کی پست سطح پر اُترنا ممکن نہیں رہتا۔ یہی کشاکشی ان کے لیے صبر آزما مجاہدہ ثابت ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی روح ایک عرصہ سے اس کشاکشی کو برداشت کر رہی تھی۔ وہ اس ملک میں اسلام کو غالب دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے اپنی صحت و قوت کی ساری پونجی داؤں پر لگا دی تھی، لیکن دورِ جدید کی پستی، منافقت، اور "یقولون مالا یفعلون" کی پالیسی ان کی عزیمت کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایک عرصہ سے اہلِ زمانہ کی یہ "جفائے وفانما" ان کے جسم کو گھائل اور ان کی روح کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر یہ روش جاری رہتی ہے تو یہ ملک اسلام کی برکات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا۔ یہی سوزِ باطن ان کے لیے بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔

مولانا محمد تقی عثمانی (دارالعلوم، کراچی)

مَیں، ان کے
بالکل سامنے بیٹھا تھا،
انہوں نے بایاں ہاتھ پیشانی اور
سر پر رکھا اور
بائیں کروٹ پر گر گئے۔

س: مفتی محمود صاحبؒ سے آپ کی اوّلین مُلاقات کب اور کس طرح ہوئی؟

www.tezpakistan.com

ج : میں نے حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر سب سے پہلے اپنے استاد محترم مفتی رشید احمد صاحب سے سبق کے دوران سنا اور پھر والدِ محترم کے ساتھ ۵۶ء میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس کے سلسلہ میں ملتان گیا، وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں ان کی متانت، سنجیدگی اور علمی قابلیت سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

س : آپ نے فرمایا ہے کہ مفتی صاحب کی علمی قابلیت اور متانت سے آپ بہت متاثر ہوئے، کیا آپ اس کی کوئی وضاحت فرمائیں گے؟

ج : اس ضمن میں سب سے پہلی بات ہے ان کا علمی استحضار۔ عام طور پر جو علماءِ کرام تدریسی اور تعلیمی لائن کو چھوڑ کر دیگر مشغولیات اپنا لیتے ہیں ان کا علم اپنی جگہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو مگر اس کا استحضار ان کو نہیں رہتا اور مسائل کے سلسلے میں ان کو کتابوں کی چھان بین کرنا پڑتی ہے اور علم ان کا ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، مگر باوجود سیاسی مشغولیت کے، اور سیاسی مشغولیت بھی اتنی زیادہ کہ پوری قوم کی قیادت کی ذمہ داری اور چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں، آپ کا علمی استحضار اتنا زیادہ تھا کہ جس وقت بھی آپ سے مسائل پر علمی بحث ہوتی، آپ کا علم ایسے حاضر ہوتا جیسے آپ کے سامنے کتابیں کھلی پڑی ہوں۔ یہ خصوصیت پاکستان میں صرف انہی کو حاصل تھی۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ علماءِ کرام سادہ زندگی ہی گزارتے ہیں، مگر انسانی فطرت ہے کہ جب انسان مناصب اور عہدے کی بلندی پر پہنچ جائے، تو اس کی شخصیت میں خود بخود تبدیلی آجاتی ہے اور اس کی وضع قطع ان مناصب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے، مگر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کا کمال تھا کہ باوجود بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے، زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور آپ کا وہی لمبا کرتہ اور شلوار اور سر پر ایک رومال جو کہ آپ قاسم العلوم کے ایک عام مدرس کی حیثیت سے زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ ان تمام مناصب میں بھی لباس وہی رہا۔ نظریاتی کونسل کے رکن کی حیثیت سے مجھے ایک مرتبہ پشاور کسی سرکاری کام سے جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے قیام کا انتظام فرنٹیئر ہاؤس میں (جو کہ پشاور کا مہمان خانہ ہے) کیا گیا تھا۔ اتفاق سے مجھے جو ملازم ملا وہ وہی تھا جو کہ حضرت مفتی محمود صاحب کی خدمت پر متعین تھا۔ جب آپ ابتداءً فرنٹیئر ہاؤس میں ٹھہرے تھے، میری اس سے بات چیت ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس تو بڑے بڑے مہمان آتے ہونگے اور مفتی صاحب بھی مہمان بن کر آئے تھے، تم نے مولانا مفتی محمود صاحبؒ کو کیسا پایا؟ اس نے جواب میں کہا کہ میں نے بڑے بڑے لوگوں کی خدمت کی ہے اور میرے اس مہمان خانے میں بڑے بڑے وزیر بھی آتے ہیں، مگر جو چیز مولانا مفتی محمود میں تھی وہ نہ کسی میں دیکھی اور نہ آئندہ دیکھنے کی اُمید ہے۔ مولانا مفتی محمود واقعی درویش تھے اور ایسا درویش وزیرِ اعلیٰ دوبارہ نہیں آسکتا۔ ان میں قرونِ اولیٰ والی سادگی تھی۔

متانت، سنجیدگی اور تحمل، یہ تینوں چیزیں مولانا مفتی محمود صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ سنجیدگی ایسی کہ بڑے سے بڑا آدمی بھی آپ سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ متانت اور تحمل ایسا کہ مخالف سے مخالف آدمی آجائے اور آپ کے سامنے بات کرے تو آپ تحمل کے ساتھ اس کی بات سنتے اور پھر دلائل کے ساتھ اس کا جواب دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے سے بڑا مخالف آپ کی مجلس میں بیٹھنے کے بعد آپ کا قائل ہو جاتا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کی قیادت عطا فرمائی — آپ کی زندگی بڑی مجاہدانہ تھی، آپ نے اپنی پوری زندگی، اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے وقف کر رکھی تھی اور باوجود اس کے کہ آپ اپنی زندگی میں بڑے سے بڑا منافع کما سکتے تھے، آپ نے اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کیلئے دیگر تمام دُنیاوی منافع کو پسِ پُشت ڈال دیا اور پوری زندگی اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے صرف کر دی اور یہ چیز بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

س : مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ جو کہ عام لوگوں سے پوشیدہ ہو؟

ج : مولانا مفتی محمود کی پوری زندگی ایسی کھلی کتاب تھی جس کو عام و خاص ہر شخص پڑھ سکتا تھا، مگر پھر بھی بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ جاتی ہیں، میری نظر میں ان کی قوتِ ارادی ایسی چیز ہے جس کا لوگوں کو کم ہی اندازہ ہوگا۔ تحریک نظامِ اسلام اور دیگر تحریکات میں ان کی قوتِ ارادی ہی کا کمال تھا کہ یہ تحریکات کامیاب ہوئیں۔

س : مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ، مذہبی اور فقہی مسائل میں کس قسم کا رویّہ اختیار کرتے تھے؟

ج : مولانا مفتی محمود صاحب بہت زیادہ وسیع النظر اور وسیع الظرف تھے۔ ان کے سامنے ہر وقت فقہاءِ کرام کی آراء رہتی تھیں اور مسائل کے سلسلے میں سب سے پہلے مخالف کے نقطۂ نگاہ کو تحمل اور سنجیدگی کے ساتھ سنتے اور اس کے بعد پہلے اس کے دلائل کو رد فرماتے اور بعد میں اپنے

www.tezpakistan.com

دلائل جو کہ فقہائے کرام کی آرا پر مشتمل ہوتے تھے، اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے فقہی مسائل نہ میرے ہیں اور نہ آپ کے، ہم نے کتاب و سنّت اور فقہائے کرام کی آرا کے مطابق حل کرنے ہیں اور اس میں ترجیح کا مدار دلائل پر ہے یا مجھے اپنے دلائل سے قائل کر لیجیے یا میرے دلائل کو تسلیم کر لیجیے۔ مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ نے کبھی مذہبی مسئلے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش نہیں کی، وہ مذہبی مسائل کے معاملات میں سیاست دانوں سے مشورے کے بجائے علمائے کرام سے گفتگو فرمایا کرتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مذہبی مسائل کے سلسلے میں علمائے کرام کا متفقہ موقف پیش کیا جائے تاکہ عوام اور حکومت میں بدظنی پیدا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی مسائل کے سلسلے میں وہ دیگر مکاتبِ فکر کے علماء کو بھی اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے تھے۔ دیکھیے زکوٰۃ کے مسئلے پر انہوں نے اپنا ایک موقف علمائے کرام کے مشورے سے پیش کیا اور سب سے پہلے حکومت کو اس سے آگاہ کیا، پھر اس کو ایک اخباری بیان کے ذریعے عوام کے سامنے پیش کیا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اس فتوے کی تیاری کے بعد سب سے پہلے اس فتوے کو ملک بھر کے علمائے کرام کی آرا معلوم کرنے کے لیے دستخط کیا گیا تاکہ حکومت کو متفقہ طور پر ایک مسودہ پیش کیا جائے اور پھر اسی مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کا انتقال ہوا۔ اس مجلس میں آپ نے فرمایا تھا کہ بھائی یہ مذہبی مسئلہ ہے کوئی سیاسی مسئلہ نہیں اور نہ میں اس کو سیاسی رنگ دینا چاہتا ہوں، اس لیے ہم اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں کہ اگر میں غلطی پر ہوں تو اس کی نشاندہی ہو جائے اور اگر میرا نظریہ صحیح ہے تو آپ کی رائے سے اس کی تائید ہو جائے۔ مفتی محمود صاحب مسائل کے سلسلے میں نہ تنگ نظر تھے کہ اس میں کوئی لچک ہی نہیں ہو سکتی اور نہ اتنے وسیع النظر کہ حلال اور حرام کی تمیز ختم کر دیں۔ درمیانی طور جتنی مسئلے میں گنجائش ہوتی رعایت فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فقہ میں بہت بلند مقام عطا فرمایا تھا اور اہلِ فتویٰ کی حیثیت سے ان کی رائے کو مستند سمجھا جاتا تھا۔ مفتیانِ کرام میں ان کا ایک خاص مقام تھا اور وہ مجلس میں ہمیشہ اپنے علم اور فضل کی بنا پر بھاری پڑتے تھے، اور ان کا اندازِ بیان بہت ہی زیادہ دلکش ہوتا تھا۔

س: انتقال سے پہلے مفتی صاحب سے جو ملاقات ہوئی، اس کی رُوداد سنائیں گے؟

ج: جب زکوٰۃ و عشر آرڈی ننس نافذ ہوا تو اس پر غور کرنے کے لیے ہماری مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کے کئی اجلاس ہوئے اور آخر میں ایک تحریر مرتب ہوئی جو "البلاغ" کے رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس موضوع پر ایک فتویٰ تحریر فرمایا تھا۔ ان دونوں تحریروں کے درمیان بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ کسی وقت اس مسئلے پر زبانی گفتگو ہو جائے۔ شوال میں جب مفتی صاحب تشریف لائے تو ایسی تفصیلی ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ مفتی صاحب بیمار ہو گئے اور برادرِ مکرم حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور احقر عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو وہاں کسی مسئلے پر گفتگو کا موقع نہ تھا، بات عیادت ہی کی حد تک محدود رہی اور ہم چلے آئے۔

اب ذیقعدہ کے آخر میں مفتی صاحب سفرِ حج پر جانے کے لیے کراچی تشریف لائے تو شروع میں ہمیں تشریف آوری کا علم نہ ہوا۔ ایک رات حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے جناب محمد بنوری صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے مفتی صاحب کی تشریف آوری کی اطلاع دی اور ساتھ ہی حضرت مفتی صاحب کا پیغام پہنچایا کہ انہوں نے ہم دونوں (احقر اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی) کو زکوٰۃ کے مسئلے پر گفتگو کے لیے بلایا ہے۔ اگلے دن بارہ بجے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں ملاقات طے ہو گئی اور ہم دونوں تقریباً ساڑھے بارہ بجے بنوری ٹاؤن پہنچے۔ مفتی صاحب مہمان خانے میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ مفتی صاحب کے ساتھ آخری ملاقات ہوگی، وہاں مولانا محمد طاسین صاحب، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مولانا احمد الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد بنوری پہلے سے موجود تھے۔

حسبِ معمول حضرت مفتی صاحب بڑی شفقت اور تپاک سے ملے۔ اُٹھ کر معانقہ فرمایا اور تقریباً بیس منٹ تک بڑے شگفتہ ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔

"۱۹۷۷ء کے الیکشن کے دنوں میں مَیں جمعیت کا خزانچی ہوتا تھا۔ تین اور افراد بھی اس عہدے پر فائز تھے۔ شہری حلقے سے ہمارے پانچ اُمیدوار انتخاب لڑ رہے تھے۔ ہم ان کو حساب کتاب کر کے روزانہ خرچے کے لیے کچھ رقم دے دیتے۔ ایک بار مدرسہ نعمانیہ میں بیٹھے تھے کہ مولانا مفتی محمود نے اپنی واسکٹ اتاری اور میری طرف پھینکتے ہوئے بولے: اس واسکٹ کی جیب میں تین سو روپے میرے ذاتی ہیں، باقی جتنی رقم ہے، وہ نکال لو یہ پارٹی کی ہے۔ مَیں نے رقم گنی۔ تھوڑی دیر بعد مفتی صاحب آئے، تو مَیں نے بتایا: حضرت تیرہ ہزار روپے نکلے ہیں۔ انہوں نے تیزی سے کہا: میرے ذاتی تین سو روپے نکالو، باقی رقم سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ پارٹی کی ہے۔"

☒ گل شیر خاں —— ڈیرہ اسماعیل خاں

www.tezpakistan.com

جناب محمد بنوری نے کہا کہ یہ تقریباً نصف گھنٹہ تاخیر سے پہنچے ہیں، اس لیے ان پر جرمانہ ہونا چاہیے۔ مفتی صاحب نے فرمایا، نہیں بھائی، پاکستان میں ایک گھنٹہ تک تاخیر معاف ہے اور یہ لوگ تو یوں بھی شہر سے دُور رہتے ہیں۔ پھر فرمانے لگے کہ ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ اگر کوئی شخص پابندیٔ وقت کا اہتمام کرے تو لوگ اسے طعنے دیتے ہیں کہ اس میں "انگریزیت" ہے، حالانکہ یہ تو اچھی صفت ہے، مگر ہم لوگوں نے اچھی باتیں انگریز کے کھاتے میں ڈال دی ہیں اور پھر وہ اچھی باتیں واپس لینے کو تیار نہیں اور بُری باتیں ان سے لینے کو تیار ہیں۔

احقر نے طبیعت کا حال پُوچھا تو فرمایا کہ الحمد للہ اب طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے، بس دوا اور پرہیز جزوِ زندگی بن چکے ہیں، اس کی پابندی کروں تو طبیعت ٹھیک رہتی ہے، البتہ دوا یا پرہیز کا ناغہ ہوجائے تو طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔

پھر سفرِ حج کا ذکر آگیا تو فرمایا کہ انشاء اللہ کل حج کے لیے روانگی ہے۔ مَیں نے اس مرتبہ افراد کا احرام باندھنے کا ارادہ کیا ہے، کیونکہ ہجوم کے زمانے میں ضعف کی بنا پر طواف میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ افراد میں پہنچنے کے بعد صرف ایک طواف کرنا ہوگا اور طوافِ وداع کے بارے میں بھی میرا ارادہ یہ ہے کہ منیٰ سے واپس آکر سیدھا مدینہ طیبہ چلا جاؤں گا اور وہاں سے واپس آکر طوافِ وداع کروں، کیونکہ اس وقت ہجوم کم ہوچکا ہوگا۔

اتنے میں چائے آگئی۔ احقر اور بھائی صاحب چونکہ دن میں ایک سے زیادہ بار چائے نہیں پیتے، اس لیے ہم نے چائے سے عذر کیا، تو مفتی صاحب نے فرمایا، مَیں اگرچہ چائے پیتا ہُوں، لیکن جب کسی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چائے نہیں پیتا تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ احقر کے ہاتھ میں پان کا بٹوہ تھا، مَیں نے اس کی طرف اشارہ کرکے عرض کیا کہ حضرت! یہی معاملہ ہمارا اس چیز کے ساتھ ہے۔ فرمانے لگے، ہاں بھائی یہ تو چائے سے بھی بدتر چیز ہے۔

غرض تقریباً بیس منٹ تک بڑی شگفتہ باتیں ہوتی رہیں۔ مفتی صاحب بڑے ہشاش بشاش تھے۔ چہرے پر نشاط کے آثار تھے اور سنجیدگی کے ساتھ خوش طبعی، جو مفتی صاحب کی عام عادت تھی، بات بات میں جھلک رہی تھی، بلکہ بعض باتیں نہایت بے تکلفی کے ماحول میں ایسی ہوئیں کہ بار بار محفل کشتِ زعفران بنتی رہی۔ اس وقت کسی کے حاشیۂ وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ مفتی صاحبؒ اب صرف چند منٹ کے مہمان ہیں اور اس کے بعد یہ محفل ہمیشہ کے لیے ویران ہوجائے گی۔

ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ اچھا اب نمازِ ظہر سے پہلے اصل مسئلے سے متعلق کچھ بات کرلی جائے؟ ہم نے تائید کی اور ہمہ تن گوش ہوگئے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا: سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ زکوٰۃ کا مسئلہ چونکہ خالص دینی مسئلہ ہے، اس لیے ہمیں اس پر خالص فقہی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی چاہیے اور کسی بھی دوسرے نقطۂ نظر یا کسی قسم کی نفسانیت کو درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔ الحمد للہ، مجھے اس پر اطمینان ہے کہ اگر آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی تو اسے قبول کرنے میں مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا اور یہی اُمید بحمد للہ آپ سے بھی ہے کہ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں آگئی تو آپ اپنی بات پر اصرار نہیں کریں گے۔ اور اسی اُمید پر مَیں نے زبانی گفتگو مناسب سمجھی ہے تاکہ اگر فتووں میں اتفاق کی صورت پیدا ہوجائے تو زیادہ بہتر ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم خود اس کے خواہش مند ہیں کہ اس مسئلے پر خالص فقہی انداز سے گفتگو کرکے کسی متفقہ نتیجے پر پہنچ جائیں۔ فرمانے لگے کہ ہاں! پچھلی مرتبہ آپ ہسپتال میں آئے، تو بیماری اور ہسپتال کے ماحول کی وجہ سے کسی تفصیلی بات کا موقع نہ تھا، اس لیے وہاں یہ بات نہ ہوسکی، بہرحال اب بحمد للہ اس کا موقع مل گیا ہے، اور اب یہ بات ہوجانی چاہیے۔

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا، "مَیں نے آپ کی (یعنی مجلس تحقیق مسائل حاضرہ) کی تحریر کو غور سے پڑھا ہے اور اس پر مجھے صرف تین اشکالات ہیں اگر وہ تین اشکالات حل ہوجائیں تو مسئلہ حل ہوجائے گا۔ مَیں یہ تینوں اشکالات آپ کے سامنے بیان کرتا ہُوں:"

یہ کہہ کر مفتی صاحبؒ نے پہلے اشکال کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ حضرات نے بنک اکاؤنٹ کو اموالِ ظاہرہ میں شمار کیا ہے۔ لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ بنک میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے وہ فقہی اعتبار سے امانت نہیں، بلکہ قرض ہوتی ہے اور جب کسی کو کوئی رقم بطور قرض دے دی جائے تو وہ قرض دینے والے کی ملکیت سے نکل کر مقروض کی ملکیت ہوجاتی ہے، لہٰذا بنک کی رقوم اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتیں، اسی لیے ان پر زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہیں جب تک اکاؤنٹ ہولڈر اس رقم کو واپس نہ لے لے، لہٰذا بنک کو جو مقروض ہے، یہ حق حاصل ہے کہ وہ از خود اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف سے زکوٰۃ وضع کرلے۔ اور نہ مصدق کو یہ حق ہے کہ وہ بنک کی رقم سے جو بنک کی ملکیت ہوچکی ہے، اکاؤنٹ ہولڈر کی زکوٰۃ وصول کرلے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس نکتے کی وضاحت بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل انداز میں فرمائی، اس پوری گفتگو میں کسی ادنیٰ کمزوری، غائب دماغی یا کسی

www.tezpakistan.com

[illegible] سے پہلے بات
جسمانی یا ذہنی تکلیف کا [illegible]
کو سمیٹ رہے تھے کہ احقر نے ۔۔ جو ان کے بالکل سامنے بیٹھا تھا، چہرے پر اچانک معمولی سی کمزوری اور سفیدی محسوس کی اور چند لمحوں کے لیے ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش بھی پیدا ہوئی اسی حالت میں اچانک حضرت مفتی صاحب نے اپنا بایاں ہاتھ پیشانی اور سر پر رکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی بائیں کروٹ پر گر گئے۔

یہ سب کچھ چند ثانیوں میں اس قدر آناً فاناً ہوگیا کہ ہم سب حیران و پریشان رہ گئے۔ کسی نے منہ میں پانی ڈالا کسی نے قلب کی مالش شروع کر دی، کوئی ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑا، حواس مجتمع کرنے پر اندازہ یہ ہوا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ اس کے باوجود کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ کے صرف چند لمحوں کے سانس باقی رہ گئے ہیں، دل کی تکلیف کے وقت جو فوری دوا دی جاتی ہے، وہ بھی زبان کے نیچے رکھ دی گئی تھی، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نبض اور سانس دونوں غائب تھے۔ امراض قلب کے ہسپتال میں فون کیا گیا، تو ڈاکٹر صاحبان نے صورت حال سننے کے بعد فوراً ہسپتال لانے کا مشورہ دیا، ہم انہیں ہسپتال لے گئے، وہاں ڈاکٹر صاحبان ہسپتال سے باہر پہلے سے منتظر تھے اور انہوں نے گاڑی ہی میں اپنی کارروائی شروع کر دی، بعد میں ایمرجنسی وارڈ میں لے جا کر تقریباً نصف گھنٹے تک ڈاکٹر صاحبان کوشش کرتے رہے۔ یہ نصف گھنٹہ انتہائی اُمید و بیم کی حالت میں گزرا لیکن پیغام اجل آپہنچا تھا، تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر رشید اسلم صاحب نے باہر نکل کر افسردہ لہجے میں بتایا کہ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکی۔ حضرت مفتی صاحب کی رُوح ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی پرواز کر چکی تھی۔ اِنا للہ وَاِنا الیہ راجعون۔

یہ تمام واقعات ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مدت میں اس طرح پیش آگئے کہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پاس بلانے کے لیے ایسے وقت کا انتخاب فرمایا کہ وہ سفرِ حج کے لیے پا بہ رکاب تھے، بلکہ ان کا سفرِ حج تو شروع ہو چکا تھا، ایک دینی مدرسے کی مُبارک فضا تھی، علماء و طلباء کا مجمع تھا۔ آخر دم تک ایک خالص دینی اور فقہی مسئلے کی تحقیق میں مشغول رہے اور یہی گفتگو ان کی آخری گفتگو ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا حسین اور مبارک خاتمہ انہیں نصیب فرمایا جو ہر مُسلمان کے لیے قابلِ رشک ہے۔ دینِ متین کا یہ خادم و مجاہد جو قال اللہُ وَقال الرَّسُولُ کے ماحول میں پروان چڑھا تھا، قال اللہ وقال الرّسُول ہی کی بات کرتا کرتا دُنیا سے رخصت ہوگیا۔

س : مفتی صاحب کا کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو یاد ہو؟

ج : مولانا مفتی محمودؒ بہت ہی زیادہ شگفتہ مزاج تھے۔ اکثر آپ اپنے ہم مجلسوں کو لطائف سُنایا کرتے تھے۔ اسمبلی کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جس سے آپ کی ظرافت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اسمبلی میں ایک دفعہ نکاح بیوگان کا مسئلہ زیرِ بحث تھا اور مختلف طرف سے اس سلسلے میں تقاریر ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک خاتون رُکن (غالباً بیگم نون تھیں) نے کھڑے ہو کر کہا (جو کہ خود بھی بیوہ تھیں) اب یہ مسئلہ ایسا نہیں رہا کہ اس میں بحث کی جائے کیونکہ اب عورتوں کو خود اس بات کا احساس ہوگیا ہے اور وہ اب دوسری خواتین کو اس سلسلے میں ترغیب دیتی ہیں کہ وہ نکاح کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب اُٹھے اور فرمایا کہ صرف زبانی ترغیب اور تبلیغ سے کیا ہوتا ہے، کوئی عملی ثبوت بھی ہونا چاہیے۔

GULF HOTEL
is far better - try it
Frere Street Saddar
KARACHI
Phone : 515830—39

www.tezpakistan.com

ڈاکٹر عبدالحئی صاحب (خلیفۂ مجاز حضرت تھانویؒ)

ان کا جنازہ پڑھانے کی سعادت میرے حصّے میں آئی۔

مفتی محمود صاحب سے میری براہِ راست ملاقات اور تعارف اتفاق سے کبھی نہ پیش آیا، مگر ان کے علمی، دینی اور سیاسی کارنامے وقتاً فوقتاً میری نظروں سے گزرتے رہے اور علمائے کرام کی محافل میں اکثر ان کا تذکرہ آتا رہا۔ وہ ایک عظیم عالمِ دین، بہترین محدّث اور بلند پایہ فقیہہ اور مفتی تھے۔ ان کی علمی شخصیت اتنی بلند و برتر تھی کہ اس کا انکار دشمن بھی نہیں کرے گا۔ انہوں نے اپنی زندگی دین اور اسلام کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ آپ سیاست میں بلند و بالا مقام رکھتے تھے۔ سیاست ایسی چیز نہیں کہ جس میں سب لوگ کسی سے اتفاق کریں، بلکہ اس میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہوتی ہے، اس لیے بہت سارے لوگوں نے ان کی سیاست سے اختلاف کیا ہوگا، مگر اس اختلاف سے ان کی شخصیت کسی طور متاثر نہیں ہو سکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علمیت اور فقاہت میں بہت بڑا مقام عطا کیا تھا کہ علمائے کرام مسائل کے سلسلے میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بہت بڑا مقام تھا اور یہ ان کے عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی گفتگو اور آخری مجلس اس موضوع کو مقرر کیا جو ان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو تھا یعنی ایک فقہی اور دینی مسئلہ (زکوٰۃ)

میرے نزدیک ان کا سب سے نمایاں وصف فقہ اور حدیث کی مہارت کا تھا اور یہ چیز بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، خصوصاً اہلِ سیاست کو۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان کی وفات سے مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ یہ بات بھی میرے لیے باسعادت اور اُخری نجات کے ذخیرہ میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نمازِ جنازہ کے لیے مجھے منتخب فرمایا۔ جنازے کا قصہ بھی بلا ارادہ خدا کی توفیق سے ہوا۔ میں نے حضرت مفتی صاحب کی وفات کی خبر سنی، مگر اپنی ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی کہ جنازے میں شرکت کر سکوں۔ ایک اژدہام کا خوف دوسرے اپنی حالت کا احساس، مگر عشا کے وقت وضو کر کے باہر نکلا، تو میرے بڑے صاحبزادے نے کہا کہ میں جنازے میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔ میرے دل میں یہ خیال ہوا کہ جب وضو کر ہی لیا، تو چلو جنازے میں شرکت کر لوں۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن پہنچا، تو اتنا اژدہام کہ دروازے میں داخلہ مشکل، مگر اسی وقت ایک آدمی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اژدہام میں سے راستہ بناتا ہوا مجھے جنازے کے قریب لے گیا۔ وہاں منتظمین میں سے مفتی احمدالرحمٰن صاحب مجھے دیکھ کر فرمانے لگے کہ ہم آپ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جنازہ آپ ہی نے پڑھانا ہے۔ اس طرح بلا ارادہ اور بلا نیّت اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت میرے حصے میں رکھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی مغفرت فرمائے۔

www.tezpakistan.com

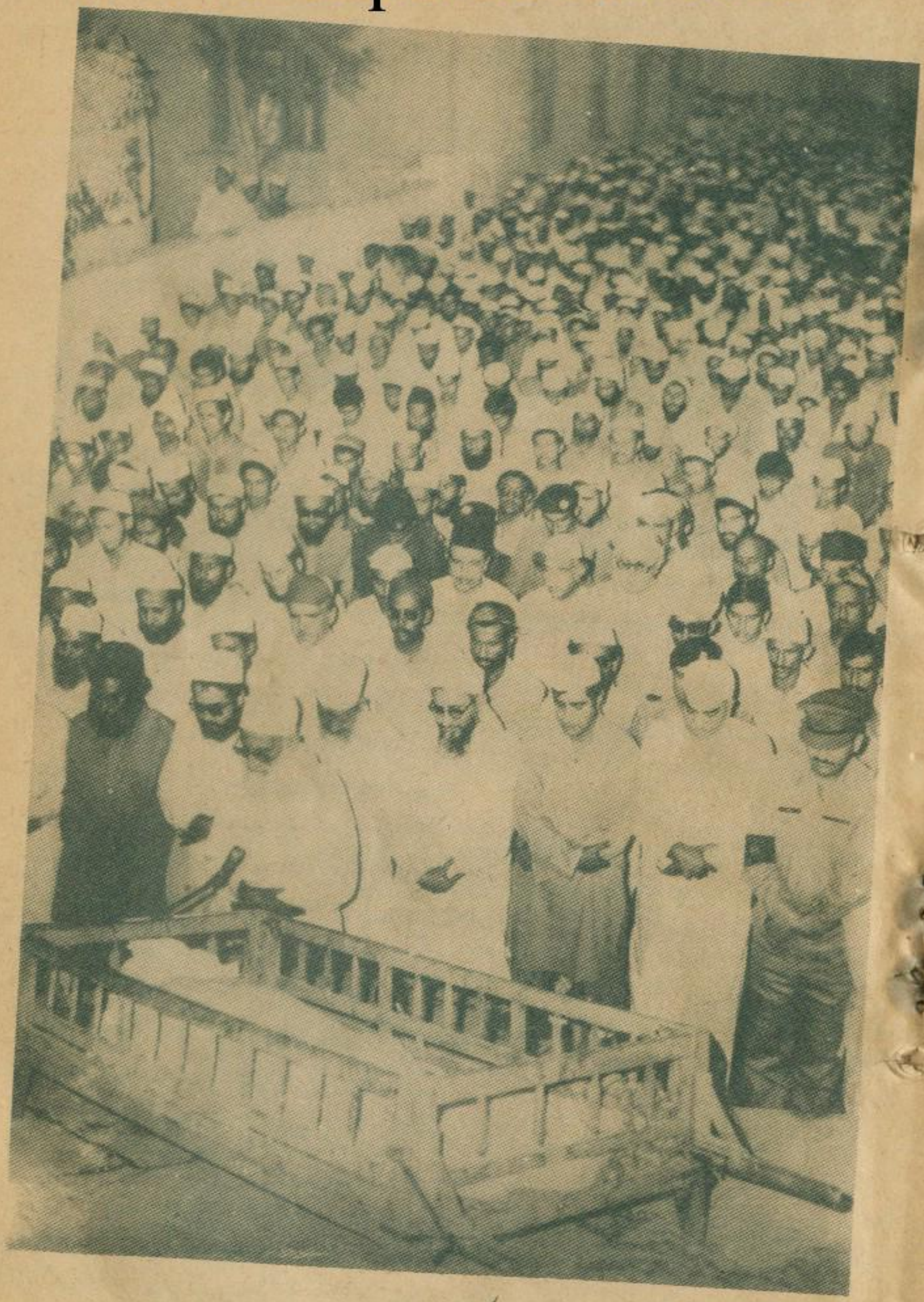

کراچی میں نمازِ جنازہ

www.tezpakistan.com

طارق نیازی (اسلام آباد)

ان کا جنازہ ایک عام چارپائی پر ان کے کچے گھر سے اُٹھا۔

یہ ۱۴ اکتوبر کی ایک اداس شام تھی۔ جانے کیوں فضا میں غیر معمولی افسردگی کے آثار نمایاں تھے۔ اچانک ایک نوجوان نے کہ شاہد نام رکھتا ہے میرے شانے جھنجھوڑ دیے۔ معلوم ہے کیا؟ میرا تجسس حیرت کا عنوان بن گیا۔ مفتی محمود اس جہانِ فانی سے دارالبقا کو کوچ کر گئے۔" شاہد نے غمزدہ لہجے میں جواب دیا۔ اس کا چہرہ ملول اور دِل محزوں تھا۔ لگتا تھا اسے مفتی محمود کے چلے جانے کا نہیں اپنے یہاں رہ جانے کا زیادہ صدمہ ہے۔ اس اطلاع نے مجھ پر جو اثر چھوڑا اس کے اظہار کا یہ محل نہیں۔ یہ وارداتِ قلبی میرے قلم کی توانائی پر قرض رہی..... شاہد نے مجھے اگلے مرحلے کی صحافیانہ تیاری کا احساس دلایا اور پھر میں پشاور کے لیے مائلِ پرواز تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ اعزاز مجھ ناچیز کو حاصل ہُوا تو مفتی مرحوم کے سفرِ آخرت کی قومی سطح پر اطلاع دہی کا فریضہ میں نے انجام دیا..... میں معمولی سے زادِ راہ کے ساتھ ایک غیر معمولی سفر کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ پشاور کی پرواز میں پون گھنٹہ باقی تھا لیکن میں بہت پہلے اسلام آباد ائیرپورٹ پر تھا۔ معلوم کیا تو غیر معمولی ہجوم کے باوجود ایک نشست حاصل کرنے میں کامیاب تھا۔

میرے پہلو میں ایک معروف بیوروکریٹ کی نشست تھی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد چپ کی مُہر توڑی: "آپ نے کہاں جانا ہے؟" ڈی آئی خان! میں نے جواب دیا..... وہ جیسے اس جواب سے مطمئن نہ تھے..... کیوں؟ کس لیے! انہوں نے سوال کیا تو میں نے کہا: "مفتی صاحب کے جنازے میں شریک ہونے!" "OH! YES" — انھوں نے انگریزی کا وار کیا اور ساتھ ہی گرہ لگائی: "HE iS DEAD" — میں نے انگریزی کی خلقی بدتمیزی کا فوراً جواب دیا: "OF COURSE HE IS DEAD! BUT HE WILL HE LIVING iN OUR MEWORY IN OUR HEARTS!"

اس جملے میں جذبات کی شدت نے ان حضرات کو مادّی حوالوں میں اُلجھا دیا..... چھوٹتے ہی سوال کیا! "WHAT WAS HE To you!"

میں نے بلا تامل جواب دیا: "I WAS To HiM AND HE WAS To EACH ONE!"

اس جملے نے جیسے ان کے ہونٹ سی دیے۔ ہم پشاور پہنچ گئے، مگر انہوں نے زبان نہ کھولی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے لیے کوئی فلائٹ نہیں تھی اور مجھے وہاں پہنچنا تھا۔ عجیب پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کس کو مدد کے لیے پکاروں؟ اچانک ایک نوجوان نے جیسے میری پریشانی کو بھانپتے ہُوئے کہا: "آپ نے غالباً ڈیرہ اسمٰعیل خان جانا ہے"۔ میں نے ہاں میں جواب دیا تو سوال کے اظہار سے پہلے ہی اس نے میری مشکل آسان کر دی، چنانچہ اگلے لمحے میں اس کی موٹر میں سوار پشاور ائیرپورٹ سے سوئے شہر رواں تھا۔ موٹر ایک بس سٹینڈ پر جا کر رُکی۔ آج یہاں غیر معمولی ہجوم

www.tezpakistan.com

تھا۔ بسوں کے قافلے "ہجومِ عاشقاں" لیے "کوچۂ جاناں" کو روانہ تھے۔ مَیں نے عرض مدعا کیا تو جواب ملا صبح تین بجے کی بس میں آپ کے لیے نشست مخصوص کی جاسکتی ہے۔ مَیں نے اظہارِ تشکر کیا، مگر ابھی رات کے بارہ بجے تھے اور تین بجنے میں تین گھنٹوں کا فاصلہ۔ یہ دیکھ کر مَیں قریب کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھا۔ بس کے کنڈکٹر نے قریباً ۲½ بجے آواز دی۔ مَیں جلدی سے تیار ہُوا اور پھر بس تھی اور اس کے مُسافر کہ سب مِل کر راہِ حق کے ایک مُسافر کو خدا حافظ کہنے جا رہے تھے۔

اس بھری پُری بس میں شاید دو ہی افراد ایسے تھے جو معمول کے سفر پر تھے، باقی سب کے سب مفتی صاحب مرحومؒ کے سوگوار تھے اور ایک دوسرے کے لیے حوصلوں کا سامان کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی یادیں — ان کی باتیں — ہر زبان پر جاری تھی۔ راستے میں جہاں جہاں بس رُکتی، مُسافروں کے غیر معمولی سفر کی آپ سے آپ پہچان ہو جاتی۔ چائے خانوں پر چائے نوشی ہر ایک کرتا، مگر ساقی کی عنایت آج سکّوں کے اجر سے ماورا تھی۔ ہم نے دو گھنٹوں کے سفر کے بعد کہیں نمازِ فجر ادا کی۔ مرحوم کے لیے پہلی دعائے مغفرت ہُوئی اور پھر تعزیت کا سفر جاری ہو گیا.... آج اخبار بھی جیسے "ان کی کائنات" کے لُٹ جانے پر سیاہ پوشی اور ماتم کناں تھا۔ ڈیرہ پہنچتے پہنچتے، راستے میں جس شہر اور قصبے سے گزر ہُوا، اخبار کی تقسیم پر پہلے ہاکروں کو جھگڑتے دیکھتے، پھر خریداروں کو ٹُوٹ ٹُوٹ کر گرتے پایا۔ بنّوں شہر میں تو ساری رونقیں جیسے "بحقِ مرگِ جاناں" ضبط ہو چکی تھیں۔ اِکا دُکا دُکانیں کُھلی نظر آئیں — جہاں صرف "نسوار" بٹ رہی تھی۔ دورانِ سفر ایک صاحب، مفتی صاحبؒ کی زندگی کا ناقدانہ جائزہ لیتے پائے گئے۔ انہیں مرحوم سے سب سے بڑا گِلہ یہ تھا کہ وہ نیپ (NAP) کے ساتھ مِل کر پی پی پی کے خلاف ہو گئے، البتہ وہ اس بات پر ہر راہی سے متفق تھے کہ مفتی مرحوم، قومی وحدت کی زندہ علامت تھے۔ ان کے اُٹھ جانے سے، اس خلاء کی وسعتیں بے پناہ ہیں۔ ان کے بقول خان عبدالولی خان، اب واحد سیاسی رہنما ہیں جو قومی پیشوائی کا فرض ادا کر سکتے ہیں، مگر انہیں تجربات نے اتنا پژمردہ کیا ہے کہ اب ماضی کے مُردہ گھوڑے کی سواری کرنے سے خود کو عاجز پاتے ہیں۔

قریباً ۸ گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد نیلا پہنچے۔ یہاں سے کوئی ۱۲ میل کے فاصلے پر مفتی صاحب مرحوم کا گاؤں ہے کہ عبدالخیل کے نام سے معروف ہے۔ یہیں ان کی آخری آرام گاہ قرار پائی تھی۔ ہمارے ہمسفروں کو کہیں سے اُڑتی یہ خبر ہاتھ لگی کہ مفتی صاحب کی میّت ۱۰ بجے صبح ہی گاؤں پہنچ گئی ہے؛ چنانچہ ان کی کثیر تعداد نیلا اُتر کر عبدالخیل کے لیے بس کا انتظار کرنے لگی۔ ہمارے دِل نے اس خبر کی صحت سے انکار کیا؛ چنانچہ ڈی آئی خان کا سفر جاری رکھا۔ وہاں پہنچے تو اِدھر اُدھر پُوچھنے پر ایک میڈیکل سٹور کی اطلاع دی گئی تھی، جہاں سے ہدایت اور رہنمائی کا جُملہ سامان فراہم ہو سکتا تھا۔ بس سٹینڈ سے ایک رکشہ لیا کہ شہر بھر میں یہی ایک تیز رفتار سواری ہے، جسے انسان استعمال کرتا اور انسان ہی کھینچتا ہے۔ اپنی بے چارگی کہ وسیلۂ دیگر نہ ہونے کے سبب، اسی سائیکل رکشہ کو کام میں لائے۔ میڈیکل سٹور پہنچ کر معلوم ہُوا کہ مالک موصوف خود خانہ کے انتظامات میں مصروف ہیں۔ ایک دو اور مقام — اسی راہِ شوق میں آئے، مگر بات کہیں بن نہ سکی، تھک ہار کر ایک پوسٹ آفس سے ٹیلی فون کی سُوجھی! پوسٹ ماسٹر نے ریتلے ماحول میں بھی پشتون روایات کے استحکام کو داغدار نہیں کیا۔ اپنی استطاعت سے بڑھ کر تعاون کیا۔ سب سے پہلے مَیں نے کمشنر کو فون کیا۔ وہ ایئرپورٹ جا چکے تھے، پھر ڈی سی کو آزمایا، مگر وہ بھی میّت کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اے۔ سی کے دفتر ڈرتے ڈرتے فون کیا، لیکن وہ بھی پانچ منٹ پہلے ایئرپورٹ روانہ ہو چکے تھے۔ اب میرے لیے مشکلات دو چند تھیں۔ "ایک اجنبیت، دوسرے بے سروسامانی"۔ سارے شہر میں ہُو کا عالم! سب ایئرپورٹ جا چکے تھے، جو کہ شہر سے کم و بیش چھ میل دُور ہے۔ مفتی صاحب کی میّت پہنچنے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس موقع پر میرا پہنچنا بھی لازم تھا۔ مَیں نے دوبارہ ڈی سی آفس فون کیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے میری پریشانی دیکھ کر شافِ کار مہیا کر دی۔ اگلے ہی لمحے مَیں ایئرپورٹ پر تھا۔

مفتی صاحب تشریف لا چکے تھے، مگر آج وہ ماتمیوں کے جلو میں آئے تھے، اور آخری بار آئے تھے، جبھی تو مُلک بھر سے کارواں در کارواں ان کی آمد پر "حاضر بہ جان" تھے — ہوائی مستقر پر سب سے پہلے گورنر سرحد لیفٹیننٹ جنرل فضلِ حق نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ آئی جی پولیس دل جان خان، کمشنر ڈیرہ، جہاں زیب خان، ہوم سیکرٹری صوبہ سرحد خان آفریدی اور دیگر اعلیٰ سول و فوجی حکام، مرحوم کی میّت پر عقیدت کے پھُول نچھاور کر رہے تھے..... صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق، اسلام آباد سے مفتی صاحب کے "استقبال" کے لیے آنے والے تھے، مگر تاخیر کے سبب ابھی تک نہیں پہنچے تھے.... غیر سرکاری استقبالیوں میں مرحوم کے دوست ارباب سکندر خان خلیل سب سے نمایاں تھے۔ ارباب صاحب، مفتی صاحب کی وزارت

www.tezpakistan.com

اعلیٰ کے دوران ۱۰ اماہ تک سرحد کی گورنری کا بوجھ اپنی ناتوانی کے لیے آزمائش بنائے رہے۔ آج وہ اپنے دوست کے بچھڑ جانے پر از حد ملول اور مغموم تھے .... ہزاروں ماتم گسار اور دیوان گانِ شوق ان غیر معمولی شخصیات کے علاوہ تھے جو ملک کے کونے کونے سے اپنے محبوب کے سفرِ آخرت کی دید کے لیے چلی آئیں تھیں۔

اس غیر معمولی شخصیت کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پابندِ رسوم تھا۔ جونہی یہ رسومات اپنے انجام کو پہنچیں ایک ٹرک آگے بڑھا۔ مرحوم کی میت اس میں رکھی گئی اور پھر ایک عاشقِ قوم کا جنازہ، قافلۂ شوق کے دوش پر بڑھتا ہی گیا۔ سخت دھوپ میں بے شمار لوگ ایئرپورٹ سے شہر تک چھ میل سڑک کے دورویہ بُت بنے کھڑے تھے۔ موٹروں، بسوں، رکشاؤں، موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں کا میل بھر لمبا جلوس ہو گا۔ بالآخر جنازہ ڈیرہ کی سب سے کشادہ اجتماع گاہ میں پہنچا جسے مقامی انتظامیہ نے ایک دن پہلے صاف کرایا، ہموار کیا اور چھڑکاؤ سے اس کے خدوخال سنوارے۔ اس اجتماع گاہ میں کوئی ایک لاکھ افراد کی گنجائش ہے۔ ہر طرف سر ہی سر تھے۔ "ڈیرہ وال" کہتے تھے۔ اس شہر میں ایسا بڑا جنازہ شاید پہلی اور آخری بار اُٹھا ہے۔ نمازِ جنازہ میں گورنر سرحد کے علاوہ سیاسی شخصیات اور اعلیٰ رسول و فوجی حکام بھی شامل ہوئے۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے جو ملتان سے مرحوم کی میت کے ہمراہ آئے تھے، انہوں نے نمازِ جنازہ کے بعد مرحوم کی زندگی کے بارے میں ایک جامع تقریر کی۔ ازاں بعد جنازہ مرحوم کے آبائی گاؤں عبدالخیل لے جایا گیا۔

عبدالخیل ڈیرہ سے کوئی ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے .... میں جنازہ کی روانگی کے بعد ڈیرہ ہی میں رہ گیا کہ ابھی صدرِ مملکت اسلام آباد سے پہنچنے والے تھے۔ نئی اطلاع کے مطابق انہوں نے عبدالخیل میں مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرنا تھی؛ چنانچہ سیدھا ایئرپورٹ پہنچا .... تھوڑی دیر میں صدرِ مملکت ایک فوجی طیارے میں پہنچ گئے۔ ان کے ہمراہ وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل سوار خان اور جنرل کے۔ ایم۔ عارف بھی تھے۔ دونوں حضرات نے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ چودھری ظہور الٰہی اور خواجہ صفدر بھی صدرِ مملکت کے ہمسفر تھے۔ صدرِ مملکت تھوڑی دیر ایئرپورٹ پر رُکے اور پھر ایک ہیلی کاپٹر میں عبدالخیل روانہ ہو گئے۔ ہمیں ایک دوسرے ہیلی کاپٹر میں جگہ ملی جس میں صوبے کے اعلیٰ رسول اور فوجی حکام سفر کر رہے تھے۔ صدرِ مملکت کا طیارہ پرواز کر چکا تو ہماری باری آئی۔ جب ہم ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھ رہے تھے، کرنل سالک (صدرِ مملکت کے افسر تعلقات عامہ) نے دل جان خان (آئی جی پولیس سرحد) کی کمر میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا: "آخر مفتی صاحب بھی چل بسے۔" دل جان خان نے پُرسا پا کر جواب دیا: "جی ہاں! کرنل صاحب! یہ راہ تو ہر ایک نے دیکھنی ہے ....." اور اسی ماتمی فضا میں ہم پیالہ اُترے۔

پیالہ سے آگے موٹر کا سفر تھا، یہاں سے موٹر میں بیٹھ کر عبدالخیل پہنچے۔ جنازہ پہنچ چکا تھا۔ نماز کے لیے صف بندی بھی ہو گئی تھی۔ ابھی تک صدرِ مملکت کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر میں فضا میں ایک سفید سا متحرک نشان آیا اور پھر سینکڑوں لوگ اس کی طرف لپک پڑے۔ صدرِ مملکت کا طیارہ۔ ایک کھلیان (جسے عارضی ہیلی پیڈ میں بدل دیا گیا تھا) پر اُتر چکا تھا۔ استقبال کرنے والوں میں مفتی صاحب مرحوم کے لواحقین اور سرکاری حکام شامل تھے۔ عوام نے دیکھتے ہی "مردِ مومن مردِ حق، ضیاء الحق" کے نعروں سے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ صدرِ مملکت سیدھے جنازہ گاہ تشریف لے گئے۔ حاضرین کی انہیں دیکھتے ہی ہچکیاں بندھ گئیں جیسے ایک عزیز کے آنے سے غم کی شدت اتھاہ ہو گئی ہو۔ صدر نے جنازہ گاہ پہنچ کر تمام حفاظتی انتظامات بالائے طاق رکھ دیے۔ قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے افراد سے ملے۔ اظہارِ تعزیت کیا۔ ایک عمر رسیدہ بزرگ صدر کے قریب جا کر ان سے ملے اور پشتو میں پُوچھا: پختو پوٹی (صدر نے پشتو میں جواب دیا: لگ لگ پوئم" اور جنرل فضل حق کی طرف دیکھنے لگے جیسے غلطی کی اصلاح طلب کر رہے ہوں، مگر فضل حق صاحب کے ایک ہلکے سے تبسم نے صدر صاحب کی زبان کی صحت کی تصدیق کر دی۔ بزرگ خوش ہو کر کونے میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر میں مفتی صاحب کے چاروں صاحبزادگان قریب کے کچے مکان سے نکل کر صدر سے ملنے آئے ... صدر صاحب نے مرحوم کے بڑے صاحبزادے سے گلے مل کر اظہارِ تعزیت کیا اور کہا: "آپ کے والدِ عظیم انسان تھے، ان کی وفات کا مجھے دلی صدمہ ہے۔" مولانا فضل الرحمٰن (مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے) نے صدر کا شکریہ ادا کیا کہ وہ زحمت اُٹھا کر جنازے میں شریک ہوئے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن کے علاوہ صدر صاحب، مفتی صاحب کے دیگر تین صاحبزادوں سے بھی گلے ملے۔ ایک، صدر صاحب سے مل کر پیچھے ہٹنے لگے تو ایک "پاسبان" کی "شک" سے ٹکرا گئے۔ اس نوجوان کو "شک بردار" کی بے احتیاطی ناگوار گزری .... میں نے دیکھا کہ ناگواری کا یہ تاثر اس کے جمیل چہرے کے "حسنِ معصوم" کو اور بھی نمایاں کر گیا۔ دوسری طرف

www.tezpakistan.com

"عصا بردار" وہاں سے ایسا کھسکا کہ پھر نظر نہ آیا.... نمازِ جنازہ سے پہلے مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن کی دستار بندی کی رسم ادا ہوئی۔ صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب نے جو علاقے کی معروف دینی شخصیت ہیں، یہ رسم ادا کی۔ ازاں بعد مولانا فضل الرحمٰن نے اپنے عظیم باپ کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ بلا مبالغہ یہاں بھی ہزاروں عقیدتمندوں کا اجتماع تھا جو دیدنی تھا۔ اس اجتماع میں ہر رنگ نمایاں تھا۔ اہم اور غیر اہم کی تمیز اُٹھ گئی تھی.... بس ہر ایک عظمتوں کے آخری سفر پر رنجیدہ و دل گرفتہ تھا۔

عبدالخیل۔ ایک انتہائی پسماندہ گاؤں ہے۔ اس کا کوئی رُخ اس حقیقت کا پتہ نہیں دیتا کہ یہ ملک کی معظم شخصیت کا مسکن ہے۔ سڑک کے بجائے کچے راستے۔ بجلی کی جگہ مٹی کا تیل ضرورتوں کا کفیل۔ عہدِ قدیم اور دورِ متمدن ابھی تک باہمد گر فاصلوں پر۔ اسی گاؤں کے ایک بزرگ نے کہا: "ہم نے اپنی زندگی میں یہاں کوئی موٹر گاڑی نہیں دیکھی تھی۔ جب کبھی مفتی صاحب گاؤں آتے گاڑیوں والے بھی اس گاؤں کا رُخ کرتے۔" اور آج تو کم و بیش ۲۵۰ گاڑیاں یوں قطار در قطار موجود تھیں گویا کسی میلے میں شرکت کے لیے آئی ہیں.... جب مفتی صاحب کا جنازہ ان کے گھر سے برآمد ہوا تو وہ ایک چارپائی پہ اُٹھایا گیا تھا۔ یہ "چارپائی" اپنی جگہ عزت و عسرت کی تصویر تھی۔ اس کے پائے استعمال میں رہ رہ کر اب سیاہ پڑ چکے تھے، مگر "اقلیم باطن کے شہنشاہ" نے ظاہر داری کی درستی کو ہمیشہ خلافِ شان سمجھا تھا۔

جنازہ، جنازہ گاہ میں رکھا جا چکا تو پورا ماحول ماتمی سکوت میں ڈوب گیا.... کہیں کہیں ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے تو آہوں اور سسکیوں کا غبار دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیتا۔ نماز اور دعائے مغفرت کے بعد جنازہ۔ آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا جانے لگا.... ہزاروں کا ہجوم "لا الٰہ" کا ورد کرتا شہرِ خموشاں جا رہا تھا۔ صدرِ مملکت پہلی صف سے اُٹھے اور جنازہ کو کندھا دیا۔ وہ دُور تک اسی حالت میں چلتے رہے۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی سینکڑوں نوجوان دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ شاید ایک "مردِ فقیر" کے حضور "شہریار کا یہ نیاز" ان کے دلوں کو گرما گیا تھا، جو ان کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پٹھانی اُردو میں ہر طرف نعرے بلند ہوتے "مردِ مومن، مردِ حق، ضیاء الحق"۔ یہ منظر، یہ نظارہ ہر دیکھتی آنکھ کو جھیل بنا جاتا۔

مفتی صاحب مرحوم کو سپردِ خاک کیا جا رہا تھا، ہزاروں آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہر دل سے آہیں اُٹھتیں۔ کئی زبانیں اعلان کرتیں، اب کیا ہوگا۔ "بابا! آپ تو چلے گئے، تیرے بیٹوں کا کیا حال ہوگا....!" اسی اثناء میں جمعیت اسلامی افغانستان کے امیر پروفیسر برہان الدین ربانی تشریف لائے۔ ان سے پہلے تجہیز و تکفین کا کام انجام پا چکا تھا..... یہ محرومی ان کے دل کو اور بھی مجروح کر گئی۔ وہ سیدھا اس تربت پر پہنچے جہاں ان کی عقیدت آسودۂ خاک تھی۔

عبدالخیل میں نمازِ جنازہ

www.tezpakistan.com

رات بھر قرآن کی تلاوت کرتے رہے، ان کے آنسوؤں سے قبر کی تازہ مٹی بھی نم آلود ہوگئی ..... اگلی صبح کا ستارہ طلوع ہُوا تو کسی نامہربان نے آکر انہیں "مرقدِ یار" سے الگ کر لیا .... وہ انہیں مرحوم کے گھر لے جانے لگے تو پروفیسر ربّانی نے کہا: "اب میرا اس گھر میں رہا ہی کیا ہے۔ میں تو پہلے ہی غریب الوطن تھا، اس انسان کے اُٹھ جانے سے میری "غریب الوطنی" بے اماں ہوگئی ہے"۔ یہ کہہ کر سیدھا پشاور سدھار گئے .... ان کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ کا ایک کارواں، قائدِ اعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے اظہارِ تعزیت کرنے عبدالخیل پہنچا .... یہ جواں سپاہ، سیدھی مفتی صاحب کے مزار پر پہنچی۔ نوجوان گھنٹوں بیٹھے۔ "جانے والے" کے حضور آہوں اور اشکوں کا خراج پیش کرتے رہے ..... اس قسم کے کارواں، سندھ، سرحد، بلوچستان، ہر دُور دراز علاقے سے پہنچ رہے تھے۔ صدرِ مملکت واپس اسلام آباد جا چکے تھے۔ دوسرے دن ملک قاسم پہنچے۔ وہ ایک دن رہ کر واپس پنڈی جا رہے تھے۔ ڈی۔ آئی۔ خان کے ایئرپورٹ پر مجھ سے ملے تو پریشان تھے۔ میں نے پوچھ لیا، "ملک صاحب! خیریت تو ہے"۔ کہنے لگے: "آج میں میرے ماموں کا انتقال ہوگیا ہے، میں ان کے جنازے میں شریک ہونا چاہتا ہوں، لیکن کوئی نشست نہیں مل رہی ....." میں نے اپنی نشست کی پیش کش کی تو وہ فوراً تیار ہوگئے۔ اگرچہ مجھے بھی اسی پرواز سے واپس اسلام آباد جانا تھا ورنہ مجھے تین دن تک اگلی پرواز کا انتظار کرنا پڑتا، چونکہ میں اب پیش کش کر چکا تھا، میں نے سیکورٹی انچارج سے بات کی۔ موصوف، پشاور کے "روایت پرور" پٹھان تھے۔ میں نے کہا: "پنجاب کے ایک رہنما پریشان ہیں اگر آپ ان کی مدد کر سکیں تو شاید بڑا بھائی ....." وہ ہنس پڑا۔ انہوں نے جواب دیا: "جہاز روانہ ہونے والا ہے، آپ جا کر بیٹھ جائیں، میں ملک صاحب کو بٹھانے کا اہتمام کرتا ہوں ....." تھوڑی دیر میں ان کی اور جہاز کے کپتان کی بات مکمل ہو چکی تھی۔ میرے پہنچتے ہی ملک صاحب بھی جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔ سیکورٹی انچارج "کاک پٹ" میں کھڑا تھا، مگر اس کا دل مطمئن تھا کہ وہ بڑے بھائی کے کام آیا تھا ..... ملک صاحب سیدھے میرے پاس آئے۔ بہت شکر گزار تھے ... میں نے کہا یہ کرم فرمائی تو ان کی ہے جو "کاک پٹ" میں پشت بہ دیوار ہیں ــــ میں پشاور اُترا تو ملک صاحب نے ایک جملہ ادا کیا اور "ٹرانزٹ لاؤنج" میں چلے گئے ــ "مفتی صاحب، چودھویں صدی کا تتمہ" اور "پندرھویں صدی کی تمہید تھے"ــ اسی جملے کی گونج کے ساتھ ساتھ میں اگلے روز زیست کی محرومیاں سمیٹے، اپنی منزل کو رواں تھا۔

مولانا مفتی محمود کچھ عرصہ پہلے کراچی میں بیمار ہوئے تھے اور ایک مقامی ہسپتال میں زیرِ علاج رہے تھے ــــ ملک محمد قاسم، گوہر ایوب اور عابد زبیری ان کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے۔ عابد زبیری وہ شخص ہیں کہ انہیں مفتی صاحب سے آخری سیاسی ملاقات کا شرف بھی حاصل ہُوا۔ وہ خان عبدالولی خاں اور شیر باز مزاری کے ہمراہ تھے۔ وہ اس ملاقات کے حوالے سے بہت سی خبروں کے امین ہیں۔

www.tezpakistan.com

جنگل اُداس ہے

مولانا مفتی محمود بھی اپنے اللہ سے جا ملے، اور اس شان سے جا ملے کہ اللہ ہی کے گھر میں، اللہ ہی کے ذکر میں مشغول تھے کہ موت آئی کہ دوست کا پیغام آگیا ـــــ دل نے مزید دھڑکنے سے انکار کر دیا، آخری بار جو دھڑکا، تو اللہ ہی کے نام پر دھڑکا ـــــ اور سچ پُوچھیے تو اس دل کی آن بان ہی یہ رہی کہ عمر بھر اللہ ہی کے لیے دھڑکا کیا، اللہ ہی کے راستے پر چلنے کی تمنا میں جواں رہا۔ اس دنیا کی کسی شے میں خود کو نہ اٹکایا، خود کو نہ لگایا، یہ دل عجب دھج سے زندہ رہا، اور اب جب یہ خاموش ہُوا ہے تو اس کی گونج ایک دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دُنیا میں سُنی جا سکتی ہے ـــــ اس کے چرچے ایک دُنیا کی زبان پر ہیں، اس کی یادیں ایک دنیا کے سینوں میں ہیں ـــــ اس کے لیے ایک دُنیا تڑپ رہی ہے، ایک دُنیا رو رہی ہے، ایک دُنیا غم زدہ ہے، ایک دُنیا کی دُنیا لُٹ گئی ہے ـــــ اور ایک دنیا کے ہونٹوں پر دعائیں ہیں، ہاتھ مغفرت کے لیے اُٹھ گئے ہیں۔

مولانا مفتی محمود خالص "مولوی" تھے، دینی درس گاہوں میں پڑھے، بڑھے اور جوان ہوئے۔ چالیس سال پہلے سیاست کی وادی میں قدم رکھا اور برِصغیر کو آزاد کرانے کے لیے جدّوجہد شروع کر دی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جمعیۃ العلمائے اسلام سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ بالآخر نظامتِ اعلیٰ نے ان کے قدم چُومے۔ ایّوب خاں مرحوم کے زمانے میں انہوں نے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا، اور ۶۲ء میں قومی سطح پر نمایاں ہوئے ـــــ پھر یہ ہُوا کہ آہستہ آہستہ یہ مولوی، مسجدوں پر چھاتا، اور اپنا آپ منواتا چلا گیا ـــــ معاملہ سازی اور سیاسی اقدامات کی دھاک بیٹھتی چلی گئی، تا آنکہ ۷۰ء کے انتخابات میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے ہرا دیا ـــــ اس کے بعد تو مسٹر بھٹو کی سیاست سے ان کا بار بار پالا پڑا اور بار بار وہ اُسے شکست دیتے رہے۔

www.tezpakistan.com

مولانا مفتی محمود کی اپنی اور ان کی جماعت کی حیثیت اس قدر مستحکم اور اس قدر فیصلہ کُن تھی کہ ۷۰ء کے انتخابات کے دوران تشکیل پانے والی سرحد اسمبلی میں کالعدم نیپ اور کالعدم قیوم لیگ میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہ رہا کہ مفتی صاحب کی حمایت اور تعاون کے بغیر وزارت سازی کا خواب بھی دیکھ سکے۔ مفتی صاحب نے اپنی شرائط دونوں گروہوں کے سامنے رکھ دیں۔ مسٹر عبدالولی خاں اور ان کی جماعت نے انہیں قبول کر لیا، اور مفتی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے انہیں مخلوط پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا ——— سیکولر نیپ نے اسلامی نظام نافذ کرنے کا عہد کیا، اور مفتی صاحب کی وزارت کا دَور شروع ہو گیا۔

وزارت کے دوران مفتی صاحب تھے اور سادگی تھی، استغنا تھا، فقر تھا، درویشی تھی ——— امیری میں فقیری اور فقیری میں امیری کی یہ تصویر تاریخ کے صفحات پر نقش ہو چکی، اسے کوئی نہ تو مٹائے مٹا سکتا ہے نہ چھپائے چھپا سکتا ہے۔ مفتی صاحب نے سرحد میں شراب بند کی، اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کیا، اور اَن گنت ایسے اقدامات کیے کہ جن سے پاکستان کے مقاصد کی تکمیل کے راستے کھُلتے تھے۔

مسٹر بھٹو نے بلوچستان میں نیپ اور جمعیت کی حکومت کو غیر آئینی طور پر برطرف کر ڈالا، تو مفتی صاحب نے احتجاج کرتے ہوئے اپنی وزارت کا استعفٰی بھی پیش کر دیا ——— اور لوگوں نے دیکھا کہ جب بڑے بڑے دانشمند اور بڑی بڑی غیر ملکی جامعات کے پروردہ شدہ، اقتدار کے دروازوں پر کھڑے ہو کر دُم ہلانے ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے، مدرسے کے پڑھے ہوئے ایک "مولوی" نے اقتدار کو اس طرح دُھتکار دیا، جیسے لوگ کوئی پلید جانور اپنے دروازوں سے دُور بھگا دیتے ہیں ——— مفتی صاحب ایک عرصے سے ذیابیطس کے مُوذی مرض میں مبتلا تھے، لیکن وہ مرض کے سامنے کبھی جُھک کر نہ رہے۔ سارے طبّی مشوروں اور ساری احتیاطوں کو ایک طرف رکھ کر صرف اور صرف اپنے مقاصد، اور اپنے آدرش کی آواز سُنی، اور اس کے لیے دیوانہ وار جدّوجہد کرتے رہے ———

مفتی صاحب مُلکی سطح پر آگے بڑھتے رہے اور لوگوں کے دلوں کو مسخّر کرتے رہے، حتّٰی کہ جب مسٹر بھٹو کے خلاف نو جماعتوں کے محاذ، پاکستان قومی اتحاد کی تشکیل ہُوئی، تو قیادت کا تاج رکھنے کے لیے ان سے بہتر کوئی سر نہ مل سکا۔

مفتی صاحب اپنی استقامت کے حوالے سے اس طرح سربلند ہوئے کہ ان کے آبائی صوبے سرحد میں انہیں "نرُملا" کہہ کر ان کے لیے زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ——— وہ تھے بھی "نرُملا" ہی۔ انہوں نے آزادی، جمہوریت، اور اسلامی اقدار کے ساتھ برسوں پہلے جو ناطہ جوڑا تھا، آخر دَم تک اس کے لیے زندہ رہے ——— وہ آزادی کے مجاہد تھے، آزادی کے لیے زندہ رہے، آزادی کے لیے لڑتے رہے ——— اس مردِ آزاد کی وفات پر آج ہم اپنے آپ سے تعزیت کرتے ہیں، ان کے اہلِ خانہ سے تعزیت کرتے ہیں، اہلِ پاکستان سے تعزیت کرتے ہیں اور جذبۂ آزادی سے تعزیت کرتے ہیں کہ ——— مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے !!!

15 اکتوبر 1980ء